داستانِ جذب وشوق

رُودادِ سفرِ حجاز

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

ایم۔ اے۔ ڈی، لٹ

سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

داستانِ جذب و شوق

رُودادِ سفرِ حجاز

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

ایم۔ اے، ڈی لٹ

سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پُور

Ferozsons Limited

فیروز سنز لمیٹڈ

قائم شدہ ۱۸۹۴ء

لاہور پاکستان

ماں کے نام

جس کے والہانہ شوقِ عبادت، تعلیم و تعلّمِ قرآن، حُسنِ اخلاق
اور جذبۂ محبّتِ انسانی نے مجھے بھی لذّتِ جذب و شوق اور ذوقِ قرآنِ
مجید سے آشنا کیا اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سیرت نگار بنایا۔

سلسلۂ داستان کی کڑیاں

کڑی : ۲ ـــــ سوئے حرم شریف

کڑی : ۳ ـــــ مکّہ مکرّمہ یا دیارِ "دوست"

کڑی : ۴ ـــــ حرم شریف یا جلوہ گاہِ "دوست"

کڑی: ۵ سعی: اِمتحانِ فرض و محبّت کی یادگار

کڑی: ۶ — وارفتگیِ شوق کا ایک عجیب و غریب تجربہ

کڑی: ۷ — حریمِ "دوست" میں دو یادگار نمازیں

کڑی: ۸ — حریمِ "دوست" عالمِ جذب و شوق میں

کڑی: ۹ — سیرۃ النبیؐ کی تقریبِ تقسیمِ انعامات

کڑی: ۱۰ — نقوشِ حُسن و عشق کی تلاش میں

کڑی : ۱۱ —— حج اور اُس کے مقامات

کڑی : ١٢ ــــ مقاماتِ حج کی زیارت کے تاثرات

کڑی : ١٣ ــــ حرم شریف اور شیاطین

کڑی : ١٤ ــــ آخری دِن

کڑی: ۱۵ ——— مدینۂ منوّرہ

دیارِ "دوست" سے دیارِ حبیبؐ کی طرف

کڑی: ۱۶ ——— مسجدِ نبویؐ میں

کڑی: ۱۷ ——— مدینۂ منوّرہ کے تاریخی و مقدّس مقامات

کڑی : ۱۸ —— مکاشفات و مشاہدات کا جہانِ مقدس

کڑی : ۱۹ —— آخری دن کی داستان

کڑی : ۲۰ —— دیارِ حبیبؐ سے دیارِ غیر کی جانب

کڑی : ۲۱ ـــــ جدّہ، طوافِ وداع اور مراجعتِ وطن

بسم اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

اپنے اِلٰہ و ربّ کے حُضُور

اے اللہ تعالیٰ! تو سب کا اِلٰہ (معبُود و محبُوب اور مطلُوب و مقصُود) اور ربّ (نشو و نُما کرنے رزق دینے والا آقا و مالک) ہے۔ سب بنی نوعِ اِنسان تیرے بندے ہیں، اور مقامِ عبدیّت معراجِ انسانیت ہے۔ یہ تیرا کرم ہے کہ عبدیّت کو عبودیت مستلزم ہے۔ عبودیت کا ایک ازبس رُوح پرور و دلگداز منظر تیرے گھر کا طوافِ جذب و شوق ہے۔ عبدیّت کا جذب و مستی اور ذوق و شوق جب تیرے مقدّس گھر کا طواف کرتا ہے تو روح محسُوس کرتی ہے کہ وہ تجھے دیکھ رہی ہے تو اس کے رقصِ والہانہ کا تماشا کر رہا ہے۔ تُو نظروں سے اوجھل رہ کر چشمِ قلب پر آشکارا ہوتا ہے۔ تیرا جمال و جلال ہویدا و آشکارا ہوتا ہے، لیکن اسے اہلِ نظر ہی دیکھتے اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ تیرا حُسن ان کے ذوقِ نظر کی تسکین کرتا اور دِل میں سوز و گداز پیدا کرتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ تُو ہر دِل میں رہتا ہے، ان لوگوں کے دِلوں میں بھی جو تیرے مُنکر ہیں۔ تیرا مسکن ان دِلوں میں ہے جو تیرے پرستار ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مُنکروں کے دلوں میں تُو خار بن کر رہتا ہے۔ وہ تیرے وجود کی خلش محسوس کرتے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں پر مانتے نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ سچّے نہیں۔ ان کی زندگی سچ سے معرّا ہے۔ سچ ہی سچ کو دیکھتا ہے۔ حُسن و سرُور اور سچ ایک ہی حقیقت کے تین مظاہر ہیں، اور یہ حقیقت اہلِ حُسن و سرُور ہی جانتے ہیں، جو تیرے خاص بندے اور دوست ہیں۔

وہ جو یہ کہتے ہیں کہ تُو نہیں ہے، یا تیری ہستی میں شک کرتے ہیں، وہ جھوٹے اور حُسن کور ہیں۔ وہ ظالم و جاہل ہیں۔ وہ اپنی رُوح پر ظُلم کرتے ہیں، لیکن اس بات کا شعور نہیں رکھتے۔ وہ تیری خلش محسوس کرتے ہیں اور ان کی روحوں کو تیری ہستی کا اِذعان و عرفان بھی ہے۔ وہ یہ جانتے بھی ہیں پر مانتے نہیں، اسی لیے تُو نے اِنسان کو ظالم و جاہل کہا ہے۔ آنکھ تیرے جلوؤں کو دیکھتی، کان تیری آواز کو سُنتے اور قلب تیری موجودگی کو محسُوس کرتا ہے۔ ان حقائق کے باوجود تیرا انکار کرنے والا خود اپنی ذات کا انکار کرتا ہے لیکن نہیں جانتا۔ عقلِ سلیم کہتی ہے تو خالق و ربّ ہے، دِل مانتا ہے کہ تُو اس میں رہتا ہے، اور روح سمجھتی ہے کہ تُو ہی اس کا اِلٰہ ہے۔ یہ راز تُو ہی جانتا ہے کہ پھر لوگ کیوں تیرا انکار کرتے ہیں۔ اس پر بھی تُو ان کی ربوبیّت کرتا اور انھیں اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ تُو ان کو مال و دولت، قوّت، دسطوت، اور عِلم و حکمت عطا کرتا ہے۔ اس کی وجۂ حقیقی یہ ہے کہ تُو ربِّ رحیم و کریم ہے، تیری رحمت کُل کائنات کو محیط ہے، اور تُو اپنی کُل مخلوقات کا اِلٰہ ہے۔

یہ تیرا فیضان و کرم ہے کہ تُو نے مجُھے اپنے مبارک و مقدّس گھر اور اپنے حبیب صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے روضۂ اطہر کی زیارت کرائی۔ نیز اسرارِ الُوہیّت و نبوّت، اور رموزِ محبّت و عبودیّت سے آگاہ کیا۔ یہ بھی تیرا لُطف و کرم ہے کہ تُو نے مجھے ذوق و شوق اور جذب و مستی کی لذّت سے آشنا کیا۔ طوافِ کعبہ کیا ہے؟ رُوح کے ذوق و شوق کا اظہار، جذب و مستی کا عالم حال و قال، اور اس کا رقصِ والہانہ ہی تو ہے۔ میں ان مناظر کے تاثّرات و احساسات بیان کرنا چاہتا ہوں، خاص کر ان کے لیے جو ابھی طواف کی لذّت و سعادت سے مستفیض و آشنا نہیں ہوئے ہیں۔ میں تیرا فقیر ہوں۔ جس طرح تُو نے اپنی رحمتِ بے پایاں سے مجُھے اس طوافِ شوق و مستی کے اسرار سے آشنا کیا ہے، انھیں بیان کرنے کی توفیق بھی عطا کر۔ میرے قلم کو بیان کی قوت اور بیان کو اثر اور کتاب کو قبولیّتِ عام اور مقبولیتِ عوام کی سعادت بھی عطا کر کہ جود و کرم اور احسان و عطا تیرا شیوۂ ربوبیّت ہے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے حضور

آپؐ سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی ہیں، اس لیے آپؐ ہر زمان و مکان اور کُل بنی نوعِ انسان کے لیے رحمتِ ہمہ گیر ہیں۔ آپؐ کی زندگی حسین، مطہر، سچی اور مثالی ہے۔ تاریخ اور قرآنِ حکیم، جو زندہ خدائے علیم و حکیم کی آخری زندہ کتاب ہے، دونوں شاہد ہیں کہ آپؐ نے جرم و گناہ، کفر و شرک اور ظلم و استحصال کی دُنیا میں ایک ایسے جہانِ نو کی تعمیر کی جو جنتِ ارضی تھا۔ اس میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی تھی اور آئین و شریعت بھی اسی کے تھے۔ وہی اور صرف وہی لوگوں کا الٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ تھا۔ ایک غیر مہذب اور امن ناآشنا ملک میں آپؐ نے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جو ایمان و توحید، حُسنِ عمل، مکارمِ اخلاق، عدل و احسان، اخوت و محبت، حریت و مساوات، دیانت و امانت اور علم و حکمت اور قوت و صولت میں آپ اپنی مثال بن گیا۔ یہ دیکھ کر زمانے نے اقوامِ عالم کی امامت آپؐ کے پیروکاروں کو تفویض کر دی۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ ہی وہ کسوٹی ہے جس کے ذریعے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ سچی، حسین، صالح اور کامیاب زندگی کون سی ہے، اور ہم کس طرح اپنی زندگی ایسی بنا سکتے ہیں۔

قرآنِ کریم اور تاریخ دونوں شاہد ہیں کہ آپؐ کا الٰہ اور ربّ تنہا اللہ تعالیٰ تھا، اور یہی آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کا اصل الاصول ہے۔ آپؐ کو نہ صرف اپنے الٰہ سے بلکہ اُس کی کُل مخلوقات خصوصاً افرادِ نسلِ انسانی سے والہانہ محبت تھی۔ یہ محبت رنگِ ایثار و قربانی سے مزین تھی، اس لیے آپؐ تمام جہانوں کے لیے رحمت تھے اور ہیں۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین ایسے بے مثال

لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ آپؐ نے عالمِ کفر و شرک میں ایمان و توحید کی شمع روشن کی، جو آپؐ کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے۔ آپؐ نے لوگوں کو علم و حکمت سکھائی، اس لیے آپؐ معلّمِ انسانیت ہیں۔ آپؐ نے بنی نوعِ انسان کا تزکیۂ نفس کیا، ان کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کی، انھیں آدابِ زندگی سے آگاہ کیا اور انھیں حسین اور سچی زندگی گزارنے کا گُر سکھایا۔ علاوہ بریں، اُن کے رشد و ہدایت کے لیے ایک مثالی نمونہ قائم کر دیا، اس لحاظ سے آپؐ محسنِ انسانیت، رحمۃ للعالمین اور کُل بنی نوعِ انسان کے نبی، ہادیِ برحق اور رہبرِ اعظم ہیں۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں، حقیقت ہے کہ آپؐ کا پیغام اور اُسوۂ حسنہ زندہ و لازوال ہیں اور قیامت تک نوعِ انسانی کے لیے فردوسِ گوش اور جنتِ نگاہ بنے رہیں گے۔ ان سے بہرے سُننے اور اندھے دیکھنے لگیں گے، نیز ان کے دل اپنے الٰہ و ربّ کی محبت سے منوّر ہوتے رہیں گے، اور ان کے دِلوں میں اپنے الٰہ کے قُرب و حضوری اور وصال و دید کی آرزو زندہ و بیدار ہوتی رہے گی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آپؐ ہی نے انسان پر حیات، و ممات اور جنت و دوزخ کے اسرار منکشف کیے۔ اُسے رموزِ ایمان و محبت سے آگاہ اور اسرارِ توحید سے آشنا کیا۔ خیر و شر، عدل و ظُلم اور حُسن و قُبح میں امتیاز کرنا بھی آپؐ ہی نے سکھایا۔ پاکیزگی اور سچائی کے مفہوم و اہمیت سے آپؐ ہی نے آگاہی بخشی۔ آپؐ ہی نے یہ راز آشکارا کیا کہ مقامِ عبدیت ہی انسان کا بلند ترین اور حقیقی مقام ہے اور اسے حاصل کرنا ہی مقصدِ زندگی، آرزوئے الٰہ، طلب و جستجوئے روحِ انسانی اور اس کی عظیم ترین کامیابی ہے۔

ان حقائق سے پردہ بھی آپؐ ہی اُٹھایا ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور سب سے بھائیوں جیسا حُسنِ سلوک کرنا چاہیے۔ اکتناز و احتکار اور سُود خوری و بُخل کبیرہ گناہ ہیں۔ بنی نوعِ انسان کی خوش حالی کا راز یہ ہے کہ دولت گردش میں رہے اور اس کی تقسیم عدل و احسان کے اصُولوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ زکوٰۃ و صدقہ سے تزکیہ ہوتا ہے، اور تزکیہ سے قلب بینا ہوتا ہے۔ نماز آنکھوں کی ٹھنڈک، اور روزہ رُوح کی غذا ہے۔ یادِ الٰہی سے طمانیت حاصل ہوتی ہے اور

قرآنِ حکیم پر غور و فکر کرنے سے قاری کا دل حُسن و نور اور علم و حکمت سے منور ہو جاتا ہے اور اس کی عقل سلیم بن جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس کا رشتہ اپنے اللہ سے قائم ہو جاتا ہے اور وہ دیدارِ الٰہ اور اس کے قرب و حضور کی سعادت سے بہرہ مند ہونے لگتا ہے۔

اپنے اللہ سے محبت کرنا روحِ انسانی کا فطری خاصہ ہے، اور اس کے گھر کا طواف اس محبت کا عملی مظاہرہ ہے۔ طوافِ کعبہ سنتِ ابراہیمیؑ ہے، جس کا احیا آپ ﷺ نے کیا اور اس طرح کیا کہ لاکھوں انسان حج کے موقع پر اور سینکڑوں نہیں، ہزاروں اہلِ محبت روزانہ اور ہر وقت اپنے اللہ و رب کے مقدس و قدیم گھر کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ طوافِ کعبہ فرض بھی ہے اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ بھی۔ طواف روح کا عجز و نیاز بھی ہے اور اس کی محبت کا سوز و گداز بھی۔ یہ اس کی تڑپ بھی ہے اور رقصِ محبت بھی۔ طواف جذب و مستی، ذوق و شوق اور جنون و شیفتگی کا مظہر ہے۔

میرے آقا! بتا دیجیے کہ طواف کا سر الاسرار کیا ہے؟ حرمِ پاک میں داخل ہوتے ہی روح کیوں تڑپنے لگتی اور آنکھیں کیوں اشکبار ہو جاتی ہیں؟ دل کیوں جلالِ الٰہی کا متحمل نہیں ہوتا اور جسم پر کیوں لرزہ طاری ہو جاتا ہے؟ روح کیوں اپنے اللہ کے سوا سب کچھ بھول جاتی ہے؟ وہاں جاتے ہی اللہ تعالیٰ کی ہستی و موجودگی کا کیوں احساس ہونے لگتا ہے؟ طواف کرتے وقت اہلِ محبت پر کیوں جذب و مستی اور کیفیت و جنون کی حالت طاری ہو جاتی ہے؟ اسی لیے نا کہ وہ خدا کا گھر ہے اور گھر میں موجود ہوتا ہے، اور اس کے جمال و جلال سے تمام حرم شریف منور ہوتا ہے۔ میرے آقا ﷺ! میں یہ روح پرور منظر پھر دیکھنا چاہتا ہوں اور اپنے دل و نگاہ کو حُسن و نور سے پھر منور کرنا چاہتا ہوں۔ ساتھ ہی میں آپ ﷺ کے روضۂ اطہر میں بھی حاضر ہونا چاہتا ہوں، اپنی روح کو زندہ و بیدار کرنے اور دل کو سوز و گداز اور عشق و سرور سے معمور کرنے کے لیے۔ یہ فیض و کرم ایک بار اور ہو جائے کہ میں اس کا منتظر و امیدوار ہوں۔

راز کی بات

دین حُسن و محبّت کی اور زندگی امتحانِ وفا کی بات ہے۔ بات بڑی ہی مختصر ہے۔ اللہ تعالیٰ جو محض حُسن ہے، انسان کا اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) ہے، اور اپنے اِلٰہ کو حاصل کرنا، دین کا تقاضا، زندگی کا مقصود اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے۔ چنانچہ اس نے انسان کے لیے دُنیا بنائی، اسے حسین و نظر افروز بنایا اور اسے طرح طرح کی نعمتوں سے معمور کر دیا۔ انسان کو اپنے اِلٰہ تک رسائی پانے کے لیے حسّی و عقلی قوتیں ودیعت کیں اور پھر اسے اِرادہ و اِختیار کی آزادی امانت کے طور پر تفویض کی، اور اس کے ساتھ ہی اسے رہینِ امتحان کر دیا۔ اب انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حقیقی اِلٰہ کو اپنا اِلٰہ بنائے یا کسی اور کو اپنا اِلٰہ سمجھے اور بنائے۔ یہ آزادی دینے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو، جو روزِ ازل سے اس کا دشمن بن چکا تھا، اس کی درخواست پر دُنیا میں بھیج دیا، اور اسے انسان کو اپنے جمالیاتی فریب سے ورغلانے اور گمراہ کرنے کی آزادی بھی دے دی۔ اس طرح دُنیا کو اولادِ آدم کے لیے دارالامتحان بنا دیا۔ انسان کو اس دنیا میں دو کام کرنا ہوتے ہیں: ایک اپنے اِلٰہ کو حاصل کرنا، اور دوسرے اس دنیا کو اپنے حُسنِ قول و عمل سے امن و سلامتی کی جنّت بنانا۔

انسان فطرۃً عبد یا بندہ ہے اور اپنے اِلٰہ کی عبودیت یا بندگی کرنا اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ یہ عبودیت کیا ہے؟ اپنے اِلٰہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے اس کی پرستش و طاعت اور حمد و ثنا کرنا، نیز اس کی مخلوقات سے محبت کرنا۔ عبدیت کا خاصہ محبّت ہے، لہٰذا انسان محبت کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ شیطان کے جمالیاتی فریب میں آ کر اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے اور اِلٰہ بنا لیتا ہے۔ انسان کے ان گنت اِلٰہ ہیں، جن سے وہ محبّت کرتا ہے، اور ناکام و نامراد رہتا

ہے۔ اگرچہ وہ نہیں سمجھتا کہ کامیابی و ناکامی کی حقیقت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ بنانا اور اس سے والہانہ محبّت کرنا، انسان کو اہلِ نظر، دانائے راز اور صاحبِ حُسن و سُرور بناتا ہے، اور یہی انسان کی کامیابی بلکہ عظیم ترین کامیابی ہے۔ اپنے اِلٰہ کے حصول میں ناکامی دراصل سب سے بڑی ناکامی ہے۔ یہ حقیقت دانائے راز ہی سمجھتے ہیں۔

سِرّالاسرار یا رازوں کا راز یہ ہے کہ تُو حُسن بن جا تاکہ تُو حسنِ مطلق کو دیکھ سکے۔ اُس کی دید ہی اصلِ حیات و دین، یہی آرزوئے رُوح اور مشیّتِ ایزدی ہے۔ اسلام کیا ہے؟ آرزوئے حُسن ہی تو ہے۔ زندگی کی آرزو بھی حُسن ہے۔ "دوست" کو بھی حُسن ہی پیارا ہے۔ حُسن ہی سرچشمۂ صدق و سُرور ہے۔ مختصر یہ کہ حُسن ہی انسان کی آرزو بھی ہے اور ایمان آرزو بھی۔ حُسنِ "دوست" کی آرزو ہی انسان میں جذب و شوق پیدا کرتی، اور اسے اپنے اِلٰہ و رب کا پرستار، والہ و شیدا، اہلِ فکر اور صاحبِ حُسن و سُرور بناتی ہے۔ یہ آرزوئے دید ہی اہلِ جذب و شوق کو "دوست" کے گھر کشاں کشاں لے جاتی ہے، جہاں وہ کفن بردوش جان سپاری کے انداز میں اس کا طواف کرتے ہیں۔ عُمرہ اور حج کیا ہیں؟ آرزوئے "دوست" اور اسے پالینے کی طالب و جستجو کے مظاہر ہی تو ہیں۔ طواف کیا ہے؟ "دوست" پہ جان تک قربان کردینے کا ایک اندازِ عشق و مستی! سعی کیا ہے؟ عشق کی تڑپ اور فرض کی تکمیل کی والہانہ کوشش! عرفات میں حاضری کیا ہے؟ "دوست" کے حضور اپنی عبدیّت و فقر اور اس کی اُلوہیت و ربوبیّت کا اظہار و اقرار! اور قربانی کیا ہے؟ "دوست" کے اشارے پر اپنے لختِ جگر تک کو قربان کردینے کی رسمِ عاشقی کی تجدید ہی تو ہے!

کڑی : ۱

پس منظر

آرزوئے علم و شہادت جب سے میں نے ہوش سنبھالا، مجھے دو چیزوں کی طالب و آرزو رہی: شہادت اور علم کے حصول کی۔ میرا بچپن اور لڑکپن صرف اسی آرزو میں گزرا۔ عمر ساری علم کی طالب و جستجو میں کٹی۔ میں دُعا کا ہمیشہ سے قائل رہا ہوں۔ دُعا نے وہ کام کیے ہیں جو معجزے اور کرامات سے کم نہیں۔ جس طرح دُعا مانگنا عبدیت کا خاصہ ہے اسی طرح دُعا قبول کرنا ربوبیت کا خاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جو سب کا الٰہ و رب ہے، مجیب الدعوات ہے۔ اس کا یقین و اذعان ہی اصلِ ایمان ہے۔

مجھے بچپن ہی سے دین سے والہانہ شغف رہا ہے۔ میں موحّد تھا اور شرک سے مجھے شدید نفرت تھی، بلکہ اس سے بہت ڈرتا تھا اور اب بھی اس سے بہت ڈرتا رہتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرا یہ ایمان ہے کہ شرک ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ یہ ظلمِ عظیم ہے جس کی سزا جہنّم کی ابدی زندگی ہے اور جس کا ہر لمحہ صدیوں پر حاوی ہے۔ وہاں موت نہیں کیونکہ وہ الحیوان کا ایک حصّہ ہے۔

حکمت آموز باتیں بچپن ہی سے مجھے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی باتیں سُننے کا شوق تھا۔ مجھے ایک بزرگ نے بتایا کہ جو شخص دُنیا میں دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں اندھا اُٹھے گا، اور اندھوں کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ نیز جو خوش قسمت "یہاں" دل کے بینا ہوں گے وہ "وہاں" بھی بینا ہوں گے اور ان کا گھر جنّت میں ہوگا۔ اس سے میرے دل میں "بینا و بصیر" بننے کی طلب و جستجو پیدا ہوئی۔

ایک اور بزرگ نے بچپن ہی میں مجھے نصیحت فرمائی تھی: "بیٹا موت کو ہمیشہ یاد

رکھنا۔ اس دن سے موت کی یاد دل میں تیرِ نیم کش کی طرح پیوست ہو گئی۔ اس یاد نے میرے ساتھ کیا کیا اور میری ابلیس سے کس طرح حفاظت کی، اس کی داستان بصیرت افروز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ جب میں نے شباب میں قدم رکھا اور قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب سمجھنے لگا تو مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ "موت فانی اور زندگی لافانی ہے"۔ انسان نے جب ہر کہ ہمیشہ زندہ رہنا ہے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ابدی زندگی کی فکر کرے اور اس کے لیے جنت حاصل کرنے کی کوشش کرے، نیز جہنم کے ابدی و مستقل عذاب سے بچنے کی ہر ممکن سعی کرے۔

ذوق و شوقِ قرآن

امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید سے میرا عشق بڑھتا، اس کے رموز و اسرار مجھ پر کھُلتے اور میرا ایمان پختہ تر ہوتا چلا گیا کہ یہ زندہ خُدا کی زندہ کتاب ہے۔ یہ علم و حکمت اور حُسن و نُور کا خزینہ ہے۔ مسجد میں میرا دل طمانیت و مسرت حاصل کرنے لگا اور میں وہاں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگا۔ میں وہاں قرآنِ مجید کی تلاوت کرتا، سکول اور کالج کی کتابیں پڑھتا اور "دوست" کو بھی یاد کرتا رہتا، بلکہ ہر کام اسی کے حوالے سے کرنا میرا شعارِ زندگی بن گیا۔ میں وادیِ شوق میں تنہا سفر کرتا رہا، میرا خوب امتحانِ وفا لیا گیا۔ میں اپنے اللہ کے قرب و حضور کے لیے وظیفے پڑھتا اور دعائیں مانگتا رہا۔ شوق بڑھتا گیا، زندگی گزرتی گئی اور ہجر کی ساعتیں صدیاں بنتی گئیں۔ میں نے برِصغیر کی تحریکِ آزادی میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ امرتسر سازش کیس میں گرفتار بھی ہوا، لیکن بچ گیا۔ اس تجربے سے میرے دل و دماغ کی کایا پلٹ ہو گئی اور میں حصولِ علم و حکمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس پر قائم رہا۔ مجھے لہو و لعب سے نفرت ہو گئی اور وقت میرے لیے متاعِ گراں بن گیا۔ میں نے مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی اور اُردو کی تعلیم حاصل کی، تالیف و تصنیف اور ترجمہ و انشا پردازی کا فن سیکھا۔ اس دوران میں قرآنِ کریم میرے قلب و نگاہ کا محور رہا۔ اس کے اسرار و غوامض کو سمجھنے کی خاطر اس پر مسلسل غور و فکر کرنا، میرا محبوب و مقدس مشغلہ تھا اور اہلِ علم اور صاحبِ دل انسانوں سے ملنے کی مجھے ہمیشہ

طلب و جستجو رہتی تھی اور اب بھی رہتی ہے۔

درسِ قرآن اور نور کی بارش

امرتسر میں ہال دروازے کے باہر انجمن پارک تھا۔ وہاں ایک خوبصورت مسجد تھی، جسے مسجدِ نور کہتے تھے۔ اس مسجد میں فجر کی نماز کے بعد درسِ قرآن مجید ہوتا تھا۔ درسِ قرآنِ مجید مولانا مفتی محمد حسن مرحوم دیا کرتے تھے۔ میں روزانہ تقریباً دو میل پیدل چل کر درس سننے جایا کرتا تھا۔ مفتی صاحب درس دیتے وقت مثنوی مولانا رومؒ کے اشعار کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ وہ قرآنِ حکیم کے معانی و مطالب اس سوز و گداز سے بیان کرتے کہ سامعین پر رقّت طاری ہو جاتی اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، دلوں کی حالت بدل جاتی اور ان پر نور کی بارش ہونے لگتی۔ نظر اُٹھتی تو یوں لگتا کہ جیسے سارے حلقے پر نور کی پھوار پڑ رہی ہے۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں، اور دل سوز و ساز اور حسن و سرور سے معمور ہو جاتے۔ یہ صرف میرا احساس و تجربہ نہ تھا، بلکہ سب سامعین کا یہی احساس و مشاہدہ تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار یہ تجربہ ہوا کہ اہلِ حسن و سرور کی صحبت میں حسن و نور کی بارش بھی ہوتی ہے، جس سے دل ایمان کے سرور سے معمور ہو جاتے ہیں۔

میں وادیِ شوق میں تنہا سفر کر رہا تھا۔ میرا رہنما قرآنِ حکیم تھا لیکن مجھے معلّمِ انسانیت، رحمۃ للعالمین، پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے بھی عشق تھا۔ آپؐ کا اسوۂ حسنہ میرے لیے رُشد و ہدایت کا آئینہ دار تھا۔ کتاب و سُنّت ہی میری مُرشد و ہادی تھی۔ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا میرا وظیفہ تھا۔ مجھے اپنے الٰہ و ربّ اور اس کی مخلوقات سے محبّت تھی۔ کسی جاندار ہستی کو ستانا میرے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا۔ اہلِ محلّہ کی خدمت کرنا میرا شعار تھا۔ میں ابھی شباب کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ والدۂ ماجدہ کی شفقت اور ان کے سایۂ عاطفت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ گلستانِ زندگی دفعتاً ویران ہو گیا۔ اس کا فائدہ بھی ہُوا کہ دل سوز و گداز سے معمور ہو گیا۔ یادِ "دوست" سے طمانیت و سرور اور موت کی یاد سے درد و سوز ملتا رہا۔

طلب و جستجوئے حُسن

پھر مجھے حُسن سے بہت پیار ہو گیا۔ پیار تو پہلے بھی

تھا، لیکن اب میں اس سے جمالیاتی حظ اُٹھانے اور اس پر غور وفکر کرنے لگا۔ جمالیاتی حظ سے مُراد طمانیت وسکینت، سوز وساز اور کیف وسُرور ہے۔ یہ بھی قرآنِ مجید کا فیضان تھا کہ اُس نے میری جمالیاتی حِسّ زندہ وفعّال کر دی تھی اور مجھ میں جمالیاتی ذوق پیدا کر دیا تھا۔ یہ اعجازِ خصوصیّت سے اُن آیاتِ کریمہ کا تھا، جن میں جنّت کے نظّاروں اور نعمتوں کا ذکر ہے۔ کیا ہی دلکش درد پرور اور سُرور انگیز وبصیرت افروز اسلوبِ بیان ہے! صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان کا نہیں خدائے علیم وحکیم کا کلام ہے، جو خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ میں حُسن کے نظّاروں سے لُطف اندوز ہونے کے لیے باغوں کی سیر کرتا اور نہروں کے آبِ رواں کو دیکھتا رہتا، پھولوں کی صحبت میں بیٹھتا، اشجار کی چھاؤں میں طیُور کے حُسن کا تماشا کرتا اور ان کے گیت سُنتا۔ کالی گھٹائیں آتیں تو دِل تڑپ اُٹھتا۔ کیوں؟ میں اس راز سے بے خبر تھا، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ مجھے ان حسین نظّاروں میں کسی اَن دیکھے اِلٰہ کے حُسن کی پرچھائیاں دکھائی دیتی تھیں۔ میرے دل میں اس حُسن کی طلب وآرزو تھی، جو مجازی حُسن سے ماوراء اور اس کا سرچشمہ ہے۔ پہلے میں زندگی پر مصائب اور موت کے حوالے سے غور وفکر کرتا تھا۔ اب میں زندگی اور کائنات پر حُسن کے حوالے سے غور وفکر کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ حُسن ہی اِلٰہ، حُسن ہی سچ اور حُسن ہی سُرور اور مقصودِ زندگی ہے۔ لہٰذا انسان کی زندگی حسین ہونی چاہیے، کیونکہ حُسن ہی حُسن کو دیکھ سکتا ہے۔ جنّت درحقیقت حُسن المآب ہے، وہاں اہلِ حسن وسُرور ہی جائیں گے۔ یہی حیاتِ انسانی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سرّ الاسرار

پھر اس سرّ الاسرار سے بھی آگاہی ہو گئی کہ اپنے حقیقی اِلٰہ کا قرب ووصال اسی خوش نصیب کو حاصل ہوتا ہے، جو صاحبِ حُسن وسُرور ہو، یعنی جس کی زندگی حسین، سچی اور اس کا نفس مُطمئن ہو۔ میں ابھی تک دیدِ اِلٰہ سے محروم تھا، گو اس کے حُسن کے جلووں سے کیف وسُرور حاصل ہوتا رہتا تھا۔

کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ مناظرِ حُسن میں "اُس" کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ عبادت میں ایک عجیب طرح کی سرور انگیز لذت ملتی تھی، لیکن لوح و قلم سے میرا پیار بڑھتا چلا گیا۔ مسائلِ حیات، و کائنات پر غور و فکر کرنا میری عادت بن گئی، لیکن میری سوچ وحیِ الٰہی اور سنّتِ حسنہ کے حوالے سے ہوتی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں فلسفے کی پُرتشکیک راہوں سے گمراہ ہوئے بغیر گزر گیا، اور میرا ایمان پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ یہ سب کچھ فیضانِ "دوست" سے ہوا۔ میں چونکہ اس کا فقیر بن چکا تھا، اس کی رحمت سے محروم کیوں رہتا؟ سچ تو یہ ہے کہ مانگنے والے کبھی اس کے در سے محروم نہیں جاتے، کیونکہ وہ ربّ العالمین اور مجیب الدعوات ہے۔

تہجدّ اور عصر کے وقت ارواح اپنے اِلٰہ کے قرب و وصال کے لیے بے قرار ہو جاتی ہیں، اسی طرح اِلٰہ کو ان اوقات میں اپنے اہلِ شوق کے نظارہ عبودیت کی آرزو ہوتی ہے۔ رُوح اس کی دید کی اور وہ اس کے اظہارِ محبت کا متمنی و منتظر ہوتا ہے۔ مجھے یہ راز ایک صاحبِ حُسن و سُرور سے معلوم ہوا تھا۔ میں بھی ان اوقات میں اپنے اِلٰہ کو تلاش کرنے لگا۔ میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ میری والدہ ماجدہ تہجدّ گزار بھی تھیں اور عصر کے وقت تلاوتِ قرآن مجید بھی کیا کرتی تھیں۔ شاید وہ اسی لیے مجھے سب بچوں سے زیادہ پیار کرتی تھیں، اور مجھے بھی ان سے بہت زیادہ پیار تھا۔ غالباً یہ ان کی دعاؤں کا اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسے کام کے لیے منتخب کر لیا، جو میری نسلوں کے لیے بھی سرمایہ سعادت و افتخار رہے گا۔

حُسنِ مجسّمؐ، یدِبیضا اور اعجازِ نفسِ مسیحائی کا مشاہدہ و تجربہ

وہ رات میرے لیے شبِ قدر بلکہ اس سے بھی عزیز تر تھی۔ اس مبارک رات میں مجھے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بادشاہی مسجد لاہور کی طرز کی ایک عالی شان مسجد ہے اور میں اس کی ڈیوڑھی میں ایک بہت بڑے حوض کے قریب

کھڑا ہوں۔ میرا منہ قبلے کی طرف ہے۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مسجد کے دالان کے کونے کے دروازے سے ظہور پذیر ہوئے۔ میری آنکھوں کے سامنے برقِ حسن لہرائی اور مجھے حیران کر گئی۔ میں اس حسین و حیرت انگیز مشاہدے سے مسحور ہو گیا۔ ابھی وہ لمحۂ حیرت ہی میں تھا کہ دفعتاً آپ نے گریبانِ مبارک سے اپنا دستِ مبارک باہر نکالا اور مجھے دکھایا۔ دستِ منوّر اِس قدر منوّر تھا کہ میری آنکھیں اس کے نظارے کی حریف نہ ہو سکیں اور نظر شہیدِ نظارہ ہو گئی۔ دل کو بھی تابِ نظارہ نہ رہی۔ دستِ مبارک نورِ مجسّم تھا۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا: "یدِ بیضا" اور پھر میں تڑپ کر گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

"تفسیر کبیر" لکھنے کا ارشاد

اچانک میرے کانوں میں جاں آفریں آواز آئی: "اُٹھ ناصر! تفسیر کبیر پڑھ۔ اُٹھ ناصر! تفسیر کبیر لکھ۔ اُٹھ ناصر! تفسیر کبیر لکھ۔" یہ آواز فردوسِ گوش اور رُوح پرور ہی نہ تھی، بلکہ صدائے "کُن" کی طرح حیات بخش بھی تھی۔ میں زندہ ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میرے سامنے تشریف فرما ہیں اور میں آپ کے پائے مبارک میں پڑا ہوں۔ اِدھر میں تعظیم کے لیے اُٹھا، اُدھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں شہیدِ نظارۂ رسالت مآب تھا۔ زندہ و بیدار ہوا تو نہ حضورِ پُرنور جلوہ افروز رہے، نہ آپ کی آوازِ مبارک فردوسِ گوش رہی، اور نہ آپ کے حسن و نور کا نظارہ جنّتِ نگاہ رہا۔ دل پر قیامت گزر گئی، لیکن مجھے صاحبِ دید و سُرور بنا گئی۔ اس مشاہدے نے میرے قلب پر گہرا اثر کیا۔ میں نے اپنے ایک صالح دوست الوری صاحب سے اس کا ذکر کیا۔ الوری صاحب نے کہا: "میں نہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو علم و حکمت عطا کرے گا۔ یہ اس کی بشارت ہے۔" سارا دن میری رُوح مسرّت و حیرت کے عالم میں رہی۔ عقل اس مشاہدے کی کوئی توجیہہ نہ کر سکی۔ دوسری رات پھر خواب میں بعینہٖ یہی صورتِ حال پیش آئی۔ حضورِ پُرنور، یدِ بیضا، میرا مرنا اور آپ کے فرمان پر دوبارہ زندہ

ہونا، اور ساتھ ہی بیدار ہو جانا۔ یہ محض خواب نہ تھا۔ یہ یقیناً رویائے صادقہ تھا۔ اس نے میرے قلب کی کایا پلٹ کر دی۔ میرے اندر ایک ایسی قوت پیدا ہو گئی، جس نے میرے ارادہ و اختیار پر قابو پا لیا۔ میں نے اپنی زندگی حصولِ علم کے لیے وقف کر دینے کا فیصلہ کیا، اور اس کے لیے مجھے بڑے صبر آزما بلکہ شکیب رُبا امتحانوں سے گزرنا پڑا۔

تحریکِ پاکستان اور ہجرت

شوق، محنت اور تائیدِ ایزدی سے مُشکل سے مُشکل مراحل آسانی سے طے ہونے لگے۔ ابلیس جمالیاتی فریب دیتا رہا، شیاطین حوصلہ شکنی کرتے رہے، اور امتحان دفا ہوتے رہے، لیکن میں اپنی دُھن میں لگا رہا۔ مشاہدہ ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا۔ یہ شبِ عید الاضحیٰ کا یادگار واقعہ ہے، اس دن کا دوسرا یادگار واقعہ میری دُختر ارجمند نگہت کی ولادت ہے، جو اپنی صالحیت، صاحبدلی اور مجھ سے والہانہ پیار کرنے کے باعث آج تک میری معروضِ شفقت، آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کا سُرور ہے۔ اس کے تقریباً چار سال بعد، ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان دونوں کو کامیابی نصیب ہوئی، اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات کا بازار ایسا گرم ہوا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ غارت گری و خونریزی اور سفّاکی و آبرو ریزی کے انسانیت سوز واقعات اس قدر ظہور پذیر ہوئے کہ ابلیس کی روح بھی کانپ اُٹھی ہو گی۔ یہ سب کچھ دین، دھرم، قوم، وطن کے نام پر ہوا۔ یہ دیکھ کر اہلِ نظر و صاحب دل لوگوں نے کہا: "اللّٰہ تعالیٰ کا ارشاد کتنا سچا ہے کہ "انسان ظالم و جاہل ہے"! ظُلم کوئی بھی کرے، بہر حال ظُلم ہے۔ انسان یہ حقیقت کیوں بھول جاتا ہے کہ کُل اولادِ آدم اللّٰہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور کُل انسان اس کے بندے ہیں، اور تنہا وہی سب کا اِلٰہ اور ربّ ہے، لہٰذا اللّٰہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ اللّٰہ تعالیٰ کے دوست اس کے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتے۔ وہ تو سب کے لیے رحمت ہوتے ہیں۔ یہی تو رحمۃ للعالمین ﷺ کی سُنّتِ حسنہ ہے۔ یہ راز صرف اہلِ محبّت ہی جانتے ہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہمیں بھی امرتسر سے ہجرت کرنا پڑی۔ ملازمت گئی، جو کچھ تھا لٹ گیا۔ خانماں بربادوں کے ساتھ ہمیں لاہور آنا پڑا۔ یہاں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ غیر مسلموں کی دکانیں، گھر اور کارخانے لوٹے جا رہے تھے۔ اغوا اور قتل و غارت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مجھ سے یہ بھیانک اور انسانیت سوز مناظر دیکھے نہ گئے۔ ہم لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے لیکن یہاں نہ رہنے کو گھر ملا اور نہ ملازمت ہی ملی۔ کاروبار کے لیے نہ پیسہ تھا نہ تجربہ، عزیز و اقارب اپنے اپنے حال میں مست تھے، اور ادھر خودداری و توکّل نے منہ پہ تالے لگا دیے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ موت کی آرزو پیدا ہوئی۔ دل نے خودکشی کا فیصلہ بھی کر لیا اور میں اپنے آپ کو سمندر کی لہروں کی نذر کرنے کے لیے منوڑہ پہنچ بھی گیا۔ قریب تھا کہ سمندر میں گر کر اس کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جاتا کہ دفعتاً کسی نے متنبہ کیا: "خودکشی حرام موت ہے، جس کی سزا جہنّم کی ابدی زندگی ہے۔ زندگی تمھاری نہیں، تمھارے اِلٰہ و ربّ کی امانت ہے۔ تمھیں مرنے کے لیے نہیں، زندہ رہنے اور "تفسیرِ کبیر" لکھنے پر مامور کیا گیا ہے"۔

مجھے دفعتاً وہ رویائے صادقہ اور مشاہدہ یاد آ گیا۔ یاد آیا کہ مجھے تو "تفسیرِ کبیر" لکھنے کے لیے مارا اور پھر زندہ کیا گیا ہے۔ میں تو امر ہوں۔ مجھے تو یہ کام کرنا ہے۔ یہ میرے آقائے نامدار صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا فرمان ہے۔ مجھے اس امتحان سے گزرنا اور کامیاب گزرنا ہے۔

نشّۂ تغافل

دُوسرے دن اچانک مجھے ایک کام مل گیا۔ میں کاروبار میں لگ گیا۔ مفلوک الحالی جلد ہی مرفہ الحالی میں بدل گئی۔ دو برس کاروبار کیا، دولت کمائی، گھر لیا اور آسودگی سے زندگی بسر کی لیکن مرفہ الحالی کے یہ دو برس میری زندگی کے بدترین ایّام تھے۔ میں اگرچہ صوم وصلوٰۃ کا پابند اور پرہیزگار بھی رہا، لیکن میری عبادت بے حضور و بے سُرور تھی۔ اِلٰہ و ربّ سے رابطہ نہ رہا تھا۔ کاروباری مشاغل میں اُلجھ کر میں اپنا مقصودِ زندگی فراموش کر بیٹھا تھا۔ دیکھنے اور ملنے والے مجھ پر رشک کرتے تھے، لیکن انہیں کیا پتا تھا بلکہ خود مجھے بھی پتا نہ تھا کہ میں دولتِ دل سے تہی دست ہو چکا ہوں۔ "دوست"

مجھ سے جُدا ہو چکا ہے۔ میں اپنے اللہ و ربّ سے محروم ہو چکا ہوں۔ دولت نے مجھے مفلس بنا دیا ہے اور دُنیا کے سہاروں نے مجھے بے سہارا کر دیا ہے۔ میں حُسن و سُرور کی لذّت و مفہوم سے نا آشنا ہو چکا تھا۔ دولت نے مجھے کور ذوق و حُسن کور بنا دیا تھا۔ قرب و حضوری کی بجائے دُوری و مہجوری میرا مقدّر بن چکی تھی۔ یہ کتنی حرماں نصیبی و نامرادی تھی، لیکن لوگ اس حقیقت سے نا آشنا تھے، بلکہ مجھے خود بھی اس حقیقت کا شعور نہ تھا۔

آوازِ "دوست"

میں نشۂ تغافل میں سرشار تھا، اگرچہ کبھی کبھی میرے دل میں ایک خلش سی پیدا بھی ہوتی تھی، لیکن میں اس کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ آخر کار چھٹی کے ایک دن، سہ پہر کا وقت تھا، عصر کی نماز کے بعد میں پلنگ پر لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے میرے دل میں کہا: "کیا تجھے اس کاروبار کے لیے تیار کیا ہے؟ تجھے تو "تفسیرِ کبیر" پڑھنے اور لکھنے کے لیے زندگی عطا کی گئی تھی۔" یہ ندائے غیبی یقیناً میرے اللہ و ربّ کی تھی۔ وہی اُلوہی اندازِ بیان تھا۔ اس میں وہی اثر و سحر تھا۔ اس آوازِ "دوست" نے مجھے ہوشیار کر دیا اور میرا نشۂ تغافل ہرن ہو گیا۔ میں نے کاروبار بند کر کے سب کچھ بیچ دیا اور سرکاری ملازمت کر لی تاکہ مجھے لکھنے پڑھنے کے لیے وقت مل سکے۔ آمدن جتنی تقلیل ہو گئی دولتِ دل اتنی ہی زیادہ ملنے لگی۔ میری جمالیاتی حِس بیدار ہو گئی اور میرا جمالیاتی ذوق نشو و ارتقا کرنے لگا۔ میں قرآنِ مجید کے مطالعہ میں منہمک ہو گیا۔ ایک دن اچانک مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ قرآنِ مجید کتابِ حُسن اور اللہ تعالیٰ حُسن کا سرچشمہ ہے۔ زندگی حُسن، کائنات حُسن اور جنّتِ حُسن ہے۔ نیز یہ حُسن ہی ہے جو حُسن کو دیکھتا اور اس سے لذّت و سُرور حاصل کرتا ہے "دوست" نے چپکے سے کہا: "قرآنِ مجید کا جمالیاتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر اور حُسن کی تفسیر لکھ۔"

قرآنِ حکیم اور جمالیات

دل سچا اور حسین ہو تو وہ "دوست" کو دیکھتا اور اس کی آواز کو پہچانتا بھی ہے۔ ہائے کتنی کیف پرور و سُرور انگیز تھی اس کی آواز! میں نے جمالیات پر کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیا،

حالانکہ میں جمالیات سے قطعاً ناآشنا تھا۔ جمالیات اس کتاب کا موضوع تھا اور یہ از بس دشوار تھا اور مجھے اسے قرآنِ حکیم کی روشنی میں حل کرنا تھا۔ میں قرآنِ مجید کے مطالعہ میں مستغرق ہو گیا۔ قرآنِ مجید زندہ خدا کا زندہ کلام ہے۔ جو شخص اسے اپنا رہنما بنا لے وہ اس کی اس طرح رہنمائی کرتا ہے جس طرح زندہ عالم و حکیم انسان، لیکن قرآنِ حکیم کی ہر بات سچی اور بصیرت افروز ہوتی ہے۔ میں اس موضوع پہ کام کرتا رہا، عقدے کھلتے گئے اور اسرارِ حُسن منکشف ہوتے گئے۔

پُراسرار قلبی واردات

۱۹۵۲ء میں میرا تبادلہ کراچی سے راولپنڈی ہو گیا۔ ایک مقام پہ آ کر کام رُک گیا۔ تخلیقِ کائنات کا عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ تقریباً نو ماہ گزر گئے۔ میں نے تفاسیر و کتبِ احادیث اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں پڑھیں، علماء و حکماء سے مشورہ کیا، لیکن دل مطمئن نہ ہوا۔ دُعائیں مانگیں، الحاح و زاری کی، لیکن بات نہ بنی۔ آخرکار میں نے اپنے اللہ و رب سے فیصلہ کُن بات کرنے کا عزم کر لیا۔ میں حسبِ معمول صحن میں پلنگ پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ قرآنِ مجید میرے ہاتھ میں تھا اور میں متعلقہ آیات پہ غور و فکر کرنے میں مشغول تھا۔ جب گھر کے لوگ سو گئے تو میں اُٹھا اور اپنے کمرے میں عشاء کی نماز پڑھنے لگا۔ فارغ ہوتے ہی میں سجدے میں گر پڑا۔ خوب رویا، اتنا رویا کہ آنکھیں خشک ہو گئیں۔ خوب الحاح و زاری کی۔ کیا سعادت و برکت کا وقت تھا وہ کہ مجھے اپنے اِلٰہ کی حضوری نصیب ہو گئی۔ آہ و زاری کے بعد میری محبت نے شوخی کا انداز اختیار کر لیا۔ یہ سب کچھ "اُسی" کے اشارے سے ہوا۔ میں نے کچھ اس طرح عرض کیا۔ "اے خدا! یہ مسئلہ حل کر دے۔ یہ عقدہ میرے لیے کھول دے۔ میں عاجز آ گیا ہوں۔ اگر تیری مشیت یہ ہے کہ میں بے خبر رہوں اور کتاب نہ لکھوں تو تیری ذات کی قسم میں مسودہ پھاڑ دوں گا اور پھر کوئی کتاب لکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن اگر تو چاہتا ہے اور یقیناً چاہتا ہے کہ میں یہ کتاب اور تفسیرِ کبیر لکھوں، کیونکہ تُو نے ہی مجھے تفسیرِ کبیر لکھنے کا حکم دیا ہے، تو پھر تخلیقِ کائنات کا مسئلہ آج اور بالکل آج حل ہو جانا چاہیے۔ اگر آج یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو میں یہ سمجھوں گا

کہ تیری مشیت میں نہیں کہ میں کتاب لکھوں۔ تُو دلوں کا حال جانتا ہے۔ تیری قسم میں کل مسودہ پھاڑ دوں گا اور کتابیں ضائع کر دوں گا۔"

غرض دنیائے محبت کے بعد میں سجدے سے اُٹھا اور اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا اور حسبِ معمول اس مسئلے پر غور و فکر کرنے لگا۔ دُنیا محوِ خواب تھی۔ سکوت کا عالم تھا۔ میرے سینے پر قرآنِ مجید تھا اور میں فکر میں مستغرق تھا۔ خدا جانے یہ عالمِ تفکّر و استغراق کب تک رہا! اسی عالمِ خواب و بیداری میں کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پاس دو فرشتے موجود ہیں۔ میں ان فرشتوں کو ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میں چت لیٹا ہوا تھا۔ انھوں نے خدا جانے کس طرح میرا سینہ چاک کیا کہ مجھے قطعاً کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ پھر انھوں نے میرے سینے سے میرا دل نکالا اور اسے کس چیز سے دھویا، مجھے معلوم نہیں۔ دِل دُھل گیا تو انھوں نے اسے پھر میرے سینے میں رکھ دیا۔ دل اب وہ دل نہ تھا جو پہلے تھا۔ وہ حُسن و نُور و سُرور سے معمور ہو چکا تھا۔ اس میں ایک ایسی ٹھنڈک پیدا ہوئی، جس میں ایسا کیف و سُرور تھا، جس کی لذّت سے دل نہ آشنا تھا اور نہ پھر کبھی آشنا ہوا۔ وہ فردوسی و سُرور انگیز ٹھنڈک اتنی تیز ہو گئی کہ میں بیدار ہو گیا۔

یہ معاملہ نیم خوابی و نیم بیداری کی حالت میں پیش آیا۔ شقِّ صدر سے انشراحِ صدر ہو چکا تھا۔ میرے سینے پر قرآنِ مجید بدستور موجود تھا۔ مجھے کسی غیبی قوّت نے تخلیقِ کائنات کے مسئلے پر لکھنے کی تحریک کی۔ میں نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں کیا لکھتا رہا، اور کون سی قوّت مجھ سے لکھواتی رہی، مجھے اس حقیقت کا علم نہیں۔ بہر حال، جب میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کر چکا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں سخت تھکا ہوا اور مضمحل ہوں۔ مجھے قرآنِ مجید اندر کمرے میں رکھنے کے لیے جانا پڑا تو چند گز کا فاصلہ میلوں کا فاصلہ بن گیا۔ بدن سخت مضمحل اور روح بے حد مسرور تھی۔ مجھے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ صبح اُٹھا تو رات کے واقعے نے دل کی کایا پلٹ کر دی تھی۔ قرآنِ مجید میرا مرشد و رہنما بن چکا تھا۔ مسائلِ زندگی

حل اور حقائقِ حُسن آشکارا ہونے لگے تھے ۔

ایک طرف "دوست" کی جانب سے حُسن و سُرور اور علم و حکمت کی بخششیں تھیں ، مگر دوسری طرف مجھے مسلسل کٹھن امتحانِ زندگی سے بھی گزرنا پڑ رہا تھا ۔ بعض اوقات امتحانِ زندگی اس قدر صبر آزما ہوتا کہ میں سخت گھبرا جاتا ۔ لیکن "دوست" نے ہر مشکل سے مشکل مرحلے پر میری مدد کی ، مجھے نظر انداز نہ کیا ، اور مجھے اس کام پر لگائے رکھا ۔ یہ کتاب بالآخر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ۔ اس کتاب کا نام ہے "جمالیات ، قرآنِ حکیم کی روشنی میں" ۱۹۵۸ء میں یہ شائع ہوئی اور پنجاب یونیورسٹی نے اسے ۱۹۵۸ء کی بہترین قرار دے کر پہلا انعام دیا ۔

زندگی میں انقلاب آتے رہے ، اور وہ شکیب رُبا امتحانوں سے گزرتی رہی ، لیکن میں مطالعۂ قرآن و حدیث ، تفکرِ مسلسل اور تالیف و تصنیف کے کام میں مصروف رہا ۔ اپنے بیگانے سبھی مجھے دیوانہ خیال کرتے تھے ۔ مجھے خدمتِ لوح و قلم کرنے کے سوا کسی اور شغل سے دلچسپی نہ تھی ۔ تنگدستی ایک مستقل روگ تھا ، لیکن اس کے باوجود زندگی مطمئن و خوشحال تھی اور میں بڑے ہی جذب و شوق کے ساتھ پرورشِ لوح و قلم کرتا رہا ۔ "دوست" مشاہدات و واردات سے نوازتا رہا ۔ مجھے ایک مشاہدہ یاد آیا ہے ، جسے اہلِ جذب و شوق کی دلچسپی کی خاطر مختصراً بیان کرنا چاہتا ہوں ۔

اولیاء اللہ کی بزم میں

یہ ۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے ۔ میں ان دنوں کوئٹے میں تھا ۔ سرما کی ایک ٹھنڈی رات تھی ۔ میں اپنے کمرے میں تنہا غور و فکر اور خامہ فرسائی میں مشغول تھا ۔ رات زیادہ بھیگ گئی تو مجھے بھی نیند آگئی ۔ اس رات میں نے ایک خواب دیکھا ۔ اللہ کرے کہ وہ سچا ثابت ہو ۔ میں نے دیکھا کہ چند احباب کے ساتھ میں ایک بہت بڑے کمرے کی طرف جا رہا ہوں ۔ برآمدے میں سے گزر کر جب میں اس کے دروازے پر پہنچا تو وسیع و عریض کمرہ اہلِ حُسن و سُرور اور صاحبِ نظر بزرگوں سے بھرا پڑا تھا اور تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی ۔ معلوم ہوا کہ سب اولیاء اللہ ہیں ۔ وہ سب فرش پر تشریف فرما تھے ،

لیکن ایک بزرگ کھڑے تھے۔ وہ کھدر کا کرتا پہنے، کھدر کی چادر باندھے ہوئے تھے اور ان کے سر پر کھدر ہی کی دستار تھی۔ وہ ذکر بالجہر کرنے میں مشغول تھے۔ وہ جو ذکر کرتے، سب اہلِ مجلس اُسے دہراتے تھے۔ مجلس میں جذب و شوق اور سوز و مستی کی کیفیت طاری تھی۔ میں دہلیز پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کہ اس بزرگ کی نظر مجھ پر پڑی، اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ میرے منتظر تھے۔ فوراً ایک کرسی لائی گئی اور اسے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا دیا گیا۔ وہ بزرگ آگے بڑھے اور انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے کرسی پر بیٹھتے حجاب آ رہا تھا اور ابھی میں عالمِ تذبذب ہی میں تھا کہ ارشاد ہوا "بیٹھو اور مجلسِ ذکر کی قیادت کرو"۔ مجھ میں تابِ انکار نہ رہی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور ذکر کرنے لگا اور ساری مجلس اب میری متابعت کرنے لگی۔ مجلس پر پھر وجد و حال اور جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میری بھی یہی کیفیت تھی۔ ذکرِ الٰہی جذب و شوق سے جاری تھا اور روح و رواں سرمستی میں جھوم رہے تھے کہ دفعتاً میری آنکھ کھل گئی۔ میری زبان پر وہی ورد جاری تھا۔ میرے قریب قلم اور کاغذ موجود تھا۔ میں نے اسے لکھ لیا۔ یہ مشاہدہ و واردات بھی میری روحانی زندگی کی متاعِ گراں بہا ہے۔

میں جمالیات پر رسائل و مقالات اور کتابیں پڑھتا اور لکھتا رہا، لیکن میری فکر و نظر کا مرکز و محور قرآنِ مجید ہی تھا۔ قرآنِ مجید میرے لیے علم و حکمت کی ایک سچی کسوٹی تھا، جس پر میں فلسفہ و جمالیات کا ہر نظریہ جانچتا تھا، اور پھر اسے قبول کرتا تھا، جو اس الہامی کسوٹی کے مطابق سچا ہوتا تھا۔ شق القدر اور تزکیۂ قلب کے بعد میں اس کسوٹی کو جانچنے کا ماہر ہو گیا تھا۔ یہ فیضانِ الٰہی تھا، جو مجھے غالباً اس لیے عطا ہوا تھا کہ مجھے "تفسیرِ کبیر" لکھنا تھی۔

وقت گزرتا گیا، جوانی کی بہاریں آتی اور گزرتی گئیں، لیکن میں عالمِ جذب و شوق میں سرمست رہا۔ مشاہدات روزمرہ کے معمول بن چکے تھے۔ میں نے ایک کتاب جنّت پر لکھنے کا فیصلہ کیا۔ میری قریب قریب ہر دُعا قبول ہوتی رہی اور میں جنّت کے نظّارے دیکھتا رہا۔ اعراف بھی دیکھا اور دوزخ کی ایک جھلک بھی نظر آئی۔ مشاہدات ہوتے رہے، لیکن

میری زبان بند رہی، اور "تفسیرِ کبیر" لکھنے کی ابتدائی تیاریوں میں مشغول رہا۔

مسئلۂ وحدت الوجود اور دیدِ "دوست"

مسئلۂ وحدت الوجود مجھے درپیش تھا۔ میں نے حتی الوسع بہت کچھ پڑھا اور اس پر غور و فکر بھی بہت کیا، لیکن دل کو اطمینان نہ ہوا۔ شکوک و شبہات دل سے نکلتے ہی نہیں تھے۔ آخر دل نے کہا: "اپنے اللہ سے کیوں نہیں پوچھتے؟" میں نے اپنے اللہ سے رجوع کیا، اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوا، دعا کی کہ مجھ پر وحدت الوجود کی حقیقت منکشف ہو جائے۔ دعا مستجاب ہوئی۔ رات سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایک از بس حسین و دلکش صورت میں میرے سامنے ہے اور کل کائنات کو محیط ہے۔ کائنات کہاں؟ وہاں صرف اس کی ذات تھی۔ نہ مکان تھا نہ زمان اور نہ ابعاد ہی تھے۔ صرف میں تھا یا میرا اللہ۔ میں ایک نقطے کی طرح اس کے پاؤں میں تھا اور وہ ایک طرف میرے بالکل قریب تھا اور دوسری طرف حدِ نگاہ سے بھی ماوراء تھا۔ یہ منظر بے حد حیرت انگیز و ناقابلِ ادراک ہونے کے باوجود انتہائی حسین و سرور انگیز اور بصیرت افروز تھا۔

بیدار ہونے پر جب میں نے اس پر غور کیا تو مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار دیدارِ الٰہی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ خوبصورتی کی حقیقت کا بھی مجھے پہلی مرتبہ ادراک و مشاہدہ ہوا تھا۔ ذوقِ نظر لا تو شوقِ دید اور تیز ہو گیا۔ جذب و مستی کی کیفیت بھی بڑھ گئی۔ اپنے اور بیگانے مجھے دیوانہ و سادہ لوح سمجھنے لگے اور بعض احباب میرے جنونِ شوق کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ میں طنز و مزاح کے تیر کھاتا رہا، لیکن کسی کو اپنے حال سے آگاہ نہ کیا اور نہ کسی کو اپنا ہمراز ہی بنایا۔ جذب و شوق کی راہ میں کون ہے جو ہمراز و ہمراہ بننے کی ہمت رکھتا ہے۔ میں تن تنہا شوق کی وادیٔ پُرخار میں برہنہ پا اپنی راہ پہ گامزن رہا۔

تخلیقِ زمان و مکان

اب ایک اور مسئلہ مجھے درپیش تھا، اور وہ تھا زمان و

مکان کی تخلیق کا مسئلہ۔ حسبِ معمول میں نے پھر اپنے اِلٰہ و ربّ سے دُعا کی۔ اس نے اپنی رحمت سے پھر مجھے نوازا اور پھر مشاہدے کی سعادت عطا کی۔ میں نے دیکھا کہ حریمِ کبریا سے حُسن و نُور کی موجیں مسلسل نکل رہی ہیں اور چاروں طرف پھیلتی جا رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ زمان و مکان کی تخلیق ہوتی جا رہی ہے۔ مجھ پر پہلی بار یہ عُقدہ کھُلا کہ زمان و مکان کی تخلیق ایک ہی ساتھ ہوئی ہے، اور اس سے فلسفے کی بہت سی گتھیاں حل ہوگئیں۔

حریمِ کبریا اور تکوینِ مکان و زمان کا نظّارہ بڑا ہی دلکش، حیرت انگیز اور حکمت آموز و بصیرت افروز تھا۔ مجھے جو دولتِ دل ملی تھی، اس سے میرے اِلٰہ کے سوا کوئی اور واقف نہ تھا۔ میں راہِ جذب و شوق میں بڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اِس دوران میں زندگی کے کٹھن امتحانوں سے بھی مجھے گزرنا پڑا، لیکن میں بڑے ہی ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ اپنا کام کرتا رہا۔

تفسیرِ کبیر سے مُراد سیرۃُ النبیؐ تھی

مجھے "تفسیرِ کبیر" لکھنے کا حکم ملا تھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ مجھے قرآنِ حکیم کی تفسیر اس طرح لکھنی ہے جس طرح دوسرے مفسّر لکھتے آئے ہیں۔ ایک دن یکایک مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ تفسیرِ کبیر سے مراد یہ ہے کہ میں نبیِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ لکھوں۔ آپؐ کی عملی زندگی سے بڑھ کر قرآنِ حکیم کی اور کون سی تفسیر ہو سکتی ہے؟ مجھے جب اس بات کا اِذعان و ایقان ہوگیا تو میں نے اپنے اِلٰہ کی بارگاہ میں دُعا کی اور منّت مانی کہ میرے اِلٰہ و ربّ! میں تیرے حکم کے مطابق تیرے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ لکھنے کا عزم رکھتا ہوں، لیکن میں اس کتاب کی شروعات آپؐ کے روضۂ اطہر پر جا کر کرنا چاہتا ہوں۔ میں روضۂ اطہر کی خاکِ پاک کو اپنے لیے سرمۂ بصیرت بنانا چاہتا ہُوں۔ تُو مجھ پر کرم کر اور مجھے وہاں پہنچا دے تاکہ میں یہ کام شروع کر سکوں۔

ماہِ جمال و کمالؐ کی زیارت

دن مہینوں کی اور مہینے سالوں کی صُورت اختیار

کرتے چلے گئے، اور میں الحاح و زاری اور التجائیں کرتا رہا۔ کئی مرتبہ حج اور عمرے کی تیاری بھی کی، لیکن ہر بار اس سعادت سے محروم رہا۔ ایک برس رمضان المبارک کے ایام تھے۔ گھر میں ہر روز نمازِ عشاء کے بعد ذکر کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ ایک شب محفلِ ذکر ختم ہوئی اور سب افرادِ خانہ سونے کے لیے چلے گئے تو میں بارگاہِ الٰہی میں سربسجود ہو گیا۔ دل بھرا ہوا تھا، خوب رویا اور الحاح و زاری کی۔ روضۂ اطہر کی زیارت کے لیے خوب دُعا مانگی۔ اس رات خواب میں مجھے حضورِ پُرنور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ تیسری زیارت تھی۔ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم عالمِ شباب میں تھے اور ابھی ریشِ مبارک آئی نہ تھی۔ چہرۂ مبارک چاند سے زیادہ پُرنور و حسین تھا۔ شباب کا وہ عالم تھا کہ نظر آپؐ کے حُسنِ قد و قامت کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ آپؐ مجسّم جمال و جلال اور پیکرِ موزونی و زیبائی تھے۔ اس نظارہ سے روح مسحور و متکیف ہو گئی، اور دل کو اس قدر اطمینان و سرور حاصل ہوا کہ قلم اس کے بیان سے عاجز ہے۔ مختصر یہ کہ آپؐ کا جمال و جلال مثالی مردانہ حُسن تھا، جس کی زیارت سے سینہ دولتِ دل سے معمور ہو گیا۔

مردِ مجاہد و عاشقِ رسولؐ سے مُلاقات

کئی برس اور گزر گئے۔ ایک رات میں نے امیرِ شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مرحوم کو خواب میں دیکھا۔ وہ خطیبِ بے عدیل تھے۔ قرآنِ شریف پڑھتے تو دلوں پر وجد طاری ہو جاتا اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ انھوں نے ساری زندگی جہاد اور وعظ و تبلیغ میں گزار دی تھی۔ میرے والد ماجد حکیم محمد سکندر خضر مرحوم کے عزیز ترین دوستوں میں تھے اور ہمارے ہمسائے بھی تھے۔ انھیں مجھ سے بہت پیار تھا۔ میں انھیں چچا جان کہا کرتا تھا۔ خواب میں وہ جوانی کے عالم میں نظر آئے۔ ان کا چہرہ پُرنور اور آنکھیں شعلۂ ایمان سے فروزاں تھیں۔ بڑی ہی پُرجلال ان کی شخصیت تھی۔ میں نے دیکھتے ہی انھیں سلام کیا، انھوں نے بڑے پیار سے مجھے گلے لگا لیا۔ جب ہم علیحدہ ہوئے تو انھوں نے فرمایا: "ناصر،

ہماری جماعت میں شامل ہو جاؤ"۔ میں نے فوراً جماعت میں شامل ہو جانے کی ہامی بھر لی۔ اس خواب کی تعبیر میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میرے اللہ نے پھر میری دُعا قبول کی اور مجھے اس کی تعبیر القا کر دی۔ مجھے اسلام کے مبلّغین کی جماعت میں شامل ہونا تھا، یعنی تبلیغ کا کام کرنا تھا۔ میں نے عام لوگوں کے لیے بالعموم اور تشکیک پسند نوجوانوں کے لیے بالخصوص مضامین لکھنے اور شائع کرانے کا فیصلہ کیا۔ مضامین کے اس سلسلے کا مستقل عنوان تھا "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی"۔ مضامینِ قرآنی کا یہ سلسلہ ۱۹۷۱ء سے روزنامہ امروز کی خصوصی ہفتہ وار اشاعت میں اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ میں ۱۹۷۷ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا وائس چانسلر نامزد نہ ہو گیا۔

اہلِ فقر کو ایسے عہدے کب راس آتے ہیں۔ مجھ پر عارضۂ قلب کا شدید حملہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے جان تو بچا لی، لیکن میں اس قدر مضمحل و نحیف ہو گیا کہ لکھنا، پڑھنا چھوٹ گیا، لوح و قلم سے رشتہ ٹوٹ گیا اور بادلِ ناخواستہ مضامین کا وہ سلسلہ بند کرنا پڑا جو سات برس سے روزنامہ امروز کی خصوصی اشاعت جمعۃ المبارک میں جاری تھا۔ مجھے اس بات کا سخت قلق ہوا، لیکن میں مجبور تھا۔ میرے لیے یہ کٹھن امتحانِ زندگی تھا اور "دوست" کی یہی مرضی تھی کہ میں اس امتحان سے گزروں۔ انسان کتنا مجبور و لاچار اور حکمت و مصلحتِ الٰہی سے ناآشنا ہے!

اور میں دامنِ "دوست" پکڑے رہا

میں اس جذب و شوق کا ایک ایسا واقعہ سُنانا چاہتا ہوں، جس نے میری زندگی کو حُسن و سُرور سے معمور و منوّر کر دیا۔ یہ ۱۹۷۴ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ رازِ محبت افشا کرنے سے ڈرتا بھی ہوں اور اس کی رضا کے ہاتھوں مجبور بھی ہوں۔ میں نے ان دنوں روزنامہ امروز میں "قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی" کے نام سے مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ لکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ میری بے قراری

اور شوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے آخر وہ کام کرنا تھا جس کے کرنے کا مجھے بتّیس برس پہلے حکم ملا تھا۔ ربیع الاوّل کا ماہِ مبارک شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۴ء کا مشاہدہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ گزشتہ رات ہی ہوا ہے۔ جمعرات کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا۔ میں عصر کی نماز پڑھ کر لکھنے میں مصروف تھا کہ میرے جذب و شوق نے جنوں کی صورت اختیار کر لی۔ میں اضطراری طور پر اٹھا اور مصلّے پر سجدہ ریز ہو گیا۔ کمرے کا دروازہ بند اور میں تنہا تھا۔ سجدے میں گرتے ہی حضوری کی سعادت نصیب ہو گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں عرش کے نیچے اپنے اللہ کے حضور سر بسجدہ ہوں اور دامنِ یزداں میرے ہاتھ میں ہے۔ جلال و جبروتِ الٰہی سے مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا، آنکھیں اشکبار ہو گئیں، روح تڑپنے اور فریاد کرنے لگی۔ ایک بندۂ ناچیز اور فقیرِ بے نوا اپنے آقا و مولیٰ کے حضور سر بسجود الحاح و زاری کر رہا تھا۔ میں پہلے رویا اور خوب رویا اور بہت دیر تک رویا، پھر فریاد کی :

"اے میرے اِلٰہ و ربّ! تُو دلوں کا حال جانتا ہے۔ تو میری بے قراری اور ذوق و شوق سے آشنا ہے۔ تو دیکھ رہا ہے کہ پیرانہ سالی کی وجہ سے میرے اعصاب و اعضا مضمحل و کمزور ہو رہے ہیں۔ میری عمر کتنی باقی ہے، یہ صرف تُو ہی جانتا ہے۔ اب کرم فرما، مجھے روضۂ اطہر لے چل کہ وہاں جا کر میں تفسیرِ کبیر یا سیرۃ النبیؐ کی شروعات کر سکوں۔ مجھے اب اپنے اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرما کہ تو میرا اِلٰہ اور ربّ رحیم و کریم ہے۔"

میں سجدے میں پڑا آہ و زاری کرتا رہا، یہاں تک کہ آواز آئی: "مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" سنتا میری زبان سے نکلا: "اس سے بہتر اور کیا نماز ہو گی کہ میں اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور سر بسجود رہوں اور مجھے قرب و حضوری اور دید کی سعادت حاصل ہے۔"
میں فریاد کرتا رہا اور جذب و جنون کے عالم میں میری زبان سے یہ بھی نکلا کہ جب تک تُو مجھ سے وعدہ نہیں کرے گا، میں نہ تو تیرا دامن چھوڑوں گا اور نہ سجدے سے سر اُٹھاؤں گا۔ عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء کا وقت ہو گیا تھا، مگر میں احساسِ زمان و مکان سے ناآشنا

ایک عالم بے خودی میں "دوست" کے پاؤں پڑا ہوا تھا۔ دفعتاً کھڑکی کھٹکھٹانے کی تیز آواز آئی۔ میں نے بے اختیار سر اُٹھایا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ کھڑکی کھٹکھٹانے کی آواز بھی نہ تھی۔ بنگلے کے احاطے، چمن اور باہر سڑک پر مکمل سکوت تھا۔ کسی متنفس کا کوئی نشان تک نہ تھا۔ رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور باہر بجلیاں روشن تھیں۔ میں پھر سجدے میں گرا، لیکن بات ختم ہو چکی تھی۔ بے ساختہ میری زبان سے پنجابی کا یہ مصرع نکلا" پلڑا چھڑا کے نٹھ گیا ماہی" (دوست دامن چھڑا کر بھاگ گیا)۔

میں بادل ناخواستہ اُٹھا۔ نماز پڑھی اور لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسی عالم میں مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ چونکہ میں ۱۹۵۰ء سے اب تک رات کو کھانا نہیں کھاتا، اس لیے کسی نے مجھے بیدار کرنے کی کوشش نہ کی۔ مجھے خواب میں ایک مشاہدہ ہوا، اور کتنا رُوح پرور اور حسین و انقلاب انگیز تھا یہ تجربہ و مشاہدہ! میں اور ایسا مشاہدہ! یہ خدا ساز بات تھی۔ یہ اس کی رحمتِ بے حساب تھی کہ اس نے اپنے فقیرِ بے نوا کو اس طرح نوازا کہ دولتِ دل دے کر اُسے بادشاہ بنا دیا۔ میرا دل حُسن و سرور سے معمور و منوّر ہو گیا۔ میں نے وہ کچھ دیکھا جو معرضِ اظہار میں نہیں آ سکتا۔ پھر جذب و شوق اور ایسے مشاہدات و واردات کے رموز و اسرار کو بہت کم لوگ ہی سمجھتے ہیں۔ فقط اہلِ نظر اور صاحبِ حُسن و سرور ہی یہ راز جانتے ہیں۔

حرم شریف، یا جلوہ گاہِ "دوست" میں

یہ سہ پہر، شام اور رات کتنی مبارک اور عید بداماں تھیں۔ قرب و حضوری اور دید کی جو سعادت و لذّت نصیب ہوئی، پھر اس کے لیے دل ترستا ہی رہا، بہر کیف، رات گزرنے اور صبح آنے والی تھی کہ مجھے پھر ایک مشاہدے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں حرم شریف میں خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ اہلِ جذب و شوق کے ہجوم کا یہ عالم ہے کہ سجدہ کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ میں نے بہر حال نماز پڑھی، "دوست" کے گھر کی زیارت کی اور دُعا کی: "اے اللہ! اب مجھے روضۂ اطہر لے چل" دُعا

مستجاب ہوئی اور میں دوسرے ہی لمحے روضۂ اطہر کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ محبت و عقیدت رنگِ جذب و شوق سے مزیّن ہوگئی۔ میں نے اپنے اِلٰہ سے استدعا کی: "میرے اِلٰہ! میں فقط روضۂ مبارک ہی کو نہیں، روضے والے کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی تین بار زیارت کر چکا ہوں۔ اب مجھ سے پردہ کیا؟ میں تو شاہد ہوں، مجھ سے حجاب کیا؟ میں تو آپؐ کی زیارت کرنے آیا ہوں، مجھے اس سے محروم نہ رکھ!"

روضۂ اطہر یا آپؐ کی بزمِ خاص ہیں

یہ دعا بھی مستجاب ہوگئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ روضۂ مبارک روضۂ جنّت میں بدل گیا ہے۔ اس کے دونوں طرف اصحابِ حُسن و سُرور دیواروں کے ساتھ بڑے مؤدب انداز میں سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ان کے اوپر سفید چادریں ہیں۔ سامنے کی دیوار کے درمیان حُسنِ مجسّم آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم تشریف فرما ہیں۔ بڑا ہی رُوح پرور، حسین اور سُرور انگیز منظر تھا۔ روشنی ان برگزیدہ ہستیوں کی اپنی تھی۔ کیسی پیاری، دلکش اور کیف پرور وہ روشنی تھی! روشنی کیا تھی، حُسن و نُور کا مقدّس و سُرور انگیز سحر تھا۔ میں بڑی ہی حیرت و مسرّت سے یہ بے نظیر و مسحور کُن منظر دیکھ رہا تھا کہ آنکھ کُھل گئی۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ مجھ پر میرے اِلٰہ کی خاص بخشش اور نظرِ کرم تھی۔ اس نے اپنے فقیر کو دولتِ دل سے معمور کر دیا تھا۔

میں صبح کی نماز پڑھ کر حسبِ معمول اپنے گھر کے قریب سیرگاہ میں چلا گیا۔ ابھی وہاں کوئی شخص سیر کے لیے نہ آیا تھا۔ دوشیزۂ سحر کا حُسن بڑا ہی رُوح پرور تھا۔ اشجار کا منظر نظر افروز اور طیور کے نغمے طرب انگیز تھے۔ میں سبزہ زار کی روشوں میں تن تنہا سیر کر رہا تھا کہ رات جو خواب دیکھا تھا اس کے مناظر چشمِ تصوّر کے سامنے رقص کرنے لگے۔ دفعتاً کسی نے میرے دل میں کہا: "ناصر! تمھاری مَنّت اور آرزو پوری ہوئی۔ تم نے تو روضۂ اطہر پر جانے اور اس کے دیدار کی منّت مانی تھی، ہم نے تمھیں حرمین شریفین کی سیر کرائی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمھیں اپنے حبیبؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ کی زیارت سے مشرّف کیا۔

تمہاری منت پوری ہوئی۔ اب تم "تفسیرِ کبیر" لکھنی شروع کر دو، ورنہ تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے"۔

تفسیرِ کبیر یا سیرۃ النبیؐ لکھنے کا آغاز

یہ میرے اللہ کا ارشاد تھا۔ خشیت و مسرت سے میرا دل معمور ہو گیا۔ میں فوراً گھر پہنچا اور نہا دھو کر لکھنے کی تیاری کرنے لگا۔ سب سے پہلے نئے قلم نکالے اور انھیں دھویا اور نئی روشنائی بھری۔ پھر نئے کاغذ نکالے، انھیں عطر میں بسایا۔ قلمدان میں عطر چھڑکا اور عطر کی شیشیاں رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے نام پہ صدقہ کیا اور خیرات بانٹی، لباس تبدیل کیا اور اسے بھی خوشبو سے معطر کیا کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو خوشبو بہت پسند تھی۔ طہارت و نظافت کے تمام سامان مکمل کرنے کے بعد میں باوضو ہو کر لکھنے کی جگہ بیٹھا، جسے نئی چادر سے مزیّن کر دیا تھا۔ حمد و ثنا کے بعد درود شریف پڑھا۔ قلم اُٹھایا اور لکھنے کا ارادہ کیا۔ کتاب کا عنوان کیا ہونا چاہیے؟ میں سوچنے لگا کہ دل میں کسی نے کہا: "لکھو! پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم"۔ میں نے ندائے غیبی کی تعمیل کی۔ یوں سیرۃ النبیؐ کا آغاز ہوا۔

اب میں صحیح معنوں میں رہ نوردِ شوق تھا۔ مجھے اس بات کا حق الیقین تھا کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ ہی قرآنِ حکیم کی صحیح، سچی اور جامع و مانع تفسیر ہے، جسے "تفسیرِ کبیر" سے تعبیر کیا گیا تھا۔ میں اسی نقطۂ نظر سے قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتا چلا آیا تھا۔ میرا دوسرا ماخذ احادیثِ طیبہ اور تیسرا تاریخ تھا۔ میرا ایک بڑا ہی موثر ماخذ دُعا تھا۔ میرا ایمان تھا اور ہے کہ اللہ تعالیٰ مجیب الدعوات ہے۔ میں متواتر دُعائیں مانگتا رہا کہ میرے قلم سے جو نکلے، سچ نکلے۔ میں مشاہدات کی آرزو کرتا رہا اور مجھے ان کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔

قُربتِ دوست کا احساس

وہ ذاتِ کبریا جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور جس کے سامنے ایک دن سب کو جواب دہ ہونا ہے، شاہد ہے کہ جب میں سیرۃ طیبہ لکھتا ہوتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرے دائیں طرف کوئی ہستی موجود ہے، جس کے نفسِ کبریائی سے میرا دل علم و حکمت اور حُسن سرور سے

منور ہو جاتا۔ میری آتشِ شوق تیز تر اور روشن تر ہو جاتی۔ علاوہ بریں، میں قلم اٹھاتا تو فوراً مجھے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حضوری نصیب ہو جاتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے مجھے آپؐ کی رفاقت کی سعادت میسر آگئی ہے۔ مہد سے لحد تک میں آپؐ کی خدمتِ اقدس میں رہا۔ آپؐ نے تحریکِ اسلام چلائی اور اسے تیرہ ۱۳ برس کے اندر کامیابی سے ہمکنار کیا، تبلیغ اور وعظ و نصیحت کی، دشمنوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اٹھائیں، جنگیں کیں، معاہدے کیے، معاشرے کی تشکیلِ نو کی اور اسلامی حکومت یا خلافت کی بنیاد رکھی، سفر کیے، احباب کی محفلوں میں شرکت کی۔ آپؐ نے بھرپور زندگی گزاری اور میں ہر جگہ آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہا، اور میری مزرعِ حیات آپ کے حسن و عشق، رحمتِ عالمگیر اور علم و حکمت کے چشمے سے سیراب ہوتی رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قرب و حضوری کی یہ سعادت و لذت اس وقت تک رہی، جب تک آپؐ کی سیرتِ طیبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ گئی۔ میں دن رات مطالعہ، غور و فکر اور خامہ فرسائی میں مشغول رہتا تھا۔ مجھے دل کا عارضہ تھا، لیکن مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ معالج، اعزہ و اقارب، اور بیوی بچے سب آرام کرنے کا مشورہ دیتے، دل کی حرکت بند ہو جانے اور موت سے ڈراتے۔ میری بیگم خوشامدیں اور منتیں کرتی، لڑائی جھگڑا بھی کرتی۔ اس نے ہر حربہ آزمایا اور مجھے تفسیرِ کبیر یا سیرۃ النبیؐ لکھنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ میرے معالج نے اسے میرے بارے میں سخت تشویش کر رکھا تھا۔ کبھی کبھی میں ان کی بات ماننے کا ارادہ بھی کرتا، لیکن جب لکھنے کا وقت آتا تو میری حالت ایسے نشئی باز کی طرح ہو جاتی، جس کا نشہ ٹوٹ چکا ہو اور اسے نشے کی طلب و حاجت سخت بے قرار کر رہی ہو۔ میرا شوق تیز تر ہو جاتا، ہمت جوان ہو جاتی اور روح لذتِ قرب و حضوری کے لیے بے قرار ہو جاتی۔ میں بے اختیار قلم پکڑتا اور

لکھنے میں محو ہو جاتا۔ میرے پہلو میں کوئی آ کر بیٹھ جاتا، کوئی میرے دل میں سرگوشیاں کرتا اور میں وادیِ مقدّس میں حضورِ پُر نور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے قرب و وصال کے مزے لُوٹتا۔ کیا روح پرور، جانفزا، ایمان افروز اور سرور انگیز ایّام تھے۔ ان ایّام میں متعدد بار بڑے عجیب و غریب واقعات رُونما ہوتے، بڑے ہی بصیرت افروز مکاشفات و مشاہدات ہوتے اور عجیب و غریب وارداتیں ہوئیں۔ محبّت کی یہ باتیں پردۂ خفا ہی میں رہیں تو بہتر ہے۔

عالمی سیرت کانفرنس

مارچ ۱۹۷۶ء میں وزارت اُمورِ مذہبی پاکستان اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن (پاکستان) کے تعاون سے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں سیرت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں دُنیا بھر سے علما اور مستشرقین تشریف لائے۔ مجھے بھی اس کانفرنس میں سیرۃ النّبیؐ پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے آپؐ کے فلسفہ اخلاق پر ایک مبسوط مقالہ لکھا۔ سیرت کانفرنس کا آخری اجلاس کراچی میں ہوا، جس کے اختتام پر رابطۂ عالمِ اسلامی کی طرف سے سیرۃ النّبیؐ پر عالمی مقابلے کا اعلان ہوا۔ اوّل آنے والی پانچ تصانیف کو انعام دینے کا وعدہ کیا گیا۔ غالباً ۱۹۷۶ء تک تصانیف کو رابطۂ عالمِ اسلامی (مکّہ مکرّمہ) کے دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ مجھے بھی اس عالمی مقابلے میں حصّہ لینا چاہیے۔ میرے دل نے بھی تائید کی اور میں نے ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لوح و قلم سے رشتہ ٹُوٹ گیا

کتاب ساتھ ساتھ ٹائپ ہو رہی تھی اور اختتام کے قریب پہنچ چکی تھی کہ اچانک اگست ۱۹۷۶ء میں مجھے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کا وائس چانسلر مقرّر کیا گیا۔ یہ پہلا انعام تھا جو مجھے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ لکھنے کے صلے میں ملا۔ یہ در اصل میرے جذب و شوق کا امتحان تھا۔ دفتری ذمّے داریوں اور فرائضِ منصبی کی نوعیّت کچھ اس قسم کی تھی کہ قلم سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ پھر جذب و شوق میں کمی واقع ہونے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قُرب و حضوری کی

سعادتوں کا فقدان ہو گیا۔ دل اس محرومی و نامرادی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور بیمار رہنے لگا۔ پھر ایک دن ایسا گھائل ہو کر تڑپا، بے قرار ہوا اور چلایا کہ میں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا۔ ڈاکٹر صاحبان نے کہا کہ عارضۂ دل کا شدید حملہ ہے اور جانبری کی امید کم ہے۔ مجھے آکسیجن لگا دی گئی اور نیم بے ہوش کر دیا گیا۔ مجھے اُمید تھی کہ موت ابھی نہیں آئے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مجھے دوبارہ زندگی عطا کر چکے تھے، نیز ابھی مجھے تفسیرِ کبیر پایۂ تکمیل تک پہنچانی تھی۔

کتابِ پیغمبرِ اعظم و آخرؐ عالمی مقابلے میں

میں اب بھی قرآنِ مجید پڑھتا تھا۔ لیکن میری عبادت میری نماز بے ذوق و بے ثمر رہی تھی۔ میری زندگی طمانیت و سُرور سے محروم ہو چکی تھی۔ میرے اِلٰہ نے "بولنا" بند کر دیا تھا، اور مشاہدات و واردات کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ گلزارِ حیات میں ایسی خزاں آئی کہ وہ ویران ہو گیا۔ جسم میں اضمحلال اور دل میں انقباض رہنے لگا۔ امتحان پہلے صبر آزما تھا اور اب شکیب رُبا ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا اِلٰہ اور میرا قلم دونوں مجھ سے جُدا ہو گئے تھے۔ جذب و شوق کی آگ سرد ہو چکی تھی۔ راز و نیاز کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ ہجر و فراق کی اذیّتیں ناقابلِ برداشت ہو چلی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے "دوست" نے میرے دل میں رہنا چھوڑ دیا ہے، لہٰذا دل اس جدائی کے صدمے سے نحیف و نزار ہوتا چلا گیا۔ میرے معالج نے دیکھا تو کہا: "آپ کو زندگی اور ملازمت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ ملازمت سے مستعفی ہو جائیں۔" یہ فیصلہ میرے مسیحا کا تھا، لیکن اہلِ خانہ کو یہ قابلِ قبول نہ تھا۔ لگی لگائی روزی اور اتنی معزّز ملازمت کو چھوڑنا اور اتنی بڑی سہولتوں اور آسائشوں سے از خود محروم ہو جانے کی کسی میں ہمّت تھی، نہ حوصلہ۔ میں ڈھائی برس تک موت و حیات کی کشمکش میں اور ہجر و فراق کی اذیّتوں میں مبتلا رہا۔ میرے ساتھ "نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن" والا معاملہ تھا۔ میری آرزو اور دُعا یہ تھی کہ قُرب، حضور اور دید و وصال

کے ایام پھر لوٹ آئیں، قلم سے رابطہ پھر قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک یہی بیماریِ دل کا علاج تھا۔ میں دُعا کرتا رہا۔ آخر کار میری دُعا قبول ہو گئی۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ مبارک باد کے فون آنے لگے کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اعلان ہوا ہے کہ میری تصنیف "پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم" عالمی مقابلے میں، جو پانچ بہترین کتابیں منتخب ہوئی ہیں، ان میں سے ایک ہے۔ مجھے نوّے ہزار روپے کا انعام ملا ہے۔ اس انعام کے علاوہ رابطۂ عالمِ اسلامی نے حرمین شریفین کی زیارت کا اہتمام بھی کیا ہے۔ دل میں کسی نے چپکے سے کہا کہ اب وائس چانسلری سے بھی نجات مل جائے گی، اور اپنے اِلٰہ و قلم سے رشتہ بھی استوار ہو جائے گا۔ میرے لیے تو یہ مژدۂ جانفزا تھا، لیکن میرے گھر والوں کے لیے یہ صبر آزما حادثہ ثابت ہوتا تھا۔ بہرحال یہ میرے اِلٰہ کا فیصلہ تھا، اور بڑا ہی مبارک فیصلہ تھا۔

اِنعام و سبکدوشی

میری بیوی کو بھی میری طرح عُمرہ کرنے اور روضۂ اطہر پر حاضری دینے کا بے حد شوق تھا۔ اس نے میرے ہمراہ چلنے کا فیصلہ کیا اور تیاری شروع کر دی۔ خُدا جانے کیوں ہر روز مجھے ترکِ ملازمت کی خبر سُننے کا انتظار رہتا تھا۔ آخرِ کار وہ دن آ ہی گیا اور مجھے وائس چانسلری کے عہدے سے قبل از وقت سبکدوش کر دیا گیا۔ یہ حادثہ اگرچہ صبر آزما تھا، لیکن سب نے رضائے الٰہی سمجھ کر بڑی جرأت و ہمّت سے برداشت کر لیا۔

بہاولپور سے ہم لاہور منتقل ہو گئے۔ دل میں اب حرمین شریفین دیکھنے کی آرزو تھی۔ آخرِ کار وہاں جانے کا ٹکٹ اور ویزا آ گیا۔ تقسیمِ انعامات کی تقریب ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ کو منعقد ہونی تھی۔

کڑی : ۲

سوئے حرم شریف

سفر کا آغاز اور طریقہ

۸ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ کو ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ گھر سے نکلتے وقت ہمارے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ سوز و ساز سے معمور تھا۔ چشمِ تصور میں "دوست" کا خانۂ حسن و نور اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا حسن المآب یا روضۂ اطہر تھا۔ اشتیاقِ دید اور فرطِ مسرت سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ہم عالمِ جذب و شوق میں گھر سے نکلے تو ہمارے لبوں پر یہ دعائیں تھیں :

بِسْمِ اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (مشکوٰۃ)

اللہ کے نام سے، میں نے اللہ پر توکل کیا۔ نیکی کرنے کی طاقت اور بدی سے بچنے کی قوت محض اللہ کی توفیق سے ہے۔

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ (مشکوٰۃ)

یا اللہ تو رفیقِ سفر بھی ہے اور بعد میں گھر کی خبر گیری کرنے والا بھی ہے۔

کراچی کے لیے ہمارے جہاز کی پرواز کا وقت رات کے آٹھ بج کر پچاس منٹ تھا۔ ہم آٹھ بجے کے قریب ہوائی مستقر پہنچے۔ احباب و اقارب نے ہمارا استقبال کیا، اور پرنم آنکھوں اور نیک جذبات کا اظہار کیا۔ پھر حرمین شریفین کا ذکر ہوتا رہا اور ان میں دعائیں مانگنے کی فرمائشیں ہوتی رہیں۔ جہاز پر سوار ہونے کا اعلان ہوا تو تقدس مآب ماحول رقت انگیز ہو گیا۔ سب نے پرنم آنکھوں کے ساتھ ہمیں رخصت کیا، اور ہم نے ان الفاظ کے ساتھ انہیں وداع کیا۔

استودعکم اللہ لا یضیع ودائعہ (مشکوٰۃ)

میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ اپنی امانت ضائع نہیں کرتا۔
جہاز پر سوار ہوتے وقت ہماری زبانوں پر یہ دُعائیں تھیں :
اَللّٰھُمَّ ھَوِّنْ عَلَیْنَا سَفَرَنَا ھٰذَا وَاطْوِ لَنَا بُعْدَہٗ (مشکوٰۃ)

اے اللہ، ہمارا یہ سفر ہمارے لیے آسان کر دے اور اس کی دُوری (بُعدِ مکانی) کم دے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (مشکوٰۃ)

وہ تمام نقائص سے منزّہ و پاک ذات ہے، جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا، ورنہ اس پر قابو پا لینے کی ہم میں طاقت نہ تھی، اور ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

سفر آرام دہ تھا۔ جہاز کے عملے نے اپنے حُسنِ خُلق سے ہمیں بہت متاثر کیا، کافی، چائے، بسکٹ، کیک وغیرہ سے تواضع کی۔ جہاز اُڑتا اور سفر کٹتا رہا اور ہم یہ دُعا پڑھتے رہے :

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

کوئی الٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود نہیں۔ بجز اللہ تعالیٰ کے۔ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اُسی کے لیے ہے بادشاہی، اور اسی کے لیے ہے سب حمد و ثنا۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جہاز مقررہ وقت پر کراچی پہنچا۔ چونکہ ہماری منزلِ مقصود جدّہ تھی اور ہمارا جہاز دُوسرے دن سہ پہر ساڑھے پانچ بجے روانہ ہونا تھا، اس لیے پی آئی اے نے ہمارے عارضی قیام کا بندوبست ہوٹل پیلس میں کیا تھا۔ نصف شب سے ذرا پہلے ہم وہاں پہنچے اور نماز پڑھتے ہی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ صُبح کی اذان ہو رہی تھی کہ معمول کے مطابق ہماری آنکھ کھل گئی۔ نمازِ فجر اور تلاوتِ قرآنِ مجید سے فارغ ہو کر ہم نے ناشتا کیا اور عزیزوں سے ملنے چلے گئے۔ ہم نے بیشتر وقت اپنی بھائی صاحبہ اور ان کے بچّوں کے ساتھ گزارا۔ بیتے دنوں

کا ذکر چھڑا تو مرحوم والدین اور عزیز و اقارب کی یاد آئی، دِل بھر آیا اور ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

دُنیا کی زندگی واقعی ایک کھیل تماشا ہے، جو مسلسل ہو رہا ہے۔ حال کا ہر لمحہ چشم زدن میں ماضی بن جاتا ہے۔ ماضی افسانہ اور مستقبل امکان ہے۔ دیکھتے دیکھتے بچپن لڑکپن میں، لڑکپن جوانی اور جوانی پیری میں بدل جاتی ہے۔ اعصاب و قویٰ اور اعضا و جوارح مضمحل و کمزور ہو جاتے ہیں۔ نشاطِ تغافل میں مست انسان کو موت ایک دن دفعتاً اس دُنیا سے "الحیوان" یا دار الآخرت میں پہنچا دیتی ہے، اور خود ہمیشہ کے لیے معدوم و فنا ہو جاتی ہے۔ "الحیوان" ایک ایسا عالمِ بقا ہے، جہاں زندگی ہے موت نہیں۔ وہاں زندگی عُمرِ گزراں نہیں، آنی اور فانی بھی نہیں، ابدی و سرمدی ہے۔ وہ جو دانائے راز ہیں، دُنیا کی آنی اور فانی زندگی کے لیے نہ دوزخ خریدتے ہیں اور نہ جنّت ہی بیچتے ہیں۔ وہ تو "دوست" کی رضا و دید اور قُرب و حضُور کی طلب و جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ "دوست" ہی صرف اُن کا اِلٰہ ہوتا ہے۔ اُن کی نیّت و ارادہ، فکر و نظر اور قول و فعل سب حسین ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اور دوسروں کے لیے رحمت ہوتے ہیں۔ اُن کی زندگی حُسن و صدق اور عشقِ اِلٰہی سے معمور و منوّر ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ اہلِ جذب و شوق اور اصحابِ حُسن و سرُور ہوتے ہیں۔

ظہر کے وقت ہم ہوٹل لوٹ آئے۔ کھانا کھایا، نماز پڑھی اور یہ دُعائے مسنونہ پڑھی اور آرام کرنے لگے:

اَعُوْذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (مشکوٰۃ)

میں اللہ کے کُل کلمات کے ساتھ اس کی مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

جب ہم کسی اُونچی جگہ چڑھتے تو اَللّٰهُ اَكْبَرُ اور نیچے اُترا اُترتے تو سُبْحَانَ اللّٰهِ کا ورد کرتے تھے۔ صبح و شام یہ دُعا مانگتے تھے:

اَللّٰھُمَّ بِکَ اَصْبَحْنَا وَبِکَ اَمْسَیْنَا وَبِکَ نَحْیٰی وَبِکَ نَمُوْتُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ (مشکوٰۃ)

یا اللہ، ہم نے تیری توفیق سے صبح کی اور شام کی۔ ہمارا جینا اور مرنا تیرے حکم سے ہے اور تیری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔

چار بجے کے قریب ہم پی آئی اے کی گاڑی سے ہوائی مستقر پہنچے۔ کچھ احباب و اقارب یہاں الوداع کہنے آئے ہوئے تھے۔ وقت اُن سے ملنے ملانے اور باتیں کرنے میں گزر گیا۔ جہاز میں سوار ہونے کا وقت آیا تو ہم نے مسنون طریقے سے الوداع کہا اور دعائے مسنونہ پڑھتے جہاز میں سوار ہو گئے۔ وقت مقررہ پر جہاز حرکت میں آیا اور بڑی سُرعت سے رن وے پر دوڑتے دوڑتے فضا میں پرواز کرنے لگا۔ یہ خیال کہ ہم "دوست" کے گھر جا رہے ہیں اور اس کے مہمان بننے والے ہیں، بڑا ہی سرور انگیز و وجد آفرین تھا۔ روضۂ اطہر اور اس کا اندرونی فردوسی منظر، جس کا میں مشاہدہ کر چکا تھا، چشمِ تصور کے سامنے آتا تو ایک عجیب و غریب اور سرور انگیز ٹھنڈک سے روح پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اِدھر زمان و مکان کے فاصلے کم ہوتے جاتے اور اُدھر اشتیاقِ دید بڑھتا جاتا اور انتظار کے لمحات طویل ہوتے جاتے۔ جذب و شوق کا عجیب عالم تھا۔ جوں جوں منزل قریب آتی جاتی، وقت کی رفتار کم سے کم تر محسوس ہوتی اور ہر آن، ساعتِ جاودانی معلوم ہوتی۔ اس عالمِ شوق و انتظار اور کیفیتِ کیف و مستی میں آواز آئی کہ میقات آ گیا۔ ناظرین احرام باندھ لیں۔

میقات و احرام

میقات سے مُراد احرام باندھنے اور عمرے یا حج یا دونوں کی نیت کرنے کا مقام ہے۔ یہ حُسنِ نیت و ارادہ کے ساتھ مخصوص لباسِ تضرع و فریاد پہن کر یا بالفاظِ دیگر کفن بر دوش ہو کر اللہ تعالیٰ کے مقدس و حُسن بداماں گھر میں داخل ہونے کی صُوری و معنوی تیاری کی منزل سے عبارت ہے۔ مختلف سمتوں

سے آنے والے حاجیوں کے لیے مختلف راستوں میں میقات ہیں۔

احرام کی نیّت احرام حج اور عُمرہ کی یونیفارم ہے، جسے پہن کر ہی حُجّاج و زائرین، چاہے وہ شاہ ہوں یا گدا، امیر ہوں یا غریب، عربی ہوں یا عجمی، اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری دے سکتے ہیں۔ احرام دراصل علامت ہے عبدیّت و عبودیّت، الحاح و تضرّع، دُعا و فریاد، عجز و انکسار، فقر و تقویٰ اور عالمگیر اخوت و مساوات کی۔ ہیں یہ اعلان سُنتے ہی احرام باندھنے کے لیے اُٹھا۔ دو اَن سِلے تولیے لیے۔ ایک نیچے باندھ لیا اور دوسرا اُوپر اوڑھ لیا، لیکن سر ننگا رکھا۔ بیگم نے سر پہ اس طرح سفید رومال باندھ لیا کہ سر پورا ڈھک گیا اور ایک بال بھی دکھائی نہ دیا۔ اس کے بعد ہم نے عُمرے کی نیّت کی، جس کے الفاظ یہ تھے :

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ عُمْرَۃً : اے اللہ میں عُمرے کے لیے حاضر ہوں

حج کی نیّت اس طرح کی جاتی ہے :

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ حَجَّۃً : اے اللہ! میں حج کے لیے حاضر ہوں

اگر بیک وقت حج اور عُمرے کی نیّت ہو تو یہ کہنا چاہیے :

اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ حَجَّۃً وَعُمْرَۃً :

اے اللہ! میں حج اور عُمرے کے لیے حاضر ہوں۔

تلبیہ احرام باندھتے اور نیّت کرتے ہی ہم نے تلبیہ کا ورد شروع کر دیا، جس کا مطلب لَبَّیْکَ کہنا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکُ لَاشَرِیْکَ لَکَ :

میں حاضر ہوں۔ یا اللہ! میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بیشک سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں، اور سب نعمتیں تیری ہی عطا کی ہوئی ہیں۔ بادشاہت تیری ہی ہے۔

تیرا کوئی شریک نہیں۔

تلبیہ کہتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں فی الواقعہ اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور اس کے بندہ و پرستار اور فریادی و فقیر کی حیثیت سے حاضر ہوں، اور وہ حاضر و موجود ہے اور میری فریاد سُن رہا ہے۔ وہ واقعی یکتا و یگانہ ہے اور اُس کی الوہیت و ربوبیت میں کوئی شریک نہیں۔ مخلوق خالق کی شریک نہیں ہو سکتی۔ کُل حمد و ثنا فقط اسی کے لیے ہے، اور یہ سب نعمتیں صرف اُسی کی دی ہوئی ہیں، اور وہی ان کا مالک بھی ہے۔ وہ بادشاہ ہے اور بادشاہت صرف اُسی کی ہے، اور کسی معاملے میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ پھر کسی نے دل میں کہا: وہ سب لوگ جھوٹے اور منافق ہیں جو مشرکانہ عقائد رکھنے یا جلب منفعت اور عزت و شہرت کی خاطر سادہ لوح لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اولیاء اللہ یا ان کے بزرگ کاروبارِ خدائی میں شریک ہیں۔ وہ عالمِ بالا میں لوگوں کی فریادیں سُنتے، دادرسی کرتے اور ان کی امداد و حاجت روائی کرتے ہیں۔ نیز اپنے آپ کو اُن کے خلیفہ یا کارندے بتاتے ہیں۔ وہ لوگ بھی منافق و کاذب ہیں جو نفسِ مسیحائی کا دعویٰ کرتے ہیں، اور وہ لوگ بھی گمراہ و مشرک ہیں جو ان کی باتیں سچ اور انھیں اپنا پیر و مرشد مانتے ہیں۔

قدرے توقف کے بعد پھر غیب سے ندا آئی: دینِ توحید اور اس کی ضدِ شرک ہے، اور شرک ظلم اور ناقابلِ معافی گناہ ہے۔ اس کی سزا جہنّم کی آگ ہے، جہاں مشرک نہ زندہ ہوگا نہ مُردہ۔ وہ سدا اسکراتِ موت کی اذیتوں میں مبتلا رہے گا۔ تم اللہ جلّ شانہٗ کے گھر چلے ہو تو دل کو شرک کی ہر آلودگی سے پاک و صاف کر لو اور مُوحّد بن کر حاضری دو۔ مُشرک کی حاضری اور عبادت قبول نہیں ہوتی، بلکہ وہ اُلٹا مقہور و مغضوب بن کر لوٹتا ہے۔ "دوست" کے پاس چلے ہو تو دل کو حُسن و محبّت اور اخلاص و تقویٰ سے معمور و منوّر کر کے چلو۔ وہ ایسے ہی دل میں طمانیت و سُرور کی جنّت بساتا اور اس میں رہتا ہے۔ یہ دین

کا سرّ الاسرار اور زندگی کی غایتِ حقیقی ہے۔

جدّے میں

ہیں اسی عالمِ جذب و مستی میں تھا کہ جہاز کی اناؤنسر نے یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ انشاء اللہ جہاز تھوڑی ہی دیر میں جدّہ ائیرپورٹ پر اُترنے والا ہے، مسافر حفاظتی پیٹیاں باندھ لیں اور سگریٹ بُجھا دیں۔ اس نویدِ طرب انگیز سے دل فرطِ مسرت و اشتیاق سے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اتنے میں روشنیوں کا شہر جدّہ دکھائی دینے لگا۔ ہم اس کے حسین مناظر کو دیدۂ شوق سے دیکھنے میں محو تھے کہ جہاز فضا سے زمین پر اُتر چکا تھا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہوں گے۔ جدّے کا وسیع و عریض ہوائی مستقر بُقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہم اُترنے لگے تو ہماری زبان پر یہ دُعا تھی:

رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (المؤمنون)

اے میرے ربّ! مجھے اُتار برکت کا اُتارنا اور تُو ہے بہتر اُتارنے والا۔

ابھی میں نے زینے سے نیچے فرش پر قدم رکھا ہی تھا کہ آواز آئی "کیا آپ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو رابطۂ عالمِ اسلامی کے نمائندوں نے اھلاً و سھلاً کہہ کر بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے ہمارے پاسپورٹ اور سامان اپنی تحویل میں لے لیے اور چند ہی منٹوں میں انھیں کسٹم وغیرہ سے چیک کرا کر ہمیں باہر لے آئے، جہاں ہمیں مکّہ مکرمہ جانے کے لیے گاڑی تیار کھڑی تھی۔ وہاں میرا ماموں زاد بھائی مدثّر محمود ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ہمیں رُخصت کرنے سے پہلے رابطۂ عالمِ اسلامی کے نمائندے نے پوچھا: "آپ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں ٹھہرنا پسند کریں گے یا فندق الحرم (ہوٹل الحرم) میں؟" میرے بھائی نے فوراً ہمیں مشورہ دیا کہ آپ فندق الحرم میں ٹھہریں کیونکہ وہ حرم شریف کے بالکل قریب ہے، جبکہ انٹرکانٹی نینٹل وہاں سے کوئی دس کلو میٹر دُور ہے۔ مشورہ از بس اہم، سود مند اور بر وقت تھا، ہم نے بلا تامّل قبول کر لیا۔ سب نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رُخصت کیا۔ گاڑی جدّے کی

کشادہ و منور سڑکوں سے گذرتی ہوئی ہمیں رابطۂ عالم اسلامی کے مقامی دفتر میں لے گئی، جہاں ہم نے وضو کیا، نوافل پڑھے اور مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہو گئے، جو ہماری منزلِ مقصود تھی۔

کڑی : ۳

مکّۂ مکرّمہ یا دیارِ "دوست"

جدّے سے مکّۂ مکرّمہ کی جانب

مکّہ مکرّمہ جدّے سے ۴۵ میل دُور ہے۔ کشادہ اور برقی قمقموں سے منوّر شاہراہ پر ہماری کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی، اور ہم ہمہ تن شوق و انتظار بنے بیٹھے تھے۔ زبان پر درود و سلام اور دعا و فریاد تھی تو دل میں آرزوئے دید۔ ہم سفر میں تھے اور سفر دیارِ حبیبِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا۔ اس مقدّس و جنّت آسا شہر کا ذرّہ ذرّہ آفتابِ نبوّت کی تجلّیوں کی بدولت لعل و گوہر سے زیادہ گراں بہا اور زہرہ و ثریّا سے زیادہ ارفع تھا۔ اس کی فضائیں میرے ہادی و مرشد، سرورِ کونین اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی حسین و جاں آفرین اور ایمان انگیز و بصیرت افروز آواز سے معمور ہیں۔ مجھے حُسنِ آواز کو گوشِ حسن نیوش سے سُننے اور آپ کے نقوشِ پا کو دیدۂ دل سے دیکھنے کی آرزو تھی، جو اس سرزمینِ مقدّس و مُطہر کے سینے کے اندر محفوظ ہیں۔ وقت گزر رہا اور سفر کم ہو رہا تھا، مگر شوق بڑھتا اور انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی جاتی تھیں۔ اس عالمِ انتظار و اشتیاق میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ بادۂ محبّت سے سرشار ہم عالمِ جذب و مستی میں دیدۂ انتظار و شوق سے شاہراہِ مکّہ اور اس کے اِرد گرد کے مناظر دیکھنے میں محو تھے کہ ڈرائیور نے آواز دی "حدِّ حرم شروع ہو گئی ہے!" دِل کے تار فرطِ عقیدت و مسرّت سے مرتعش ہو گئے اور ہم پُکار پُکار کر لَبَّیْکَ کہنے لگے۔ پھر ہم نے خشوع و خضوع سے یہ دُعا مانگی:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا حَرَمُکَ وَ اَمْنُکَ فَحَرِّمْ لَحْمِیْ وَ دَمِیْ وَبَشَرِیْ عَلَی النَّارِ :

یا اللہ! یہ تیرا حرم اور جائے امن ہے۔ پس میرا گوشت، خون اور جسم آگ پر حرام کر دے۔

آگ عذاب و اذیت اور ٹھنڈک ثواب و طمانیت ہے۔ آگ عذابِ تن و جاں ہے، جس میں مبتلا کرنا شیطان کا نصب العین ہے۔ اس کے برعکس آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل زندگانی اور اس کا حصول مشیتِ "دوست" اور دین کی غایتِ حقیقی ہے۔ ہم ربّ جلیل کا بیت الحُسن (حُسن کا گھر) دیکھنے اور اس کی بلائیں لینے جا رہے تھے تاکہ اس کی دید سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور اس کی بلائیں لینے یا طواف کرنے سے طمانیت انگیز سوز و ساز حاصل کریں۔

بیت اللہ حُسن و نُور اور امن و سلامتی کی جنّت ہے۔ یہاں اہلِ محبّت اس لیے آتے ہیں کہ حُسن و نُور اور طمانیت و سُرور حاصل کریں، کیونکہ یہی وہ دولتِ دل ہے جس کے عوض جنّت ملتی ہے۔ جنّت محض لذّت و حظ اور نشاط و طرب کا بے مثال عشرت کدہ ہی نہیں، بلکہ دیدِ "دوست" کا مقام بھی ہے، اور دیدِ "دوست" اصلِ حُسن و سُرور ہے۔ یہ ایسی بے نظیر نعمت ہے جس کا یہاں تصور کرنا بھی محال ہے۔ "دوست" کا ایک نظّارہ ہزار بار شہیدِ آرزو ہو جانے سے بھی ارزاں ہے۔ میرے دل میں بھی دولتِ دل حاصل کر کے وارثِ جنّت اور اہلِ دید بننے کی آرزو تھی۔ میرے دل میں سوزِ آرزو بھی تھا، اُمّید کی شمع فروزاں بھی تھی، اور ساتھ ہی وہ ربّ جلیل کی ہیبت و جلالت سے لرزاں و ترساں بھی تھا۔ سوزِ محبّت، شوقِ دید و حضوری اور احساسِ جلالت سے مجھ پر کیف و سرخوشی کی ایک عجیب کیفیّت طاری تھی۔ اس عالم میں دفعتاً برقِ حُسن و نُور لہرائی اور برقی قمقموں سے منوّر مکّہ مکرّمہ کا مُقدّس و مُطہّر شہر دکھائی دیا، جس میں امام الانبیاء، سیّد المرسلین اور رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے توحید کی شمع جلائی تھی، جسے شرک و بُت پرستی، جرم و گناہ

اور ظلم و شر کی تاریکیوں سے معمور دُنیا کو روشن کرتا تھا۔ یہ میرے عادل و محسن اور صادق و امین مُرشد و ہادی کا مولد تھا، جس میں آپؐ نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا باطل شکن و جاں آفرین نعرہ بلند کیا تھا، جس کی صدائے بازگشت سے آج بھی دُنیا گُونج رہی ہے۔ نیز یہاں ہی آپؐ نے اسلام کی عالم گیر و ہمہ گیر تحریک چلائی تھی، اور اس "جُرمِ رحمت" کی پاداش میں آپؐ اذیّت ناک و شکیب رُبا تجربوں سے گُزرے تھے اور کامیاب گزرے تھے۔
اس شہر میں ہمارے ربِّ جلیل کا گھر تھا، جس کی عظمت کی حریف جنّت الفردوس بھی نہیں ہو سکتی، جہاں جنّ و انس اور ملائکہ ہمہ وقت حمد و تمجید اور طواف میں مشغول رہتے ہیں، اور جہاں ہر وقت حُسن و نُور اور رحمت و طمانیت کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اس متبرّک شہر کا ہر نظّارہ دیدۂ شوق کے لیے فردوسِ نظر اور ہر منظر جنّتِ نگاہ تھا۔ ایسے میں یوں محسوس ہوا کہ بُوئے فردوسی سے مشامِ جاں معطّر ہو گئی ہے، اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی بے صوت صدا برقِ حُسن بن کر دل پر لہرا رہی ہے۔ دِل اس مقدّس سحر انگیز مشاہدہ و تجربے کا حریف کیسے ہوا، یہ تو فیضانِ "دوست" تھا، لیکن زبان پر یہ دُعا جاری تھی:

اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْھَا :

یا اللہ! ہمارے لیے اس شہر میں برکت عطا فرما۔

یہ دُعا تین بار پڑھی تھی کہ اتنے میں اس مقدّس و مکرّم شہر میں داخل ہو گئے اور ارشادِ نبویؐ کے مُطابق یہ دُعائیں پڑھنے لگے:

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِيْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ :

یا اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (مشکوٰۃ):

میں عظمت والے اللہ کی، اس کے عزّت والے خوشنما چہرے کی، نیز اس کی قدیم و ازلی حکومت و

سطوت کی شیطان مردود سے پناہ مانگتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا جَنَاهَا وَحَبِّبْنَا اِلٰی اَهْلِهَا وَحَبِّبْ صَالِحِیْ اَهْلِهَا اِلَیْنَا:

یا اللہ! ہمیں اس کے پھل کھلا، اور اس کے باشندوں کو ہماری محبت دے اور ہمیں یہاں کے صالح لوگوں کی محبت عطا کر۔

ہم دُعائیں مانگنے میں محو تھے کہ اچانک بیت الحرام کے مینار دکھائی دے۔ اُن کے حُسنِ نظارہ سے رُوح وفورِ جذب وشوق سے رقص کرنے لگی۔ یہ نظارہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دِل کا سُرور تھا۔ یہ احساس کہ ہم دیارِ حبیب ﷺ میں ہیں اور اپنے اِلٰہ یعنی معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود کے گھر جا رہے ہیں، ایسا وجد آفریں تھا کہ رُوح مسحور ومتکیّف ہوگئی۔ آرزوئیں بے ساختہ دُعائیں بن کر زبان پر آنے لگیں، آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور تن بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ ربِّ جلیل وعزیز کی ہیبت وجبروت کا دل حریف نہ ہوسکا اور کانپنے لگا۔ اب بے تابی تھی تو حرم شریف میں داخل ہونے اور اپنے اِلٰہ کے خانۂ حُسن ونُور کے دیکھنے اور شہیدِ نظارہ ہوجانے کی۔ یک طرفہ رہ گُزر کی وجہ سے گاڑی چکّر کاٹتی اور ہماری بے قراری بڑھتی رہی۔ اضطرابِ شوق کا عجب انداز تھا۔ اس میں کیف وسُرور بھی تھا اور رنگِ اضطرار بھی۔ اسی عالمِ اضطراب واشتیاق میں ہماری گاڑی فندق الحرام کے سامنے آکر رُک گئی۔ یہ ہوٹل حرم شریف کے قریب واقع ہے۔ ہمیں پہلی منزل میں ٹھہرایا گیا، جہاں ہم لِفٹ کے ذریعے پہنچے، سامان کمرے میں رکھوایا اور عُمرے کے لیے حرم شریف چل دیے۔

کڑی : ۴

حرم شریف یا جلوہ گاہِ "دوست"

عُمرہ : ایک ایمان افروز و جاں افروز تجربہ

حرم شریف کا حسین و منوّر منظر اگرچہ جنّتِ نگاہ تھا، لیکن اُسے دیکھتے ہی دل بھر آیا، آنکھوں سے جُوئے اشک رواں ہو گئی اور روح "دوست" کی دید و حضوری کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ ہم نے ارشادِ نبویؐ کی متابعت میں احرام باندھے، باب السّلام سے گزر کر، بنی شیبہ کے راستے، حرم شریف میں داخل ہوئے تو ہماری نظریں خانۂ کعبہ پر پڑیں اور وہیں مرتکز ہو گئیں۔ یہ میرے اِلٰہ و ربّ کا گھر تھا، جو جلوۂ حُسن و نُور اور جنّتِ اہلِ نظر تھا۔ اِسے صدیوں پہلے سیّدنا حضرت ابراھیم علیہ السّلام نے، جو پیغمبرِ صدق و وفا اور خلیل اللہ تھے، اپنے ربِّ جلیل کے حکم سے اپنے فرزندِ صالح و فرماں بردار اور پیغمبرِ تسلیم و رضا حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے تعاون سے تعمیر کیا تھا۔ یہ سیاہ رنگ کے غلاف میں ملفوف ہے، جس پر آیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔ خانۂ خُدا پر نظر پڑی تو زبان پر یہ دُعا آ گئی :

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَاذَاالْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ - اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَا الْبَیْتَ تَشْرِیْفًا وَّتَعْظِیْمًا وَ تَکْرِیْمًا مَھَابَۃً وَّ بِرًّا :

اے اللہ! تو السّلام (سلامتی ہی سلامتی) ہے، اور تیری طرف سے سلامتی ہی ملتی ہے۔ تو بابرکت ہے۔ اے صاحبِ جلال و اکرام، میرے اللہ! اس گھر کی بزرگی، عظمت، عزّت،

تکریم، ہیبت اور نیکی زیادہ فرما۔

حرم شریف بُقعۂ نور بنا ہُوا تھا۔ اس نُور میں نورِ ملکوتی اور حُسنِ الہیٰ کے رنگ کا امتزاج بھی تھا، اس لیے ایمان انگیز و بصیرت افروز، دلکش و جاں آفریں، نظرافروز و سُرور آگیں اور کیف پرور و سحر انگیز تھا۔ اہلِ جذب و شوق پر عجیب وارفتگی کا عالم تھا۔ وہ تلاشِ "دوست" میں سرگرداں و آشفتہ سر دکھائی دیتے تھے۔ کچھ سعی کرنے میں مشغول تھے تو بعض ذکر و اذکار اور تلاوت کرنے میں منہمک تھے، لیکن کثرت ان عُشّاق کی تھی جو "دوست" کی بلائیں لینے اور اس پر فدا ہو جانے کی تمنّا میں طواف کر رہے تھے۔ اُن کا "دوست" کے گھر کے ارد گرد گھُومنا، گریہ و زاری اور الحاح و فریاد کرنا، اور خشوع و خضوع سے دُعائیں مانگنا، سوزِ عشق و مستی کا ایسا سچّا اور رقّت انگیز نظّارہ تھا کہ مجھ پر بھی یہی کیفیتِ جذب و جنوں طاری ہوگئی۔ "دوست" آنکھوں سے نہاں تو تھا، لیکن دیدۂ دل پر جلوہ فگن بھی تھا۔ نظر اُسے دیکھ تو نہیں سکتی تھی، لیکن اس کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ روح کے جذب و شوق اور وارفتگی و شیفتگی سے ایسا تأثّر ملتا تھا جیسے "دوست" اپنے عُشّاق میں موجود انھیں دیکھ رہا ہے۔ "دوست" حقیقتِ گریزپا کی طرح ظاہر بھی تھا اور نہاں بھی، اور اہلِ جذب و شوق اس کی طلب و جستجو میں دیوانے ہو رہے تھے، اور ان کی یہ دیوانگی "اس" کی نظر میں اتنی عظیم و عزیز ہوتی ہے کہ اس پر ہزاروں فرزانوں کی فرزانگی قربان کر دی جائے۔

ہم عشاء کی نماز اور نوافل پڑھ کر فارغ ہوئے تو طواف کرنے کے لیے ہجومِ عُشّاق میں شامل ہو گئے۔ نُور کی بارش اور ملکوتی سائے اگر جنّت نگاہ تھے تو تسبیح و تحمید اور حمد و ثنا کی دلگداز صدائیں فردوسِ گوش تھیں۔ مرد و زن اور پیر و جواں اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کے گھر کے گرداگرد عالمِ سرمستی میں پروانہ وار گھوم رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ سب دُنیا و مافیہا سے بے نیاز "کوئے دوست" میں اس

کی طلب و جستجو میں سرگرداں تھے۔ حرم شریف حقیقت میں "کوئے دوست" ہے، جس میں عشّاق اس کے قُرب، وصال اور دید و حضوری کی آرزو میں دیدۂ شوق فرشِ راہ کیسے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں "دوست" کے گھر پر مرتکز تھیں، جس کا دیکھنا عبادت، اور اس کا صلہ آنکھوں کی ٹھنڈک، نفس کی طمانیت اور رُوح کا سُرور ہے۔ اس پر اہلِ نظر کی ہر نگۂ محبت کا اجر بے حساب ہے۔ نظر اس پر پڑتی تو شہیدِ نظّارہ ہو جاتی ہے، اور اس شہادتِ نظر کا صلہ بھی سُرورِ جاودانی ہے۔ یہ راز شہیدِ نظّارہ ہی جانتے ہیں۔

حجرِ اسود اور طواف کا آغاز

طواف کا آغاز کرنے کی خاطر ہم حجرِ اسود کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور یہ کلمات پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِیْمَانًا بِکَ وَتَصْدِیْقًا بِکِتَابِکَ وَوَفَاءً بِعَھْدِکَ وَاتِّبَاعًا لِسُنَّۃِ نَبِیِّکَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:

یا اللہ! تجھ پر میرا ایمان ہے، اور تیری کتاب کی میں تصدیق کرتا ہوں، نیز تیرے عہد کو پورا کرتا ہوں اور تیرے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کرتا ہوں۔

اضطباع

چونکہ یہ ہمارا طوافِ قدوم یعنی پہلا طواف تھا، اس لیے میں نے اضطباع کیا ہوا تھا۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ اُوپر کی چادر دائیں کندھے کے نیچے بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لی جائے۔ یہ یاد رہے کہ ایسا صرف طوافِ قدوم میں کیا جاتا ہے۔

رمل

ارشادِ نبوی کے مطابق اس طواف کے پہلے تین چکروں میں ہم نے رمل کیا۔ رمل دراصل قوّت و مردانگی کے اِظہار کے طور پر چھوٹے چھوٹے قدموں سے کندھے ہلا ہلا کر یعنی اکڑ اکڑ کر آہستہ آہستہ دوڑنے کو کہتے ہیں۔ اس سنّتِ نبوی کا پس منظر یہ ہے کہ مسلمان جب مدینۂ منوّرہ سے پہلی بار عمرے کے لیے مکّہ مکرّمہ آئے تو کفّار نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ مدینے کی آب و ہوا کی وجہ سے مسلمان جسمانی طور پر

کمزور ہو گئے ہیں اور ان میں پہلا سا دم خم نہیں رہا۔ یہ پراپیگنڈا چونکہ کفار کے لیے حوصلہ افزا اور مسلمانوں کے لیے ہمت شکن ثابت ہو سکتا تھا، لہٰذا اس کے بطلان کی خاطر آپؐ نے مسلمانوں کو رمل کا حکم دیا تھا (مشکوٰۃ)۔

اِستلام

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں پہلے ہی چکر میں استلام یعنی حجرِ اسود کو بوسہ دینے کا موقع مل گیا۔ ہم نے اس موقع پر یہ الفاظ کہے:

بِسْمِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ (مشکوٰۃ)

مسنون دُعا

پھر دائیں ہاتھ چلنے لگے۔ کعبہ شریف ہماری بائیں جانب تھا۔ ہماری نظریں اپنے اللہ کے گھر پر مرتکز تھیں، جو جلوہ گاہِ حُسن و نُور، آماجگاہِ ملائکہ اور ارواح کا حُسنِ مآب ہے۔ قلب رو رو کر اور زبان پکار پکار کر کلمۂ تمجید کا ورد کر رہے تھے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ:

اللہ منزّہ و پاک ہے اور سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود نہیں۔ اللہ سب سے بڑا ہے، نیز نیکی اور بدی سے بچنے کی طاقت صرف اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔

مُلتزم

حجرِ اسود سے بیت اللہ شریف کے دروازے کے درمیانی حصّے کو مُلتزم کہتے ہیں۔ یہاں غلافِ کعبہ کے اندر ہو کر اپنا دایاں رُخسار دیوار سے لگانا اور رو رو کر دُعا مانگنا سُنّت ہے۔ عشّاق طواف ختم کرنے کے بعد یہاں چمٹ جاتے ہیں۔ حجرِ اسود سے طواف کا آغاز کرتے ہی پہلے ملتزم پر نظر پڑی۔ اہلِ جذب و شوق دیوارِ "دوست" کے اس حصّے سے چمٹے ہوئے تھے جیسے کوئی عاشقِ صادق برسوں کے بچھڑے ہوئے محبوب سے ہمکنار ہو۔ جنونِ عشق کا یہ نظّارہ بڑا ہی

رقت انگیز و دلگداز تھا۔

درِ "دوست" یا خانۂ کعبہ کا دروازہ

ہم نے طواف کرنا تھا، لہٰذا اُسے تکتے گزرنے نہ پائے تھے کہ ہماری نظریں درِ "دوست" پر پڑیں اور آنکھوں کے سامنے برقِ حسن لہرا گئی۔ یہ ربِّ جلیل کے گھر کا دروازہ ہے، جو اس کے تین جلیل القدر پیغمبروں یعنی حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، حضرت اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ اور حضرت محمدؐ حبیب اللہ علیہم السّلام کی گزرگاہ تھی؟ نیز جہاں سے صحابہ کرامؓ، صدّیقین، شُہداء اور صالحین گزرے ہیں۔ ہم دیدۂ شوق سے اُسے تکتے گزر گئے۔

حطیم یا صحنِ "دوست"

زبان پر کلمۂ تمجید جاری اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا، دل دردِ محبّت سے بے قرار اور روح "حُسنِ دوست" کے جلووں سے سرمست تھی۔ فضائے حرم حُسن و نُور سے معمور اور فضائے دل جذب و مستی سے سرشار تھی۔ باہر "دوست" کی جلوہ گاہِ جمال و جلال ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان تھی تو اندر دل میں خود "دوست" جلوہ ساماں تھا۔ روح صہبائے دید کے نشے سے سرمست تھی۔ اس عالمِ بے خودی میں ہم حطیم پر پہنچے، جو دراصل بیت اللہ ہی کا ایک حصّہ ہے اور جسے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے تعمیر کیا تھا، لیکن جب اس کی اصل عمارت امتدادِ وقت اور سیلاب وغیرہ کی وجہ سے شکستہ و بوسیدہ ہو گئی، اور اُسے گرا کر دوبارہ تعمیر کیا گیا تو کچھ حصّہ باہر رہ گیا، اسی کو حطیم کہتے ہیں۔ اس کی نشان دہی کی خاطر اس کے تین طرف تین ساڑھے تین فٹ اُونچی خوبصورت جالی دار سنگِ مرمر کی دیوار بنا دی گئی ہے۔ اس احاطے اور خانۂ کعبہ کے درمیان دونوں جانب آنے جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ "دوست" کے گھر کا آنگن ہے، اس لیے عشّاق کا یہاں ہجوم رہتا ہے، جو دیوارِ "دوست" کے زیرِ سایہ نفل پڑھتے، آہ و فغاں اور گریہ و زاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم یہاں سے گزرے تو اس کے

نظارے سے روح تڑپ اٹھی اور "دوست" کے آنگن میں جانے کے لیے مچلنے لگی۔ چونکہ ہم طواف کی حالت میں تھے، لہٰذا اُسے ارمان بھری نظروں سے دیکھتے گزر گئے۔

رُکنِ یمانی

صحنِ "دوست" کا چکّر کاٹ کر ہم اب معمورۂ حُسن و نُور کے اس کونے پر پہنچے، جسے رُکنِ یمانی کہتے ہیں۔ بیت اللہ کے چاروں کونوں کو چار مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حجرِاسود اور رُکنِ یمانی والے دونوں کونے اصل ابراہیمی بنیاد پر ہیں، باقی دونوں کونے رُکنِ شامی و عراقی اصل بنیاد پر نہیں ہیں، کیونکہ حطیم کا حصّہ جو اصل عمارت میں تھا، تعمیرِ نو کے وقت باہر رہ گیا ہے۔ نبیِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ رکنِ یمانی پر ستّر فرشتے موجود رہتے ہیں، جو اس کام پر مامور ہیں کہ وہاں جو دعا مانگی جائے اس پر آمین کہیں۔ ہم نے رُکنِ یمانی کو فرطِ اشتیاق سے ہاتھ سے چھوا، کیوں کہ یہ ہمارے آقا و ہادی صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سنّت اور ارشاد ہے۔ اس کے لمس سے بدن میں ایک لرزشِ طرب پیدا ہوئی، جس کی ٹھنڈک سے قلب و جاں کو ایسی بے مثال لذّت ملی کہ روح وجد میں آ گئی۔ ہم نے یہاں یہ دُعا پڑھی:

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (مشکوٰۃ)

یا اللہ! میں تجھ سے معافی اور عافیت کی بھیک مانگتا ہوں۔ اے ہمارے آقا و پروردگار! ہمیں اس دنیا میں حسنہ (ہر قسم کی حسین چیز، مثلاً بھلائی، خیر، طمانیت و مسرّت صحت و خوش حالی، عزت و آبرو، فضل و کمال، انعام و اکرام، مال و دولت اور دولتِ دل وغیرہ) عطا فرما، اور آخرت میں بھی حسنہ عطا فرما، اور ہمیں النّار (قلب و جاں اور تن بدن کی آگ) کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

ہم یہ دُعا مانگتے آگے بڑھے اور حجرِ اسود پر پہنچ گئے۔ پہلا چکّر ختم ہُوا۔

سات چکّر یا ایک طواف

دوسرا چکّر شروع کرنے سے پہلے ہمیں پھر استلام یعنی حجرِ اسود کو چومنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم پہلے کی طرح کلمہ تمجید پڑھتے، دُعائیں مانگتے اور آہ وزاری کرتے چکّر لگاتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجھے ایسا دکھائی دینے لگا جیسے "حریم دوست" اس کی تجلّیات سے معمور ہوگیا ہے۔ مجھے "اُس" کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔میری نظریں اس حیرت انگیز نظّارے کی حریف نہ ہوسکیں، جذب و شوق جنون میں بدل گیا، اور دل میں جاں سپاری کی آرزو پیدا ہوگئی۔ میں والہانہ انداز میں گھومنے لگا اور بھول گیا کہ میں انجائنا (دل کی ایک بیماری) کا مریض ہوں، اور اس طرح بے تابانہ گھومنا دردِ دل کا سبب بن جایا کرتا ہے۔میری نظریں "دوست" کے جلوے اور اس کے گھر کا حسین منظر تھا، دل میں اس کی دید و وصال کی آرزو اور لبوں پر اس کا ذکر تھا۔ آتشِ عشق میں دل جل رہا تھا، لیکن اس جلنے کی لذّت ہی کچھ اور تھی۔ اس میں سوزش نہیں، ٹھنڈک تھی اور ٹھنڈک میں سحر انگیز لذّت و مسرّت تھی۔ اُس میں درد و اضطراب نہ تھا، بلکہ جانفزا راحت و طمانیت تھی۔ روح "دوست" پر فدا ہو جانے کی آرزو میں بے قرار تھی، اور اِس بے قراری سے خونِ جگر دیدۂ شوق و حیراں سے برنگِ اشک بہہ رہا تھا، اور لبوں پر آہ و فغاں تھی۔ پھر چشم خونابہ فشاں کی ہر نظر شہیدِ نظّارہ ہونے لگی، اور اس شہادت سے مجھے ہر لحظہ ایک نئی زندگی ملنے لگی۔ اس جان آفرین تجربے کے بعد مجھ پر اس شعر کی حقیقت کھُلی ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اب میں ایک ایسے عالم میں تھا، جس میں بادۂ دید کا روح پرور نشّہ بھی تھا اور عشق و جنوں کی سرمستی بھی، جس میں شہادت پانے کی سرور انگیز و کیف پرور لذّت بھی

تھی اور نہ زندگی پانے کی وجد آفریں مسرت بھی۔ میں اس عالمِ کیف و مستی میں "دوست" کی بلائیں لیتا گھوم رہا تھا کہ کسی نے میرا بازو تھام لیا۔ میں رُکا تو ایسا لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن رُک گئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری رفیقۂ حیات میرا بازو تھامے کہہ رہی ہے: "بس کیجیے۔ سات چکّر ختم ہو چکے ہیں۔" طواف کیا ختم ہوا کہ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میں "دوست" کے فردوسِ بریں سے نکل کر زمین پر آ گیا ہوں۔ علّامہ اقبال نے خُدا جانے کس عالم میں کہا تھا:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

لیکن اس وقت میری کیفیت اور خواہش یہ تھی کہ کاش ساقی مجھے نہ تھامتا، بلکہ "دوست" کے قدموں میں گرنے اور جان نذر کرنے دیتا۔ شہیدانِ محبت ہی اس لذت سے آشنا ہیں کہ "دوست" پر جان دینا، شہادت ہی نہیں، شہادتِ عظمیٰ ہے، جس کا صلہ دید و وصالِ جاودانی ہے۔ یہ شہادت انسان کو صاحبِ دید و نظر اور اہلِ حُسن و سُرور بنا دیتی ہے۔

مقامِ ابراہیمؑ

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے ارشاد کے مطابق ہم طواف ختم کر کے مقامِ ابراہیم علیہ السّلام کی طرف یہ دُعا پڑھتے ہوئے چلے:

اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاخْلُفْ عَلٰی كُلِّ غَائِبَةٍ لِّیْ بِخَیْرٍ (ابن ابی شیبۃ)

یااللہ! مجھے قناعت عطا کر اس پر جو مجھے دیا، اور اس میں میرے لیے برکت ڈال، اور میری ان چیزوں کی اچھی طرح خبر گیری فرما جو اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہیں۔

مقامِ ابراہیمؑ پر پہنچ کر ہم نے یہ آیت تلاوت کی:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (البقرۃ ۲ : ۱۲۵)

اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنا لو۔

مقامِ ابراہیمؑ پر دو نفل پڑھنا نبیِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سُنّتِ حسنہ ہے، نیز

یہاں نوافل پڑھنے کا ثواب بھی بے حساب ملتا ہے، لہٰذا مغفرت و رحمت کے طلب گاروں کا یہاں اژدحام رہتا ہے۔ ان کے خشوع و خضوع اور الحاح و تضرع کا نظارہ بڑا ہی رقّت انگیز و ایمان افروز ہوتا ہے۔ یہاں جگہ ملنی خوش قسمتی سمجھی جاتی ہے۔ اس جگہ شیشے کی ایک دیدہ زیب قدِ آدم یادگار ہے، جس میں ایک پتھر نصب ہے، جس پر پاؤں کا نشان مرتسم ہے۔ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نقشِ قدم کہتے ہیں۔ "دوست" کی نظرِ کرم تھی کہ ہمیں اس متبرک مقام پر نفل پڑھنے کے لیے جگہ مل گئی۔ ہم نے دوگانہ پڑھا۔ پہلی رکعت میں ہم نے سورۃ الفاتحہ کے سورۃ الکٰفرون اور دوسری رکعت میں سورۃ الاخلاص پڑھی (مشکوٰۃ)۔

مشاہدۂ "دوست"

یہ اس مقام کی برکت اور "دوست" کی عنایت تھی کہ نماز شروع کرتے ہی اُس نے مجھے "احسان" کا مقامِ شاہدیت عطا کر دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ "دوست" اپنے جمال و جمال کی رعنائیوں کے ساتھ صورتِ مجاز میں میرے سامنے جلوہ افروز ہے۔ میں دیدۂ حیران بن کر اُسے تکنے لگا۔ اُس کی "صورت" تصویرِ حُسن و سحر تھی۔ وہ میرے جمالیاتی ذوق اور حسین خواب و تصوّر سے بھی کہیں زیادہ حسین و دلکش، روح پرور و سرور انگیز اور حیرت افزا و سحر انگیز تھی۔ وہ آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ "دوست" کی دُنیا اس کی حریمِ ذات تھی، جو اِس عالمِ زمان و مکان سے وراء حُسن و نور کا جہانِ بیکراں تھی۔ حریمِ ذات سے مسلسل ایک صدائے دل نشین و جاں آفریں آ رہی تھی، جس میں زندگی کا سوز و ساز اور آواز کا حُسنِ سحر تھا، جس کے لیے غنائیت، شعریت، سُر اور تال کی تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ اس آواز میں قوتِ تخلیق و جاں آفرینی تھی، جس کی بدولت حریمِ ذات سے حُسن کی موجیں رواں دواں تھیں اور ان کے وصال و فراق سے زمان و مکان کی تخلیق اور حیات و موت کے ہنگامے پرورش پا رہے تھے۔ کائنات صدائے کُن فیکون کے نغموں سے اس دلکش انداز میں

گونج رہی تھی کہ اس سے ہر وجود اپنے حال میں مست تھا۔

"دوست" کی حریم ذات حُسن کا طلسم کدہ تھی تو صورتِ "دوست" تصویرِ حُسن تھی، اور اس کا ہر جلوہ برقِ حُسن و سُرور بن کر دل پر گرتا اور اس کی کثافتوں کو لطافتوں میں بدل کر مجھے صاحبِ حُسن و سرور بنا دیتا۔ روح، جسے اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (اللہ) کے وصال کی طلب و جستجو رہتی تھی، اس کی مراد بر آئی تو نظر بن کر شہیدِ نظارہ ہوتی رہی اور اُسے اس شہادت کے عوض حیاتِ جاودانی، سوزِ ابدی اور سُرورِ سرمدی ملتا رہا۔ "دوست" کا اپنا جہان ہے، جو لامکان و لا زمان ہے۔ خُدا جانے میں اُس کے حضور کتنی صدیاں رہا۔ میں اگرچہ عالمِ جذب و مستی میں تھا، لیکن مجھے اتنا ہوش ضرور تھا کہ میں اپنے "دوست" کے حضور حاضر ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کسی کا ہوش تھا نہ خیال۔ رُوح کی بس ایک ہی آرزو تھی کہ وہ اُسے دیکھتی اور اس پر قربان ہوتی رہے۔ وہ اس پر قربان ہوتی اور لذّتِ شہادت سے آشنا ہوتی رہی اور اُس پر حُسن و سُرور اور حیات و شہادت کے اسرار آشکارا ہوتے رہے۔ میں "دوست" کی دُنیا میں ہزاروں برس رہا، لیکن جب اپنی دنیا میں واپس آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابھی چند ساعتیں ہی گزری ہیں۔

یہ مشاہدہ میرا حاصلِ زندگانی اور "دوست" کی نعمتِ عظمیٰ تھی، جس کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتا تو کیسے؟ مجھ پر وجد و حال اور سوز و مستی کی کیفیت طاری تھی۔ میں اُس کے حضور سجدے میں گر گیا، خونِ جگر آنسو بن کر آنکھوں سے جاری ہو گیا۔ میں دُعا مانگتا اور روتا رہا۔ اس قدر رویا کہ آنکھیں خشک ہو گئیں۔ گریہ و زاری اور دُعا و فریاد کا اثر تھا کہ طبیعت اعتدال پہ آ گئی۔ سجدے سے اُٹھا تو رفیقۂ حیات کو سعی کرنے کے لیے اپنا منتظر پایا۔ ہم دونوں نے یہ دُعائیں مانگیں :

اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِيْ وَتَعْلَمُ

حَاجَتِیْ فَاَعْطِنِیْ سُؤَالِیْ وَتَعْلَمُ مَافِیْ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذُنُوْبِیْ۔
اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ وَیَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی
اَعْلَمَ اِنَّہٗ لَا یُصِیْبُنِیْ اِلَّا مَاقَضَیْتَ لِیْ وَرِضًا بِمَا قَسَمْتَ لِیْ
یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ :

یا اللہ! تو میری باطن (پوشیدہ) اور ظاہر کو جانتا ہے۔ پس میری معذرت قبول کر۔ نیز تو میری حاجت کو جانتا ہے، میں جو مانگتا ہوں اُسے عطا کر (یعنی مراد برلا)۔ جو میرے دل میں تو وہ بھی جانتا ہے۔ میرے گناہ بخش دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے ایمان کی بھیک مانگتا ہوں جو میرے دل میں رچ بس جائے، اور سچے یقین کی بھیک بھی، یہاں تک کہ میں (یہ حقیقت) جان لوں کہ بلاشبہ مجھے نہیں ملتا بجز اس کے جو تُو نے میرے لیے مقدر کیا اور اپنی قسمت پر راضی ہو جاؤں۔ اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے!

چاہِ زمزم

یہ دُعا مانگ کر ہم تشنہ کامانِ محبّت کے چشمۂ آبِ حیواں یا چاہِ زمزم پر آئے اور "دوست" کے خانۂ حُسن و نُور یا کعبے کی طرف منہ کر کے، خُوب سیر ہو کر آبِ زمزم نوشِ جان کیا۔ نظارۂ کعبہ آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سُرور اور ذوقِ نظر کی تسکین تھا تو آبِ زمزم راحتِ جسم و جاں، تسکینِ دل اور رُوح کی ٹھنڈک تھا۔ روایت ہے کہ اس موقع پر تسکینِ دل و جان ملنے کے ساتھ دل سے مانگی ہوئی دُعا بھی قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بڑے ہی خشوع و خضوع سے یہ دُعا مانگی جو ہادیِ برحق پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زبانِ مبارک سے نکلی تھی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا
وَّشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ :

اے اللہ! میں تجھ سے نفع دینے والے علم، قبول کیے جانے والے عمل اور رزقِ فراخ کی، نیز ہر بیماری سے شفا کی بھیک مانگتا ہوں۔

کڑی : ۵

سعی : امتحانِ فرض و محبّت کی یادگار

سعی سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے عشق و وفا، صبر و شکیب، ایثار و قربانی اور آپؑ کی زوجۂ مطہرہ حضرت ہاجرہؑ کی طاعت و وفاداری، تسلیم و رضا اور شفقتِ مادری کے امتحانِ شکیب رُبا کی ایمان انگیز و بصیرت افروز یادگار ہے۔ امتحانِ فرض و عشق کا یہ دلگداز و حکمت آموز واقعہ ربِّ جمیل و رحیم کی نظر میں ایسا مقبول ہوا کہ اُس نے اُسے تاریخ ساز و عہد آفرین اور لازوال و لافانی بنا دیا۔ چنانچہ اہلِ محبت کفن بدوش ہو کر ہمہ وقت اس کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے عالمِ جذب و مستی میں چلنے اور دوڑنے اور الحاح و زاری کرنے کا رقّت انگیز نظّارہ روح کو وجد و حال میں لے آتا ہے۔ ان اہلِ جذب و شوق میں جنّات و ملائکہ بھی ہوتے ہیں، جو غیر مرئی مخلوق ہیں، لیکن ایسے بھی اہلِ نظر ہیں جو انھیں بھی دیکھ لیتے ہیں ؎

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں

ماں بیٹا موت کی وادی میں

حضرت ابراہیم علیہ السّلام صدق و صفا، عشق و وفا، صبر و ثبات، تسلیم و رضا اور ایثار و قربانی میں آپ اپنی مثال تھے۔ آپؑ کو راہِ "دوست" میں بار بار شکیب رُبا امتحانوں اور صبر آزما تجربوں سے گزرنا پڑا، اور آپؑ ہر امتحان و تجربے سے کامیاب گزرے۔ یہ ادا "دوست" کو بے حد عزیز تھی۔ اُس نے آپؑ کو اپنا دوست بنا لیا اور زندۂ جاوید

کر دیا، لہٰذا تاریخ آپؑ کی "خلیل اللہ" کے بے مثال و جلیل القدر لقب سے یاد کرتی ہے۔ آپؑ جن صبر آزما بلکہ شکیب رُبا امتحانوں سے گزرے تھے، ان میں سے ایک امتحان اپنے نوزائیدہ لختِ جگر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؓ کو، جو آپؑ کی برسوں کی اطاعت شعار و وفادار رفیقہ حیات تھیں، "دوست" کی راہ میں اس طرح قربان کرنا تھا کہ اُسے تسلیم و رضا، صبر و شکیب، عشق و وفا اور ایثار و قربانی کی ایک بے نظیر یادگار بن جانا تھا۔ آپؑ اپنے "دوست" کے ایما پر اپنی زوجۂ مطہرہؓ اور لختِ جگرؑ کو لے کر مکّہ مکرمہ کی وادیِ بے آب و گیاہ میں آئے اور انھیں وہاں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ راز کُشتگانِ خنجرِ تسلیم و رضا ہی جانتے ہیں کہ کیوں حضرت ہاجرہؓ نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے زمانۂ یاس کی اکلوتی نرینہ اولاد کے ساتھ زندگی سے ناآشنا اس وادیِ موت میں رہنا قبول کر لیا۔

یہ درست ہے کہ وہاں نہ زندگی تھی اور نہ زندگی کا کوئی سامان ہی تھا، نہ کوئی فردِ بشر تھا نہ کوئی متنفس۔ وہ بظاہر بے یار و مددگار تھیں، بے بس و لاچار تھیں۔ ہر سُو موت رقصاں تھی اور اس کا سناٹا بڑا ہی خوفناک و روح فرسا تھا۔ انھیں اپنی ذات سے زیادہ اپنے نوزائیدہ اکلوتے بیٹے کا غم تھا، جسے اللہ تعالیٰ نے انھیں بانجھ اور عجوزہ ہونے کے باوجود عطا کیا تھا۔ اگرچہ موت کی وادی میں زندگی کی امّید رکھنا محال تھا، لیکن اُن کے مطہّر و منوّر دل میں اُمّید کی شمع روشن تھی، کیونکہ انھیں اس حقیقت کا ایقان و ایمان تھا کہ جہاں انسان ہوتا ہے وہاں اس کا اِلٰہ و ربّ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کون اپنے بندوں کا محافظ و ناصر ہو سکتا ہے؟ نیز جس کا اللہ والی و نصیر ہو، اُسے خوف و حُزن ہو تو کیوں ہو؟ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو بے آسرا نہیں چھوڑا تھا، بلکہ اپنے "دوست" کے سپرد کیا تھا، جو ربِّ رحیم، قادرِ مطلق اور عزیز و ناصر ہے۔ یہ امتحانِ مہر و وفا تھا۔

دِل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے تو کتنا زبردست اور شکیب رُبا امتحان تھا۔ بڑے انسانوں کا امتحانِ عشق و وفا بھی بڑا ہی ہوتا ہے۔ وہاں نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ پینے کو۔ حضرت ہاجرہؓ اپنے لختِ جگر کو لیے لق و دق صحرا میں اس جگہ بیٹھ گئیں، جس کے قریب اب خانۂ کعبہ ہے، اور اس کی دونوں جانب صفا اور مروہ کی پہاڑیاں ہیں۔ وہاں نہ آبادی تھی، نہ سبزہ، نہ پانی تھا، نہ درخت۔ بس ھُو کا عالم تھا اور اس لق و دق صحرا میں چٹیل میدان اور پتھریلے پہاڑ تھے۔ حضرت ہاجرہؓ بے سایہ اور بے سہارا دل پر پتّھر اور ایک پتھر پر اپنے لختِ جگر کو رکھے بیٹھی تھیں۔ دل مستقبل کے اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ماں اور شیرخوار بچّہ سنسان وادی میں تنہا پڑے تھے،	**لختِ جگر کی تڑپ اور مامتا کی بے قراری**

جہاں درندوں اور رہزنوں کا بھی خوف تھا۔ انھیں اس بات کا تو اذعان و ایقان تھا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہو رہا ہے، لہٰذا وہ ان کی ضرور حفاظت کرے گا، لیکن دل آخر بشر کا دل تھا، کسی انجانے خوف سے پریشان تھا۔ موسمِ گرما کی شدّت اور تمازتِ آفتاب نے ماں اور بیٹے دونوں کو مضمحل اور پیاس سے نڈھال کر دیا۔ بچّہ بے شک پیغمبر زادہ اور خود بھی پیغمبر تھا، مگر تھا تو بچّہ ہی، پیاس اور تمازتِ آفتاب سے بے قرار ہو کر بلکنے لگا۔ بچّے کی بے قراری، تڑپ اور بلک ماں سے دیکھی نہ گئی۔ مامتا بچّے کی یہ حالتِ زار دیکھ کر تڑپ اُٹھی۔ اسے پانی کی طلب و جستجو ہوئی۔ وہ دوڑ کر کوہِ صفا پر گئی، لیکن پانی نظر نہ آیا۔ وہ لوٹی، دوڑی اور اس کے بالمقابل کوہِ مروہ پر پہنچی۔ پانی وہاں بھی ناپید تھا۔ پیغمبر زادہ چٹان پر پڑا تڑپ رہا تھا، ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ مامتا تڑپتی صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا کی طرف آتی جاتی تھی، اس اُمّید پر کہ شاید کہیں دُور و نزدیک پانی نظر آجائے، لیکن پانی کے دُور دُور

تک کوئی آثار نہ تھے۔

چشمہ جاری ہو گیا

حضرت ہاجرہؓ ادھر سے مایوس ہو کر اپنے لختِ جگر کے پاس آئیں۔ سات بار کی سعی ناکام ہو چکی تھی، لیکن اب کی بار جب وہ اپنے جگر گوشہ رسولؑ کے پاس آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ وہاں چشمہ اُبل رہا اور پانی بہہ رہا ہے۔ یہ حیرت انگیز اور جانفزا منظر دیکھ کر اُن کی زبان مبارک سے بے ساختہ نکلا: "زمزم! زمزم!" یعنی پانی رُک جا! پانی رُک جا! مگر پانی جاری رہا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ہمیشہ جاری رکھنے کے لیے نکالا تھا۔ چنانچہ وہ اب تک جاری ہے۔

آبِ زمزم اللہ تعالیٰ کی زندۂ جاوید نشانی ہے، اُن کے لیے جو چشمِ بینا، عقلِ سلیم دو قلبِ مُنیب رکھتے ہیں۔ یہ چشمہ اہلِ جذب و شوق کے لیے چشمۂ آبِ حیواں ہے، جس کے پانی سے دل کا چمن سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ آبِ زمزم صدیوں سے کامانِ محبت کے دلوں کو سیراب کرتا رہا ہے اور ہمیشہ ہی ایسا کرتا رہے گا، نیز مخلوقِ خدا کی پیاس بجھاتا رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتِ لامتناہی ہے، جو صلہ ہے عشقِ الٰہی اور تسلیم و رضا کا۔ یہ چشمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اُس پیغمبرؑ اور پیغمبرزادے ذبیحؑ اللہ کے لیے جاری کیا تھا جنھیں پیغمبرِ اعظم و آخر حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا مورثِ اعلیٰ بننے کا شرف پانا تھا، نیز جنھوں نے ذبح ہونے کے لیے اپنا سر پیش کر کے باپ کے رویائے صادقہ کو سچا کر دکھانا اور اطاعت و قربانی کی ایسی مثال قائم کرنا تھی جس کی یاد میں رسمِ قربانی کو موجودہ شکل میں قیامت تک جاری رہنا تھا۔

ایک حکیمانہ نکتہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی وفا شعار بیوی اور لختِ جگر کو اس سُنسان اور بے آب و گیاہ وادی میں تنہا و بے آسرا چھوڑنے کا جو حکم دیا تھا اس میں یہ حکمت مضمر تھی کہ وہ دونوں ماں بیٹا اس ویرانے کو آباد کریں اور باپ بیٹا مل کر اللہ کے گھر بیت اللہ کا

خانہ کعبہ کی تعمیر کریں۔ پھر آلِ اسماعیل علیہ السلام اس گھر کی حفاظت کرے، اُسے آباد رکھے اور حجاج کی دیکھ بھال کرے۔ یہ کُل مخلوقات کے جمیل و جلیل اور رحیم و کریم رب کا مقدس و مکرم گھر تھا، جسے اُس کے بندوں کا قبلہ بننا تھا۔ اہلِ جذب و شوق کو اس کی زیارت و طواف اور عمرہ و حج کے لیے یہاں آنا تھا۔ یہ امن و سلامتی کا بیت الحرام تھا۔ یہ ملائکہ کی فرودگاہ تھی۔ یہاں ہر وقت حسن و نور کی بارش ہوتی اور دولتِ دل لُٹائی جاتی تھی، جسے لُوٹنے کے لیے اس کے فقیروں نے یہاں آنا تھا، اور ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام یہاں کے مکینوں نے کرنا تھا۔ اہلِ مہر و وفا نے رسمِ عاشقی کو زندہ رکھنا تھا۔ ہمیں اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ "دوست" نے ہمیں بھی رسمِ عاشقی ادا کرنے کی توفیق و سعادت عطا کی ہے۔

سعی کا آغاز اور طریقہ

آبِ زمزم سے سیراب ہو کر اور دُعا مانگ کر ہم مسجد الحرام سے نکلنے لگے تو ہم نے یہ دُعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ

اے اللہ! میں تجھ سے تیرے فضل کی بھیک مانگتا ہوں۔

یہاں سے ہم باب الصفا کے راستے کوہِ صفا پر پہنچنے لگے تو یہ کلمات پڑھے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ؛

بلاشبہ صفا اور مروہ (کی پہاڑیاں) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں (مشکوٰۃ)۔

کوہِ صفا پر ہم یہ دُعا مانگتے چڑھنے لگے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَبْدَءُ بِمَا بَدَءَ اللّٰهُ بِهٖ:

اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ شروع کرتا ہوں اس سے جس کا اللہ نے پہلے ذکر کیا۔

پھر ہم قبلہ رُخ ہو گئے اور وہ فردوسِ نظر ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے پہلے تین بار یہ پڑھا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَللّٰهُ اَكْبَرُ :

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود نہیں۔ وہ ایک ہے۔ اللہ سب سے بزرگ و برتر ہے۔

پھر ہم نے یہ دُعا مانگی:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ (مشکوٰۃ):

اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ یا معبود و محبوب، اور مطلوب و مقصود نہیں۔ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہت اسی کی ہے اور اسی کے لیے حمد و ثنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، وہ ایک ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور اس اکیلے نے لشکروں کو شکست دی۔

دُعا مانگتے ہوئے ہم پر رقّت طاری ہو گئی۔ سبھی رو رہے تھے اور ان کی آوازیں بھرائی ہوئی تھیں۔ دُعا ختم ہوتے ہی ہم یہ دُعا مانگنے لگے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ قُلْتَ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ وَاِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ وَاِنِّيْٓ اَسْئَلُكَ كَمَا هَدَيْتَنِيْ لِلْاِسْلَامِ لَا تَنْزِعْهُ مِنِّيْ حَتّٰى تَتَوَفَّانِيْ وَاَنَا مُسْلِمٌ (مؤطا):

یا اللہ! تیرا ارشاد ہے کہ دُعا کرو، میں قبول کروں گا، اور تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ لہٰذا میں تجھ سے اس چیز کی بھیک مانگتا ہوں کہ جیسے تُو نے مجھے اسلام کی راہ دکھائی، سو مجھ سے اسلام نہ چھڑائیو، یہاں تک کہ اسلام کی حالت ہی میں وفات پا جاؤں۔

اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اپنے گھر میں جلوہ افروز ہے اور ہماری فریاد سُن رہا ہے۔ قرب و حضوری کا احساس بڑا ہی رقّت انگیز، پُرسوز اور وجد آفرین ہوتا ہے۔ دِل چاہتا ہے کہ "وہ" حریمِ کبریا سے باہر آکر فردوسِ نظر بن جائے۔ رُوح اس کے دیدار کے لیے مچلنے اور تڑپنے لگتی ہے۔ اہلِ نظر کبھی اس کا ایک جلوہ دیکھ بھی لیتے ہیں۔ اس کا حُسنِ صورت ان کے لیے جنّتِ نگاہ بن کر ان کو مسحور بھی کر دیتا ہے۔ اہلِ حُسن و سُرور جانتے ہیں کہ وہ اپنے بندوں کے لیے جلوہ فروش بھی ہے، جو اس کے ہاتھ اپنا تن من، دھن، جان سب کچھ بیچ ڈالتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سودا حد سے زیادہ سستا ہے۔ بندوں کے لیے یہ مفت کا سودا ہے۔ اس کے حُسنِ صورت کا جلوہ ہر لحظہ یہ آواز لگاتا رہتا ہے :

سُرمۂ مُفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

دل آرزوؤں سے بھرا ہوا تھا اور آرزوئیں بے اختیار دُعائیں بن کر زبان پر آرہی تھیں۔ یہ ہمارا اضطراری فعل تھا۔ ہم اب صفا سے اُترے اور مروہ کی طرف چلے۔ ہماری زبان پر یہ دُعا تھی :

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ (ابنِ ابی شیبہ)

اے میرے رب! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔ تُو ہی سب سے زیادہ غلبہ و عزّت رکھنے والا اور سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے۔

سبز ستون

وارفتگی و شیفتگی کا عالم تھا اور ہم چل رہے تھے۔ جونہی دائیں بائیں سبز ستونوں پر نظر پڑی اور ان کے قریب پہنچے تو سب اہلِ جذب و شوق والہانہ انداز میں دوڑنے لگے، جیسے اُمّ المومنین حضرت ہاجرہؓ نے اس جگہ سے دوڑنا شروع کیا تھا۔ انھیں اپنے ننھے سے لختِ جگر، پیغمبر اعظم و آخر

صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے جدِّ امجد، حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے لیے پانی کی طلب و جستجو تھی، جو پیاس کی شدّت سے بلک رہے اور ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ آخر وہ صنفِ نازک تھیں، پھر اہلِ تسلیم و رضا میں سے تھیں، تھوڑے ہی فاصلے پر جا کر دوڑنا بند کر دیا اور معمول کے مطابق چلنا شروع کر دیا۔ یہاں پھر سبز ستون نصب ہیں۔ یہاں پہنچ کر ہم بھی معمول کے مطابق چلنے لگے اور کوہِ مروہ پر پہنچ گئے۔ اُوپر چڑھتے ہوئے ہم نے وہی کلمات دُہرائے، جو کوہِ صفا پر چڑھتے ہوئے پڑھے تھے۔ یہ پہلا چکّر تھا۔ مروہ سے پھر اسی طرح صفا کی طرف، اور دُوسرا چکر مکمّل کیا۔

رقصِ رُوح و بدن لاہور سے کراچی، کراچی سے جدّے اور جدّے سے مکّہ مکرمہ کا سفر کیا تھا۔ پھر آرام کیے بغیر طواف کی سعادت حاصل کی تھی۔ بیماریِ دل، کمزوریِ بدن اور پیرانہ سالی کے باوجود اب میں والہانہ انداز میں سعی کر رہا تھا۔ اطبّا کی ہدایت کی رُو سے مجھے گاڑی میں بیٹھ کر سعی کرنا تھی۔ بیگم نے شروع میں بھی اصرار کیا تھا اور اب بھی اس بات پر مُصر تھیں کہ میں گاڑی میں بیٹھ جاؤں، مبادا دردِ دل کا دَورہ نہ پڑ جائے۔ میں جانتا تھا کہ اتنا چلنا اور دوڑنا میرے بس کا روگ نہ تھا اور ایسا کرنا خطرے کا باعث بھی ہو سکتا تھا، لیکن مجھ پر جذب و مستی کی کیفیت طاری تھی، اور میں اس عالم میں حضرت ہاجرہؓ کو مامتا کے مارے صفا اور مروہ کے درمیان ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتا اور دوڑتا دیکھ رہا تھا۔ میں بھی تڑپنا اور دوڑنا چاہتا تھا۔ یہ میرے جنون اور رسمِ عاشقی کا تقاضا تھا۔ میں بھی امتحانِ مہر و وفا سے گزرنے کی لذّت سے آشنا ہونا چاہتا تھا۔ میں نے بیگم کی بات نہ سُنی اور اہلِ جذب و شوق کے ساتھ پیدل سعی کرتا رہا۔ ان میں کچھ چہرے ایسے بھی تھے جو نورانی اور مافوق البشر سے تھے۔ شاید اُن میں مومن جنّات بھی تھے۔ سب کی آنکھیں اشکبار اور لبوں پر دُعائیں تھیں اور وہ والہانہ انداز میں سعی کر رہے تھے۔ میں نے رقصِ طاؤس دیکھا ہے۔ وہ جذب و مستی

کے عالم میں سیدھا دوڑتا اور اسی والہانہ انداز میں رقص کرتا ہوا لوٹتا تھا، اور یہ رقص اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ تھک کر نڈھال نہ ہو جائے۔ سعی بھی ایک اعتبار سے اسی انداز کا رقصِ روح و بدن ہے۔ میری خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ میں بھول ہی گیا تھا کہ مجھے دل کا عارضہ ہے اور دل کے لیے دوڑنا اس کی موت ہے، لیکن سعی دل کی موت نہیں، اس کی زندگی ہے۔ میں سعی کرتا رہا اور میری کیفیتِ جنون کے ساتھ میری توانائی بڑھتی رہی۔

میں ایک بڑے ہی روح پرور و وجد انگیز تجربے سے گزر رہا تھا۔ دل میں درد و سوز کا ایک طوفان برپا تھا، مگر اس طوفان میں کیف و سرور کی موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ سینے میں آتشِ شوق شعلہ زن تھی، لیکن ان شعلوں میں سرور آگین و سحر انگیز ٹھنڈک تھی۔ فضا نالہ و شیون کی رقت انگیز صداؤں، اور دلگداز دُعاؤں سے گونج رہی تھی، اور اس گونج میں حُسنِ آواز یا سُر کا سحر تھا۔ میں بھی دیگر اہلِ جذب و شوق کی طرح مسحور سعی میں مشغول تھا۔ مجھے اپنا ہوش تھا نہ چکروں کی گنتی کا۔ ایک بار جب ہم کوہِ مروہ پر پہنچے تو بیگم نے میرا بازو تھام لیا اور بتایا کہ سات چکر پورے ہو گئے ہیں۔ ہم ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ جہاں سے "دوست" کا بیتِ حُسن و نُور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فضا نُور و حُسن سے منوّر و نظر افروز تھی۔ ایک مقدّس دیدہ فسوں نظارہ تھا۔ ملائکہ کے عروج و ہبوط کا منظر فی الواقع فردوسِ نظر تھا۔

حجامت — میں نے سر کے بال کترو لیے، اور اپنی بیگم کی چُٹیا سے اُنگلی کے پور کے برابر بالوں کی ایک لٹ کاٹ لی اور احرام اُتار دیے۔ عُمرہ اب ادا ہو گیا تھا۔ اس تصوّر سے دل فرطِ مسرّت سے بلّیوں اُچھلنے لگا، آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے اور قلب شکرِ الٰہی کے جذبات سے موجزن ہو گیا۔ ہم نے جی بھر کر دُعائیں مانگیں اور اپنے ہوٹل فندق الحرم چلے گئے۔

کڑی : ۶

وارفتگیِ شوق کا ایک عجیب و غریب تجربہ

طواف کا تجربہ بڑا ہی عجیب و غریب، ایمان انگیز و بصیرت افروز اور روح پرور و سُرور انگیز تھا۔ "دوست" کا دولت کدہ دولتِ دل سے معمور تھا اور اہلِ جذب و شوق اپنی اپنی طلب و آرزو، ہمت و توفیق اور ظرفِ دل کے مطابق اُسے لُوٹ رہے تھے۔ میں بھی اُن خوش نصیب اہلِ مہر و وفا میں شامل تھا، لیکن مجھے اپنی اس خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ آیا یہ سب کچھ حقیقت ہے یا خواب۔ اکہ میں واقعی "دوست" کے گھر میں موجود اور اُس کی بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوں؟ کیا مجھے واقعی دید و حضوری کی سعادت حاصل ہے؟ کیا یہ حقیقت ہے کہ میرا دل "دوست" کے جلوۂ حسن اور سوزِ عشق سے فروزاں ہے؟ کیا "دوست" نے واقعی مجھے دولتِ دل سمیٹ لینے کی توفیق و سعادت عطا کی ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر کیوں نہ اظہارِ تشکر و امتنان کے طور پر اس کے حضور نذرانۂ دل و جاں پیش کر دوں؟ لیکن دل و جاں بھی تو اُسی کی امانت ہیں۔ پھر میں کیا پیش کر دوں؟ اپنا کیا ہے جو اس کی نذر کر دوں؟ میرے پاس آہ و فغاں، خونِ جگر اور اشکِ رواں کے سوا تھا بھی کیا جو نذر کرتا۔ لیکن یہ بھی تو اُسی کے عطا کردہ تھے۔ یہ بھی اُس کا کرم تھا کہ اُس نے جذب و شوق عطا کیا تھا اور مجھے اپنا مہمان بنایا تھا۔

خُدائے ذوالجلال کا اپنے کسی بندے کو اپنا مہمان بنانا معمولی بات نہیں۔ انسان سوچے تو یہ ربِّ جلیل کا ایسا انعام ہے جس پر وہ جتنا بھی اظہارِ مسرت و تشکر کرے کم ہے۔

میزبان اپنا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (اللہ) اور مالک و پروردگار (ربّ) ہو، اور مہمان عاشق و پرستار اور اس کا بندہ و فقیر بھی ہو، خُدا ساز بات ہے، جو اس کی رحمتِ بے پایاں کی دلیل ہے ۔ مجھے اس بات، کا عین الیقین بھی تھا اور حق الیقین بھی، لیکن پھر بھی اس سعادتِ عظمیٰ پر گمان گزرتا تھا کہ کہیں یہ سب کچھ خواب نہ ہو۔ دل اس مسرتِ بے پایاں کا متحمل کیسے ہوا اور میں خوشی سے مر کیوں نہ گیا یا کم سے کم دیوانہ کیوں نہ ہوا ؟ میں آج بھی یہ سوچتا ہوں تو اس کی توجیہہ اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتا کہ یہ "دوست" کی نظرِ کرم تھی کہ مجھے نہ شادی مرگ ہوئی اور نہ میں مجذوب و دیوانہ ہی ہوا۔

"دوست" نے مجھے اپنا مہمان بنایا تو مجھے طرح طرح کی نعمتوں سے بھی نوازا ۔ وہ نعمتیں اپنے بندوں کی طلب و آرزو اور ذوق و ظرف کی رعایت سے دیتا ہے ۔ مجھ پر اس کا ایک احسانِ عظیم یہ تھا کہ اُس نے مجھ پر اسرارِ حُسن آشکارا کیے اور اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ اس لیے جُملہ مخلوقات کا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا اِلٰہ ہے کہ وہ حُسن ہے ۔ وہ اس لیے سب جہانوں کی ربوبیّت یعنی مادّی و معنوی پرورش و نگہداشت اور نشو و ارتقا کرتا ہے کہ وہ حُسن ہے ۔ وہ اس لیے رحیم و کریم، علیم و حکیم، عزیز و قدیر اور ہر عیب و نقص سے منزّہ و پاک ہے کہ حُسن ہے ۔ نیز وہ اس لیے بے مثل و بے نظیر اور وحدہٗ لاشریک ہے کہ حُسن ہے ۔ اس کی ہر تخلیق، ہر بات اور ہر ادا اس لیے حسین ہے کہ وہ حُسن ہے۔ وہ اپنے بندوں پر بے پایاں رحمت اور بے حساب فضل و کرم کرتا، ان کی دُعائیں سُنتا اور قبول کرتا اور بن مانگے بھی انھیں دیتا ہے، کیونکہ وہ حُسن ہے ۔ علاوہ بریں، حُسن ہی لذّت و طمانیت، کیف و سُرور اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان ہے، نیز حُسن ہی جذب و شوق ، حیرت و مستی اور عشق و رحمت ہے ۔ حُسن ہی آرزو، حُسن ہی جانِ آرزو اور وہی ایمانِ آرزو ہے ۔ حُسن ہی صدق ، تقویٰ اور ایمان ہے ۔ حُسن ہی عبادت ، مقصودِ عبادت اور حاصلِ عبادت ہے ۔ اصل یہ ہے کہ

حُسن ہی مقصودِ زندگی، حُسن ہی حاصلِ زندگی، حُسن ہی غایتِ دین اور حُسن ہی تقاضائے فطرت اور حُسن ہی مشیتِ "دوست" ہے۔ حُسن ہی شاہد، حُسن ہی مشہود اور حُسن ہی شہود ہے۔ الغرض حُسن ہی حقیقت اور اصلِ زمان و مکان ہے، اور زندگی کے سارے ہنگامے حُسن ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔ انسان وہ ہے جو صاحبِ حُسن و سُرور ہو، اور اس کی معراج یہ ہے کہ وہ حُسنِ نظر و دید بن جائے، اور دید وہ ہے جو دیدِ "دوست" ہو اور وہ "حُسن" ہے۔

نظامِ حُسنِ الٰہی

طواف کے دوران میں ایک اور انوکھے اور حیرت انگیز تجربے سے گزرا۔ درِ "دوست" کے سامنے سے گزرتا اور اس کو دیدۂ شوق سے دیکھتا تو میرے اندر ایک عجیب سی برقی رَو دوڑ جاتی، جس سے جسم و جاں میں لرزش پیدا ہو جاتی۔ اس برقی رو میں تاثیرِ حُسن تھی۔ حُسن کی تاثیر سے شخصیتِ انسانی میں جمال و جلال اور نور پیدا ہوتا ہے۔

جمال سے انسان میں محبّت الٰہی اور رحمۃ للعالمینؐ کے چشمے پھوٹتے ہیں، جن کے آبِ حیات سے کشتِ زندگی سیراب ہوتی ہے۔

جلال سے دل میں "دوست" کی ہیبت و خشیّت پیدا ہوتی ہے، جن کا حاصل سوز و ساز ہے، جو رُوح کی غذا ہے۔

نُور سے خودی کو بصیرت و زندگی اور حرارت و توانائی ملتی ہے۔

علاوہ ازیں، حُسن میں کشش و جاذبیّت بھی ہوتی ہے، جو ایک طرف دلوں کو آپس میں مربوط اور دوسری جانب انھیں مرکزِ حُسن یا ذاتِ "دوست" سے وابستہ رکھتی ہے۔

میں اپنے اس تجربۂ برقی رَو پر حیران تھا کہ مجھ پر یہ راز آشکارا ہوا کہ بیت اللہ نظامِ شمسی کی طرح "نظامِ حُسن و نور" ہے۔ جس طرح نظامِ شمسی میں سیارے اپنے اپنے

مداروں پر رہ کر اس کے اِرد گرد گردش کرتے اور اس سے اپنی استعداد و بساط کے مطابق رنگ و نُمو اور حرارت و حیات حاصل کرتے ہیں، اُسی طرح بیت اللہ بھی "دوست" کے حُسن و نُور کا مرکز ہے، اور اس کا نزد و دُور سے طواف کرنے والے اہلِ جذب وشوق سیاروں کی طرح اس سے جمال و جلال اور اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ دُور کے اہلِ جذب وشوق کے طواف کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ان کے فکر و نظر کا محور بھی "نظامِ حُسنِ الٰہی" ہی ہوتا ہے، جس کے اِرد گرد وہ دُور رہ کر بھی اپنے اپنے مدارِ زندگی پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ یہ گردش، گردشِ فکر و عمل ہوتی ہے۔ وہ اس نظامِ حُسن کی کشش و جاذبیت کی بدولت اس سے پیوستہ رہتے ہیں۔ وہ اس سے سینکڑوں، ہزاروں میل دُور ہونے کے باوجود اس کی کشش کے دائرے میں رہتے ہیں اور باہر نہیں نکلتے۔ اگر کُرۂ ارضی پر بسنے والی مخلوق سورج سے لاکھوں کروڑوں میل دُور رہ کر سُورج سے روشنی، حرارت اور زندگی حاصل کرتی ہے تو کیا ربِّ جلیل کے نظامِ حُسن سے انسان سینکڑوں، ہزاروں میل دُور رہ کر حُسن و نُور اور حرارت و زندگی حاصل نہیں کر سکتا؟ وہ یقیناً ایسا کر سکتا اور کرتا رہا ہے، بلکہ اب بھی کر رہا ہے۔ اس کے لیے بس شرط یہ ہے کہ انسان اس کے نظام میں آجائے، اور اس کا مدارِ زندگی اس کے مدار کے گرد گھومتا رہے۔ اصل یہ ہے کہ "دوست" کا گھر جہانِ قلب و رُوح کے لیے ایٹمی گھر سے کہیں زیادہ نور و توانائی کا لامتناہی خزینہ ہے، لیکن اس خزینے سے وہ اہلِ جذب وشوق ہی حُسن و نُور اور زندگی و توانائی حاصل کرتے ہیں، جو اس سے پیوستہ رہتے اور اس کا طواف کرتے رہتے ہیں۔

وفاداری بشرطِ اُستواری

طواف کی طرح سعی کا تجربہ بھی دلگداز و ایمان انگیز اور بصیرت افروز و حکمت آموز تھا۔ پیکرِ صدق و وفا اور موحدِ اعظم سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ طیبہ "وفاداری بشرطِ اُستواری"

کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ سعی کے تجربے سے مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ

وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایمان ہے

توحید کے اس مبلغِ اعظمؑ نے شرک و بُت پرستی کی ظلمتوں میں شمعِ توحید فروزاں کرنے اور انسان کو اس کے حقیقی الٰہ و ربّ سے ملانے کی خاطر اتنی اور ایسی عظیم قربانیاں دیں کہ تاریخ ان کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ میں وارفتگی و شیفتگی کے عالم میں سعی میں محو تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے عالمِ زمان و مکان بدل گیا ہے اور میں ماضی کے ایسے دَور میں پہنچ گیا ہوں جس میں ایک مُشرک و بُت پرست اور ظالم و مستبد بادشاہ کی حکومت تھی، جس کا نام نمرود تھا۔ رعایا اُسے خُدا کا اوتار، اور اس کے حُکم کو فرمانِ الٰہی سمجھتی اور بتوں کی طرح اس کی پُوجا کرتی تھی۔ اُن کی دُنیا میں توحید کی روشنی تھی نہ ایمان کا اُجالا۔ انسانیت شرک و بُت پرستی اور ظلم و گناہ کے اندھیرے میں سرگرداں اور خوف و حزن کی آتشِ خاموش میں جل رہی تھی۔ انسان لذّتِ ایمان و خود آگاہی سے ناآشنا، طمانیت و سکینت سے محروم اور اپنے حقیقی الٰہ و ربّ سے مہجور و دُور تھا۔ ہر جگہ شرک و بُت پرستی کا چرچا اور ہر گھر اور معبد بُت خانہ تھا۔ ایسا ہی ایک گھرانہ ایک بُت ساز و بُت پرست پروہت کا تھا، جس کا نام آزر تھا۔

آزر اور حضرت ابراہیمؑ

آزر کا ایک بیٹا یا بھتیجا جس کا نام ابراہیمؑ تھا۔ صدق و صفا اور حُسنِ خُلق میں یگانۂ روزگار تھا۔ وہ طبعًا توحید پرست تھا اور اُسے بچپن ہی سے شرک و بُت پرستی سے سخت نفرت تھی۔ وہ اسے ظلمِ عظیم سمجھتا اور جہلِ انسانی پر محمول کرتا اور اپنے اس عقیدے کا برملا اظہار بھی کرتا تھا۔ اپنے اور بیگانے سب اُس سے نالاں تھے، لیکن اُس کی حکیمانہ حق بیانی کے سامنے بے بس تھے۔ وہ اُسے حق پر جانتے تھے، مگر مانتے نہیں تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ابلیس کے جمالیاتی فریب نے انھیں ظالم و جاہل، متکبر و حق ناآشنا بنا دیا تھا۔ آپؑ نے شرک و بُت پرستی کا طلسم پاش پاش کرنے کی خاطر شہر کے سب سے بڑے صنم کدے کے بُتوں کو توڑا، اور ان کی بے زبانی و بے بسی کی حقیقت

لوگوں پر آشکارا کرنے کے لیے سب سے بڑے بُت کو چھوڑ دیا، پھر اپنے وحدہٗ لاشریک اِلٰہ و ربّ کی قدرت کا اعجاز دکھانے کی خاطر بُت شکنی کے جُرم میں آتشِ نمرود میں کُود گئے۔ آپؑ صاحبِ حُسن و سُرور تھے۔ آگ اللّٰہ تعالیٰ کے حُکم سے آپؑ کے جسم و جاں کے لیے سُرور انگیز ٹھنڈک بن گئی، لیکن مُشرک و بُت پرست جو اہلِ نار تھے، سینکڑوں کی تعداد میں اس آگ میں جل گئے۔

ہجرت حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے اِلٰہ کی محبّت میں باپ، گھر اور وطن کو چھوڑا اور ہجرت کر کے دُور نکل گئے۔ دشت نوردی اور جہاں گردی آپؑ کا مقدّر بن گئی۔ یاس کی عمر یعنی بڑھاپے میں اللّٰہ تعالیٰ نے چاند سا بیٹا دیا تو "دوست" کے اشارے پر اُسے یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اور اپنی وفا شعار رفیقۂ حیات اُمّ المومنین حضرت ہاجرہؓ کو لے کر مکّہ مکرّمہ کی سُنسان، سنگلاخ اور بے آب و گیاہ وادی میں آئے۔ زندگی سے نا آشنا یہ وادی، اس وقت "وادیٔ موت" تھی۔ "دوست" کو دوست کا امتحانِ عشق و وفا مقصود تھا۔ اس کا حکم ہوا " اپنی تسکینِ زندگی (بیوی) اور قرّۃ العین (فرزند) کو چھوڑ کر اپنے مشن پر چلے جاؤ"۔ عشق و وفا کا یہ امتحان روح فرسا و شکیب رُبا تھا، لیکن "دوست" کی یہ رضا تھی، لہٰذا وہ پیکرِ تسلیم و رضا انھیں وادیٔ موت میں بظاہر بے آسرا اور بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے۔ آپؑ کو بھروسا تھا تو اپنے اِلٰہ کا۔ توکّل و یقین ہو تو آپؑ جیسا، اور اطاعت و فرماں برداری ہو تو آپؑ کی شریکِ حیات جیسی، جو آپؑ کی طرح پیکرِ تسلیم و رضا تھیں، اور جنھوں نے بغیر حیل و حجت اپنے نوزائیدہ اکلوتے بیٹے کے ساتھ تنہا اُس سُنسان "موت کی وادی" میں رہنا قبول کر لیا تھا، جسے باپ، بیٹے اور بیوی کی "وفاداری بشرطِ اُستواری" کی بدولت وادیٔ حیات اور امن و سلامتی کی جنّت بننا تھا۔

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم اِدھر وہ پیکرِ صدق و اخلاص امتحانِ عشق و وفا کے پُل صراط پر سے گزر کر رُخصت ہو گئے، اُدھر ننّھا پیغمبر زادہ ۴

گرمی اور پیاس کی شدّت سے بلکنے اور تڑپنے لگا۔ مامتا یہ روح فرسا و شکیب رُبا نظارہ دیکھ کر تڑپ اُٹھی۔ بچّے کو چٹان پر لٹا کر خود پانی تلاش کرنے لگی۔ وہ خود بھی تشنہ کام و بے قرار تھی، لیکن اُس وقت اُسے اپنی تشنہ کامی کا نہیں، اپنے لختِ جگر کی تشنگی کا احساس و کرب تھا۔ اُس کا کرب، ماں کا کرب اور اس کی بے قراری، مامتا کی بے قراری تھی۔ وہ پانی کی تلاش و جستجو میں تپتے صحرا میں برہنہ پا خاک چھاننے لگی۔ کبھی بے تابانہ کوہِ صفا پر چڑھتی، چاروں طرف نگاہ دوڑاتی، پانی دکھائی نہ دیتا تو پہاڑی سے اُترتی، دوڑتی، پھر نڈھال ہو کر چلنے لگتی اور کوہِ مروہ پر چڑھ جاتی۔ اس کی چوٹی پر پہنچ کر اُمید کی نظروں سے چاروں طرف دیکھتی۔ اس کی نظریں ہر بار اور ہر مقام پر ناکام لوٹتیں، لیکن وہ مایوس نہ ہوتی۔ بار بار کی ناکامی بھی نہ تو اُس کے توکّل کو متزلزل کر سکی اور نہ اس کی شمعِ اُمید بجھا سکی۔ مامتا سے لختِ جگر کی حالتِ زار دیکھی نہ جاتی تھی اور رحمتِ الٰہی سے مامتا اور بچّے دونوں کی بے قراری دیکھی نہ گئی۔ ماں امتحانِ صبر و توکّل میں کامیاب گزر رہی تھی کہ ربِّ رحیم کی رحمت کا دریائے بیکراں جوش میں آیا اور اُس نے اس چٹان سے، جہاں پیغمبر زادہ تڑپتا اور ایڑیاں رگڑتا تھا، چشمۂ رحمت جاری کر دیا، جس کا پانی میٹھا اور ٹھنڈا ہے۔ اس چشمے سے نہ صرف بچّے اور ماں کی پیاس بجھی اور بجھتی رہی، بلکہ اس کے آبِ حیات سے وہاں زندگی نمودار ہو گئی۔ انسانوں، حیوانوں اور چرند و پرند سے وہ "وادیِ موت" "معمورۂ حیات بن گئی۔ آبِ زمزم صدیوں سے تشنہ کامانِ محبت کی پیاس بجھاتا رہا ہے اور ہمیشہ بجھاتا رہے گا۔

امتحانِ تسلیم و رضا

اس وارثِ آبِ زمزم بچّے کی خوش نصیبی و ارجمندی اور عظمت و علوِ مرتبت کا اندازہ قدرے اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل (دوست) اور جلیل القدر نبی و رسول حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے وارثِ نبوّت و رسالت اور ربِّ جمیل و جلیل کے حبیب (دوست) اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مورثِ اعلیٰ اور ذبیح اللہ یا شہیدِ "دوست"

تھے۔ اس وادیِ عشق و وفا میں آپؑ اور آپؑ کے باپ اور ماں کا پھر امتحانِ تسلیم و رضا ہوا۔ باپ کو اشارہ ہوا کہ اپنے حسین و صالح بیٹے کو "دوست" کی قربان گاہ پر اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالو، تو آپؑ نے سرِ تسلیم و رضا خم کر دیا اور اپنا لختِ جگر قربان کرنے پر کمربستہ ہوگئے۔ باپ نے بیٹے کو "دوست" کی بات بتائی تو اُس نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا اور "دوست" پر قربان ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔ ماں نے سُنا تو اُس نے کلیجے پر صبر کا پتھر رکھ کر پہلے اپنی مامتا کو قربان کیا اور پھر اپنے لختِ جگر کو بنا سنوار کر قربان ہونے کے لیے اُس کے باپ کے سپرد کر دیا۔ ان تینوں نفوسِ طیبہ اور اہلِ عشق و وفا نے تسلیم و رضا، صبر و استقامت اور ایثار و قربانی کی ایسی مثال قائم کر دی کہ چشمِ فلک نے پہلے کبھی دیکھی نہ تھی اور شاید پھر کبھی اُس کے دیکھنے میں نہ آئے۔

شیطان کی ناکام کوششیں

دوست کی قربان گاہ، مکّہ مکرّمہ کی بستی سے دُور، منیٰ کے ویرانے میں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو لے کر اس کے قریب پہنچے تو حریفِ آدم شیطان نے دوست بن کر ورغلانے کی کوشش کی۔ اور تاویل و دلیل، پند و نصائح اور چرب زبانی سے ان دونوں کے ارادے متزلزل کرنے کے جتن کیے۔ ابلیس چونکہ اللہ تعالیٰ کی محبّت میں انسان کے ایثار و قربانی اور اس کی عبودیّت کی رفعت و کمال کے اس نظّارے کا حریف نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے اُس نے تین بار انھیں اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کی سعی کی، لیکن ہر بار ناکام و نامراد رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ دل میں صدق و یقین اور آنکھوں میں حُسن و نُور ہو تو شیطنت بے نقاب ہو ہی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اس کے بعد تاخیر نہ کی اور اپنے لختِ جگر کو وہاں زمین پر لٹا دیا، لیکن اوندھے منہ تاکہ کہیں آنکھوں سے آنکھیں ملنے سے دل میں محبّت کا چشمہ نہ اُبل پڑے اور نتیجۃً ارادے میں تزلزل اور ہاتھ میں لغزش نہ آجائے۔ پھر اللہ کا نام

لے کر آنکھیں بند کر لیں اور بیٹے کے گلے پر پورے زور سے چھری چلا دی۔ اس طرح عشق و وفا کے شکیب رُبا امتحان سے کامیاب گزر گئے۔ "دوست" کو تو فقط اپنے دوست کا امتحان مقصود تھا نہ کہ اس کے لختِ جگر کا خون۔ لہٰذا چھری چلی تو بیٹے پر، لیکن ذبح کر گئی دُنبے کو، جو "دوست" کے اشارے پر ان کی جگہ رکھ دیا گیا تھا۔

اِنسانیت کی فتح اور شیطنت کی شکست کی خوشی میں ربِ جلیل کی مشیت یہ ہوئی کہ ہر سال اس واقعہ کی یاد منائی جائے اور تینوں مقامات پر، جہاں شیطان ظاہر ہوا تھا، اس کے جمروں پر علامتی سنگباری کی جائے۔

سعی کے دوران اس مشاہدے سے اس حقیقت کا عین الیقین ہو گیا کہ واقعی ؏

وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے

کڑی : ۷

حریمِ "دوست" میں دو یادگار نمازیں

(دو ناقابلِ فراموش تجربے)

حریمِ "دوست" میں پہلی نمازِ تہجد

ہم عمرہ کرکے ہوٹل پہنچے تو آدھی رات بیت چکی تھی۔ حرم شریف بیدار اور دُنیا سوئی ہوئی تھی۔ اہلِ دُنیا کے شبستانوں میں چراغ گُل اور اندھیرا تھا، لیکن حریمِ "دوست" میں حُسن و نُور کی شمعیں روشن تھیں۔ اہلِ دُنیا آغوشِ خواب میں محوِ استراحت تھے، لیکن اہلِ جذب و شوق طواف و سعی میں محو اپنے اللہ کے قُرب و حضوری کے مزے لُوٹ رہے تھے۔ اہلِ دُنیا اپنی خواہشات کے خواب دیکھ رہے تھے، جبکہ اہلِ نظر حُسنِ "دوست" کا نظارہ کر رہے تھے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ حُسنِ "دوست" ہی عالمِ زمان و مکان کی حقیقت، حیات و رحمت کا سرچشمہ اور اصلِ شہود و شاہد و مشہود ہے۔

اگرچہ میرا جسم سفرِ مسلسل اور عمرے کی تکان اور بیماریِ دل کی وجہ سے نڈھال تھا، لیکن روح شاداں و فرحاں اور تازہ دم تھی۔ اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، کیونکہ ایک تو اُسے عمرے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، دوسرے وہ "دوست" کی نگری میں تھی، اور تیسرے اس نگری میں اس کی پہلی رات تھی۔ پیا کی نگری میں پہلی رات کی حقیقت وہی اہلِ محبت جانتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ یہ رات میرے لیے شبِ عید سے زیادہ عزیز و مسرت انگیز اور شبِ قدر سے زیادہ محبوب و مبارک تھی۔ میرے اندر سچی خوشی کی ایک پُرکیف ترنگ تھی اور مجھ پہ ایک عجیب کیفیتِ سرخوشی طاری تھی۔ میرے جذبات و

احساسات کی دُنیا میں ایک حسین انقلاب آچکا تھا۔ روح تشکّر و امتنان کے جذبات سے سرشار "دوست" پر فدا ہوئی جا رہی تھی۔ اس عالم میں سونے کے لیے بستر پر لیٹا اور معمول کے مطابق ذکرِ "دوست" کا وظیفہ ختم کیا ہی تھا کہ عروسِ خواب نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

آنکھ لگی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی نے بیدار کر دیا۔ ریسیور اُٹھایا تو ہوٹل کے منیجر کی آواز آئی "صاحب، تہجّد کی اذان ہو رہی ہے۔" اُس کی آواز نویدِ عید کی طرح فردوسِ گوش تھی۔ اذان کی آواز صاف آ رہی تھی۔ ہم زندگی میں پہلی مرتبہ "دوست" کی نگری میں تہجّد کی اذان سُن رہے تھے، جو حریمِ "دوست" سے آ رہی تھی۔ اس میں "دوست" کا پیام اور بلاوا تھا۔ وہ اس کے قرب و حضوری کی دعوتِ عام بھی تھی اور اس کے گھر میں دولتِ دل لُوٹنے کی صلائے عام بھی۔ اذان ایک ملکوتی نغمہ تھی، جس میں صدائے "کُن" کی رُوح تھی، جو قلب و رُوح کو زندہ و بیدار کر گئی۔ ہم نے جلدی سے وضو کیا اور حرم شریف چل دیے۔

"دوست" کی نگری کے کوچہ و بازار سُنسان تھے۔ اور ان میں زندگی محوِ خواب تھی، لیکن "اُس" کے گھر میں زندگی کے ہنگامے دیدنی تھے۔ حرم شریف کے روشن مینار رات کی تاریکی میں قابلِ دید تھے۔ وہ "دوست" کی راہ و منزل ڈھونڈنے والوں کے لیے روشنی کے مینار تھے۔ وہ ایمان و توحید اور عرفان و معرفت کے روشن نشان تھے۔ تابندہ و درخشاں اور خاموش و پُرشکوہ مینار حریمِ "دوست" کے پاسبان تھے، اس لیے اہلِ جذب و شوق کے معروضِ محبت اور اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ ہم بابِ الہجرت سے حرم شریف میں داخل ہوئے تو وہاں نظّارہ کچھ اور ہی تھا۔ وہاں زندگی بیدار و فعّال اور "حُسن" جلوہ فروش اور عشق شاہد و شاد کام تھا۔ وہاں آرزوئے "دوست" جلوہ سامان تھی اور "دوست" مشہود بھی تھا اور شاہد بھی۔ "دوست" کا گھر زندہ و بیدار اور پُراسرار بندوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ پُراسرار بندے کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ یہ سوال تیرِ نیم کش کی طرح میرے دل

میں پیوست رہا اور کبھی نہ نکلا۔ بہر حال، آخر شب اُن کی تڑپ کا نظارہ بڑا ہی رقت انگیز اور ایمان افروز تھا۔

پچھلے پہر حرم شریف کا منظر اہلِ نظر کے لیے دیدنی تھا۔ اُوپر آسمان چاند اور تاروں سے مزیّن تھا۔ چاند کسی عاشقِ صادق کے دیدۂ حیران کی طرح جلوہ گاہِ "دوست" کو تکتا دکھائی دیتا تھا۔ تاروں کی چشمک زنی بھی اس امر کی چغلی کھاتی تھی کہ وہ بھی اس کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اس کی فضا میں بے معلوم سے متحرک سائے اس حقیقت کے غماز تھے کہ وہ فرشتوں کی جولان گاہ ہے۔ اس میں نُور کی "برفباری" ہو رہی تھی، اور مشکبار و جانفزا نسیم "دوست" کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے مشامِ جان کو معطّر اور جسم و دل کو ٹھنڈک پہنچا رہے تھے، اور اس ٹھنڈک کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ اس میں راحت و طمانیت بھی تھی اور سرخوشی و فرحت بھی، اس میں کیف و سُرور بھی تھا اور جانفزائی و دلآویزی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی پُر بہار، سہانا اور مقدّس و رُوح پرور سماں تھا۔

صلۂ شہیدِ محبت

بیگم نے عورتوں کے لیے مخصوص دالان میں اور میں نے خانۂ کعبہ کے قریب مطاف میں نماز پڑھی۔ حرم شریف میں یہ ہماری پہلی نمازِ تہجد تھی۔ یہ "دوست" کا فیضان اور اس کے مبارک گھر کی برکت تھی کہ پہلی ہی رکعت میں "احسان" کی سعادت میسّر آگئی اور میں نے اپنے آپ کو مقامِ شاہدیّت پر متمکّن پایا۔ "دوست" اپنے جمال و جلال کی رعنائیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ چشمِ مشتاق کے سامنے جلوہ افروز ہو، اور نظر مسحور و تشنہ کامِ محبّت کی ہو، پھر رُوح شہیدِ نظارہ کیوں نہ ہو؟ رُوح گھائل بھی ہوئی اور شہید بھی۔ صلۂ شہیدِ محبّت یہ تھا کہ ہر گھاؤ سے دل میں ایک چشمۂ مسرّت پھوٹتا اور ہر شہادت سے ایک نئی زندگی ملتی، حسین و سرمدی زندگی۔ یہ تجربہ جتنا انوکھا اور حیرت انگیز تھا، اُتنا ہی سُرور انگیز و مسحُور کُن بھی تھا۔ "دوست" مشہود اور رُوح شاہد ہو تو نمازیں واقعی آنکھوں کی ٹھنڈک (قرّۃُ العین) ہوتی ہے۔

نظرِ محبت کا اجر

اہلِ جذب و شوق کے لیے "دوست" کا گھر معروضِ محبت، آنکھوں کی ٹھنڈک اور رُوح کا سُرور ہے۔ انھیں ہر نظرِ محبت کا اجر ارمغانِ سوز و ساز کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ بھی فیضانِ "دوست" تھا کہ میں جب تک اس کے حرمِ پاک میں رہتا، اُس کے حُسن المآب اور اپنے معروضِ محبت کو دیکھتا رہتا، "دوست" دولتِ حُسن و سُرور لُٹاتا رہتا اور میں لُوٹتا رہتا۔ میرا ظرف تنگ تھا، کشادہ ہوتا رہا، میری نظر کے حُسن و نُور کی تکمیل ہوتی رہی اور ہر کمال دُوسرے کمال کا نقطۂ آغاز بنتا رہا۔ تجربہ ہوا کہ "دوست" کی رحمت لامحدود اور اس کی سخاوت بے پایاں ہے۔

حرم شریف میں نمازِ جمعہ

رات شب قدر تھی تو دن روزِ عید تھا، کیونکہ وہ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور ہمیں حرمِ "دوست" میں ہزاروں اہلِ جذب و شوق کے ساتھ نمازِ جمعہ پڑھنے کی سعادت ملنے والی تھی۔ ہم نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے، عطر لگایا اور چاشت ہی کے وقت مسجد الحرام میں پہنچ گئے۔ خیال تھا کہ ہم "سابقون" میں سے ہوں گے، لیکن یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ حرم شریف اللہ تعالیٰ کے بندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں زاہدِ شب بیدار بھی تھے اور اہلِ جذب و شوق بھی، آتش بجان و آشفتہ سر بھی تھے اور اہلِ حُسن و سُرور بھی، تشنہ کامانِ دید بھی تھے اور اہلِ دید و نظر بھی۔ اہلِ خرد بھی تھے اور صاحبِ جنوں بھی۔ ان میں قتیلِ محبت بھی تھے اور کشتگانِ خنجرِ تسلیم بھی، اہلِ فقر و غنا بھی تھے اور اہلِ علم و فضل بھی۔ ان میں "اُس" کے مقرب و دوست بھی تھے اور تازہ واردانِ شوق بھی۔ علاوہ ازیں پُراسرار ہستیاں بھی تھیں، جن میں سے کچھ شعلہ رُخ تھیں اور بعض کے بُشرے نورانی تھے۔ وہ سب اللہ کے بندے طواف و سعی، نماز و تلاوت اور ذکر و فکر میں مشغول تھے۔ لیکن اُن آبلہ پا اہلِ جذب و شوق کا اندازِ جنوں دیدنی تھا جو تمازتِ آفتاب میں ننگے سر، ننگے پاؤں، تپتے فرش پر "دوست" کے گھر کا طواف کر رہے تھے۔ انھیں تمازتِ تن سوزی کی پروا تھی نہ فرشِ پاسوز کی، اپنی

سرسوزی کا خیال تھا نہ آبلہ پائی کا۔ ان کے لیے ہر زخم، زخمِ محبّت اور ارمغانِ "دوست" تھا، اس لیے وہ جان سے زیادہ گراں بہا تھا۔

میں بھی "دوست" کے دیوانوں میں شامل ہو گیا، اور اپنے معروضِ محبّت خانۂ "دوست" کے گرد گھومنے لگا۔ سب اس والہانہ انداز میں طواف کر رہے تھے، جیسے کوئی اہلِ مہر و وفا اپنی جانِ محبّت پر قربان ہو جانے کے لیے اس کے گرد گھوم رہا ہو۔ دھوپ سے جسم جلتا رہا، لیکن روح کو آسودگی ملتی رہی۔ پاؤں میں آبلے پڑتے اور پھٹتے رہے، زخموں سے خون رِستا رہا، لیکن گلزارِ دل میں خوشیوں کے شگوفے پھوٹتے اور کھلتے رہے۔ دھوپ سر کو جلاتی اور آشفتہ کرتی رہی، مگر "دوست" کے گھر کے نظارے سے میرے نور کی نشو و نما اور تکمیل ہوتی رہی۔ دل کے کیف و سرور کے ساتھ اس کا درد و سوز بھی بڑھتا گیا۔ جلوۂ "دوست" سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی رہی اور روحِ شوقِ دید میں نظر بن بن کر شہیدِ نظّارہ ہوتی رہی، اور خونِ دل و جاں سے آنکھوں سے خوں فشانی ہوتی رہی۔ لبوں سے آہ و فغاں کا دھواں اٹھتا رہا، اور مجھے تن من کا ہوش نہ رہا۔ اس حال میں نہ اپنا زخمِ دل یاد آیا اور نہ انجائنا (ENGINA) کے درد نے بے حال کیا، بلکہ میں ایک ایسے عالم میں پہنچ گیا جہاں خود فراموشی بھی تھی اور خود آگاہی بھی، جہاں صرف "میں" تھا اور میرا "دوست"۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں صرف "دوست" ہی تھا اور "میں" محض احساس و شعور اور دید و نظر تھا۔

در و دیوارِ "دوست"

میں اس عالمِ سوز و مستی میں جاں سپاری و فداکاری کے تجربے سے گزر رہا تھا کہ اَللّٰہُ اَکْبَرْ کی صدائے جلیل و دل نشین نے مضراب کی طرح سازِ دل کے تاروں کو چھیڑ دیا، ایک نعرۂ حق ہو بلند ہوا اور میں اپنی ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا۔ حسنِ اتفاق سے نہیں، "دوست" کی نظرِ کرم سے نماز پڑھنے کے لیے مجھے دیوارِ "دوست" کے نیچے جگہ مل گئی۔ اس کا سایہ گویا "دوست"

کا سایہ تھا۔ اس میں "دوست" کی بوئے عنبر فشاں تھی۔ نہیں، وہ ایسی خوشبو تھی کہ ہزاروں مشک و عنبر اور گل و سمن کی خوشبوؤں کو اُس پر قربان کر دیا جائے۔ وہ حُسن کی رُوح اور کیف و سُرور کا جوہر تھی۔ اس کی مہک سے روح مسحور ہو گئی۔ سایۂ "دوست" سایۂ رحمت و عاطفت تھا، وہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور راحتِ قلب و جاں تھا۔ میرے سامنے درِ "دوست" تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ میرا ناظورِ جاں اور جانِ آرزو ہے۔ نظر اس پر پڑی تو وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ یہ خیال برقِ حُسن بن کر دل پر گرا کہ یہ میرے ہادی و مسیحا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی گزرگاہ ہے۔ یہاں سے آپؐ کے جدِّ امجد حضرت اسماعیل علیہ السّلام اور اُن کے والدِ ماجد سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام بھی "دوست" کے گھر میں آتے جاتے تھے۔ یہ آپؐ کے جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی گزرگاہ تھی۔ دل للچایا کہ اُس پر آنکھیں بچھاؤں اور اُسے چُومتا ہی رہوں۔ میں درِ "دوست" کو دیکھتے دیکھتے دیدۂ شوق و حیراں بن گیا۔ ایسا بننا تھا کہ "دوست" کا فیضانِ نظر ہوا، اور اُس نے صدیوں پُرانے واقعات و مناظر کی تصویرِ متحرک دکھانا شروع کر دی۔ میں نے سب سے پہلے پیکرِ صدق و وفا حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور پھر مجسمۂ تسلیم و رضا اور قتیلِ "دوست" حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السّلام اور آخر میں پیکرِ حُسن و نُور حضرت محمد حبیب اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو اپنے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ "دوست" کے بیتِ حُسن و نُور میں تشریف لاتے اور لے جاتے دیکھا۔ یہ سب حُسن و نُور کے آفتاب و ماہتاب اور روشن تارے تھے، جو شبستانِ "دوست" میں جلوہ افروز و محوِ خرام تھے۔ شبستانِ "دوست" رشکِ فردوسِ بریں ہی نہیں، رشکِ عرشِ مُنیر بھی تھا۔ وہ حُسن و سُرور، رنگ و نُور اور صورت و حیات کا مقدس حیرت کدہ تھا۔ جہاں "دوست" حُسن فشاں اور اس کے دوستانِ خاص جلوہ افروز ہوں، وہ جگہ کیا اور اس کا مقام کیا ہو گا! اس کی عظمت و رفعت کا اندازہ عقل و فکر نہیں کر سکتی، نیز "دوست" کی نظرِ کرم کے بغیر نظر بھی اس کی حریفِ نظارہ نہیں

ہو سکتی۔ میں ماضی کے ان فردوسی نظاروں میں گم تھا کہ خطبے کی اذان نے چونکا دیا۔

امامِ حرم نے خطبہ دیا جو مختصر تھا۔ پھر تکبیر پڑھی گئی۔ بیت اللہ کے چاروں طرف صفیں قائم ہوئیں۔ حرم شریف کی نچلی اور بالائی منزلیں نمازیوں سے بھرپور تھیں۔ سعی و طواف کا سلسلہ وقتی طور پر بند ہو گیا۔ مجھے وجدانی طور سے محسوس ہوا کہ جیسے "دوست" کے گھر کے ارد گرد اور میرے دائیں بائیں جانب کوئی غیر مرئی مخلوق بھی صفوں میں شامل ہے۔ دفعتاً حرم شریف کی فضا میں ایسا سکوت چھا گیا جیسے زندگی کی زبان، زبانِ حال بن گئی ہو۔ یہ خاموشی لمحاتی ہونے کے باوجود پُراسرار و معنی خیز تھی۔ "دوست" کی جلالت و عظمت اور عزت و کبریائی کے سامنے زندگی دم بخود ہو گئی تھی۔ اس کے بندے اس کے حضور نفس گم کردہ قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ جلالِ "دوست" کے احساس سے ایک لرزشِ خفی میرے سارے بدن میں تھی۔ اس سکوتِ پُراسرار کو حُسنِ قرأت نے توڑا۔ "دوست" کے حُسنِ کلام کے ہر جملے میں تاثیر برقِ حسن تھی، جو دل کو حُسن و سُرور سے سرشار کر دیتی۔ "دوست" کا کلام اُس کے گھر میں اُس کے بندوں کے درمیان پڑھا جا رہا تھا اور "دوست" حُسن کا سرچشمہ، اس کا کلام حُسن و نور، اس کا گھر ممورۂ حُسن و نور اور اس کے بندے اہلِ حُسن و سُرور تھے، تو پھر قرأت برقِ حُسن بن کر دلوں پہ نہ گرتی اور شکیب رُبا نہ ہوتی، یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ دل درد و سوز سے گداز ہو گیا، رُوح "دوست" کا کلام سُنتے اور پہچانتے ہی دید و وصال کے لیے بے قرار ہو گئی، محبت کی آتشِ خاموش شعلہ زن ہو گئی۔ "دوست" سے شاید رُوح کی بے قراری دیکھی نہ گئی، وہ اپنی صورتِ مجاز میں اُس پر جلوہ فگن ہو گیا، رُوح اُس کی بلائیں لینے لگی اور اس کی خوشیوں کا دریا اُمنڈ کر آنکھوں سے بہنے لگا۔

"دوست" کے گھر میں ہزاروں اہلِ جذب و شوق کے سوزِ دروں سے ایسی تب و تاب ملی کہ پہلے نہ ملی تھی۔ یہ تب و تاب کیا تھی؟ سوز و مستی کی رُوح،

کیف و سُرور کا جوہر اور حیات و عبادت کا ثمرہ تھی۔ نماز ختم ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ میرا نفس کسی بارِ گراں سے آزاد اور جملہ آلودگیوں سے پاک، و صاف ہو گیا ہے، اور میں صاحبِ دید و نظر اور اہلِ حُسن و سُرور بن گیا ہوں۔ میں اپنے اس مشاہدے، واردات اور تجربے کو ارمغانِ "دوست"، متاعِ حیات اور دولتِ دل نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں؟

کڑی : ۸

حریمِ "دوست" عالمِ جذب و شوق میں

حریمِ "دوست" دیکھنے کے لیے دل جذب و شوق سے معمور اور نظر حُسنِ "دوست" سے آشنا ہونی چاہیے۔ اہلِ جذب و شوق کے لیے حریمِ "دوست" جنّتِ محبّت، نا ظورۂ حیات اور فردوسِ نظر ہے۔ اس کا ہر مقام، مقامِ عشق و مستی ہے۔ وہاں عشّاق پر کیا گزرتی ہے؟ اُسے وہی رہ نوردانِ شوق جانتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں، اور اس تجربے سے وہی گزرتے ہیں جن کو "دوست" گزارنا چاہتا ہو، ورنہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس بندۂ ناچیز اور فقیرِ بے نوا پر بھی "دوست" کی نظرِ لطف و کرم ہوئی، اور میں بھی حرم شریف کے مقاماتِ عشق و مستی پر ان تجربات سے گزرا۔ تجربات ماورائی ہوں تو انھیں اپنی زبان میں بیان کیسے کیا جا سکتا ہے؟ لیکن اگر "دوست" کی رضا ہی ہو کہ انھیں اپنی زبان میں بیان کردوں تو پھر انکار کی تاب و مجال کیسے ہو سکتی ہے؟ لٰہذا:

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

حجرِ اسود یا ارمغانِ "دوست"

سب سے پہلے مجھے حجرِ اسود سے متعلق کچھ کہنا ہے۔ وہ کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ یہ تو "وہی" جانتا ہے جس کے گھر میں وہ نصب ہے۔ اسے جنّت کی مقدّس و بصیرت افروز یادگار ماننے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن یہ "دوست" کی نشانی اور ارمغانِ محبّت ہے، ان کے لیے جو اہلِ جذب و شوق اور صاحبِ نظر ہیں۔ حجرِ اسود عُشّاق

کی طرح خود بھی غمِ فراق "دوست" میں سوختہ دل ہے، اس لیے گوہرِ سفید و تابدار سے سنگِ سیاہ بن کر مقدّس و محبُوب اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن گیا۔ یہ ہمیشہ سے اہلِ جذب و شوق اور اصحابِ حُسن و نظر کا معروضِ محبّت اور آماجگاہِ لب و نظر رہا ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

میری نظرِ شوق اُس پر پڑتی تو فدا ہو جانے کے لیے بے قرار ہو جاتی اور دل اُسے چُوم لینے کے لیے تڑپ اُٹھتا۔ وہاں اہلِ جذب و شوق کا ہجوم ہوتا، لیکن بیماریِ دل میں مبتلا ہو جانے کے باوجود میں اضطرابِ شوق میں ہجوم میں شامل ہو جاتا۔ "دوست" کو، وہی جانے، میری کون سی چیز پسند تھی کہ مجھے ہر بار حجرِ اسود چُومنے کی سعادت حاصل ہو جاتی۔ شاید یہ میری جراحتِ دل تھی یا دلِ بسمل کی تڑپ، یہ میری آہ و فغاں تھی یا چشمِ شوق کی خونناب فشانی۔ نہیں یہ "اُس" کی نظرِ کرم تھی اور رحمت کی ارزانی کہ میں بار بار "دوست" کی نشانی کے لمس و بوس کی لذّت سے آشنا ہوتا رہا۔ دیکھنے میں یہ بے شک سیاہ پتّھر ہے، لیکن حقیقت میں وہ "دوست" کی نشانی ہے، جس کی قدر و قیمت نگاہِ عشق و مستی میں نایاب و بیش بہا لعل و گوہر کے خزینے سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اسے انبیاء و رُسل علیہم السّلام نے چُوما ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے حبیب اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے لبِ مبارک کے لمس کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ نیچے آئیں تو اسے صحابۂ کرام رضی نے بوسہ دیا ہے، اسے صِدّیقین، شُہدآء اور صالحین نے چُوما ہے۔ خُدا جانے کتنے اولیآءِ اللہ، اہلِ جذب و شوق، اصحابِ حُسن و سُرور اور اہلِ فقر و دید کے مبارک ہونٹ اس سے لگے ہیں۔ میں جب بھی "دوست" کے "سیاہ ہیرے" کا بوسہ لیتا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں ان سب برگزیدہ ہستیوں کے مبارک لبوں کو چوم رہا ہوں۔ اس سے ایک ایسی ناقابلِ بیان سُرور آگین و سحر انگیز لذّت ملتی کہ روح پر وجد و حال کی کیفیّت طاری ہو جاتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب مجھے یہ خیال آتا کہ ربِّ جلیل کی اس

سیاہ رنگ کی فردوسی نشانی کو میرے آقا و مسیحا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے بھی چوما ہے تو میں بے اختیار اس کی طرف بڑھتا، اسے چومتا اور ہاتھوں اور آنکھوں سے چھوتا تو روح فرطِ سُرور و مستی سے جھُوم اُٹھتی، دل حُسن و سُرور سے معمور و منوّر اور جذب و شوق میں اضافہ ہو جاتا۔ عشّاق کی طرح میں بھی والہانہ انداز میں چکّر لگاتا، مناجات پڑھتا اور دعائیں مانگتا رہا۔ مجھے تن من اور دنیا و مافیہا کا ہوش نہ تھا۔ ہوش تھا تو اس بات کا کہ میں اپنے اللہ و رب کے حضور حاضر ہوں اور اس کے حکم کے مطابق اس کے گھر کا طواف کر رہا ہوں۔

میں دل کا مریض تھا، اس لیے چلنے پھرنے سے قریب قریب معذور تھا۔ اطبا نے طواف کرنے سے منع کیا تھا، لیکن اپنے اللہ کے گھر کو دیکھتے ہی دل کو اپنی جراحت و بیماری کا خیال تک نہ رہا۔ مجھے طواف کے دوران خیال تک نہ آیا کہ میں دل کا مریض ہُوں۔ والہانہ انداز میں طواف کرتا رہا، حجرِ اسود کو چومتا اور اپنے اللہ کے گھر کا نظارہ کرتا رہا۔ مجھے بارہا محسوس ہوا کہ وہاں نور کی "برفباری" ہو رہی ہے، اور ملائکہ نزول کر رہے ہیں۔ طواف کرنے والوں میں کچھ اہلِ جذب و شوق ایسے بھی تھے جو انسانی صورت میں ہونے کے باوجود مافوق البشر دکھائی دیتے تھے۔ انھیں صرف اہلِ نظر ہی پہچان سکتے اور اصحابِ حُسن و سُرور ہی ان کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے۔ نظرِ بینا ہو تو انسان نُور کو برستے بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہ سب جذب و شوق کی باتیں ہیں۔ اہلِ حُسن و سُرور تو دل پر نُور و سُرور کی بارش ہوتے بھی محسوس کرتے اور ہجومِ عشّاق میں اپنے اللہ کا پرتو بھی دیکھ پاتے ہیں۔ طواف کرتے والوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، جوان بھی تھے اور بُوڑھے بھی، مریض و ناتوان بھی تھے اور تندرست و توانا بھی، کالے بھی تھے اور گورے بھی، زرد بھی تھے اور سانولے بھی، غرضکہ ہر قوم و ملک اور رنگ و نسل کے لوگ تھے۔ لیکن وہاں سب ایک تھے، صرف عبد تھے۔ جنّ و ملائکہ بھی عبد تھے اور سبھی اپنے اللہ کے حضور اظہارِ عبودیّت

کر رہے تھے۔ یوں تو عبودیّت کا ہر انداز ہی اِلٰہ کو پسند اور محبّت کا مظہر ہوتا ہے، لیکن طوافِ عبودیّت کا ایسا والہانہ انداز ہے جو جذب وشوق کا مظہر اور رُوح کا رقصِ مستانہ ہے۔ یہ احساس کہ بندہ اپنے اِلٰہ کے حضور رقصِ بسمل کی طرح طواف کر رہا ہے، ایسے کیف وسُرور، حیرت ومستی، جذب وشوق اور قرب وحضور کا احساس ہے کہ اسے معرضِ اظہار میں لانے سے قلم وزبان عاجز ومعذور ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ احساس روح کو زندگی اور دل کو سوز ومستی، حُسن ونُور اور کیف وسُرور سے منوّر ومعمور کر دیتا ہے۔ طواف روح کا رقصِ جذب وشوق ہے، جو اِلٰہ کو بہت عزیز ہے۔

مُلتزم یا ہم آغوشیٔ "دوست" کا مقام

مُلتزم حجرِاسود اور درِ "دوست" کے درمیان اس جگہ کو کہتے ہیں، جس سے لپٹنا، جسے آنکھوں سے لگانا اور لب ورخسار سے چومنا سُنّتِ حبیبِ خُدا صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہے۔ چونکہ اہلِ جذب وشوق پر اس کا بوس وکنار لازم ہے، شاید اس لیے اس کے لیے مُلتزم کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ بے شک یہ ظاہر میں دیوارِ "دوست" کا حصّہ ہے، مگر بڑا ہی پُراسرار مقام ہے۔ اس کی حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ اللّٰہ نفسِ جبریلؑ دے تو بیان کروں۔ بالفرض اگر نفسِ جبریلؑ مل بھی جائے تو "دوست" کا راز افشا کروں تو کیسے اور کن کے لیے؟ کون ہے جو افشائے راز کی تاب لا سکے گا؟ کس کا دل حرفِ برہنہ کا حریف ہو سکے گا؟ اگر خاموش رہوں تو کتمانِ حق اور مشیّتِ "دوست" کے خلاف ہوگا۔ اَولیٰ یہی ہے کہ بات ہو بھی، مگر رمز وکنایہ میں، تاکہ اُسے سمجھیں تو یارانِ نکتہ داں، اور اُسے مانیں تو اہلِ عشق ونظر جو اس قسم کے تجربوں سے گزرتے ہیں، نیز اس سے اُن اہلِ شوق میں بھی ایسے تجربے سے گزرنے کی طلب وآرزو پیدا ہو، جو حج یا عُمرے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے کہ حریمِ "دوست" میں ایک لمحہ گزارنا، اس سے

باہر کی دُنیا میں صدیاں گزارنے سے افضل ہے۔ لیکن یہ راز اہلِ جذب و شوق ہی جانتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنا وقت زیادہ سے زیادہ "دوست" کے گھر، اس کے قرب و حضور میں گزارنا چاہتے تھے۔ وہاں بندے اُس کے مہمان اور "وہ" اپنے بندوں کا میزبان ہوتا ہے۔ اس کی کرم گستری کی کوئی حد ہے نہ مہمان نوازی کی، جس کا ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ اس کے مہمان اہلِ جذب و شوق کو ہر لمحۂ حیات کے بدلے ایک نئی زندگی اور روح ملتی ہے، نیز وہاں ان کا تزکیۂ نفس ہوتا اور بدیاں نیکیوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ انسان کے دل میں "دوست" کی محبّت اور اس کی دید کی سچّی آرزو ہو، نیز اس کی نظر حسین و بینا بھی ہو اور "دوست" کی اُس پر نظرِ لطف و کرم بھی ہو تو وہ اُسے اپنا جلوہ دکھا کر مقامِ شاہدیّت پر متمکّن کر دیتا ہے۔ مُلتزم ایسا ہی مقامِ لقائے "دوست" ہے، جہاں اہلِ جذب و شوق کو مقامِ شاہدیّت ملتا ہے، جس پر متمکّن ہو کر وہ اہلِ حُسن و سُرور اور وارثِ جنّت بنتے ہیں۔ ملتزم کا راز یہ ہے کہ اس جگہ "دوست" چُھپا ہوتا ہے، اور جب کوئی اہلِ جذب و شوق دیوار کے پردے میں اُس سے ہمکنار ہونا چاہتا ہے تو پردہ اُٹھ جاتا ہے اور انسان "دوست" کے عالمِ لامکان و لازمان میں پہنچ جاتا ہے، جہاں شاہد و مشہود ہوتے ہیں اور بس۔ اس عالمِ وصال و محبّت کی حقیقت کا راز وہی جانتے ہیں جو اِس تجربے کی لذّت سے آشنا ہیں۔ یہ افسانہ نہیں، حقیقت ہے، یہ شنید نہیں دید ہے، یہ خواب نہیں، مشاہدہ و واردات ہے۔ میرے لیے یہ حق الیقین بھی ہے، اس لیے کہ میں بھی اس تجربے سے گُزرا ہُوں۔ "دوست" سے معاملہ اور اس کے عالمِ ماورا کی بات ہو تو پھر اُسے اپنی زبان میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟ لیکن "دوست" کا اشارہ ہے کہ بیان کروں، چاہے حق ادا ہو یا نہ ہو۔

عصر کا وقت تھا، جب رُوح عمومًا وصالِ "دوست" کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ میں طواف سے فارغ ہو کر درِ "دوست" کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت میری حالت

اس مہجور اور محرومِ دید بندۂ محبّت کی سی تھی جو "دوست" کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ارمان بھرے دل اور دیدۂ شوق کے ساتھ اس کے در و بام کو تک رہا ہو۔ یکبارگی مجھے ایسا لگا جیسے "دوست" مجھے اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ میں اس کی اشارت و آوازِ بےصوت سے آشنا تھا، اس کے التفات کا مدّعا سمجھ گیا اور لپک کر ملتزم سے لپٹ گیا۔ دیوارِ "دوست" سے لپٹتے ہی مجھ پر پہلے رقّت اور پھر بے خودی کی حالت طاری ہوگئی۔ دیوار کو چُوما تو روح لذّتِ لمس سے مسحور اور مشامِ جاں بوئے "دوست" سے معطّر ہوگئی۔ اُسے آنکھوں سے لگایا تو قلب و جان سُرور انگیز و کیف پرور ٹھنڈک سے متکیّف و مسحور ہو گئے لیکن آنکھیں وفورِ مسرّت و حیرت سے خوننا بہ فشاں ہوگئیں۔ اس عالم میں مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود سے ہم آغوش ہوں۔ اب میں دیوارِ "دوست" سے نہیں، خود "دوست" سے ہمکنار تھا۔ اُس پیکرِ حُسنِ بے مثال کے لمس سے میرے سینے میں حُسن و سُرور کا ایک طوفان اُٹھا، جس کی ہر موج میں "اُلوہی ٹھنڈک تھی۔ اس ٹھنڈک میں بادۂ طمانیت و مسرّت کی سرخوشی، صہبائے نشاط و طرب کی مستی، شرابِ غنائیت و شعریت کی سرمستی اور رحیقِ جذب و شوق کی سیاہ مستی تھی۔ روح کو اَن گنت صدیوں کے ہجر و فراق کے بعد "دوست" کا وصال ہوا تو فرطِ استعجاب و سُرور سے اس کی حالت غیر ہوگئی، قرنہا قرن کا درد و سوز خون کے آنسو بن کر آنکھوں سے بہنے لگا۔ ان آنسوؤں میں داستانِ شکوۂ محبّت بھی تھی اور حکایتِ غمِ فراق بھی۔ صرف آنکھوں ہی سے جوئے خوں رواں نہ تھی، لبوں سے طوفانِ آہ و فغاں بھی اُٹھ رہا تھا، اور دل میں سیلِ سوز و ساز بھی موجزن تھا۔ رُوح "دوست" سے ہمکنار جذب و مستی اور وجد و حال کی کیفیت میں تھی۔ وہ ایسے عالم میں تھی جسے عالمِ اُلوہی سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ہر تعبیر سے ماوراء ہے۔ رُوح کو اس وقت ایک ہی تمنّا تھی کہ وہ عالم، عالمِ دوام اور وہ کیفیّت، کیفیّتِ سرمدی بن جائے، لیکن اس دُنیا میں ثبات و دوام کہاں ؟ یہاں تو فراق و تغیّر زندگی کا مقدّر اور حال گریز پا ہے۔ میں خاکی تھا، مجھے عالمِ اُلوہی کی جنّت سے

نکلنا اور واپس عالمِ زمان و مکان میں آنا تھا، اور اس طرح پھر جُدائی کا وقت دیکھنا اور غم سہنا تھا۔ اُس عالم سے نکلتے ہی ہوش میں آیا تو میں دیوارِ "دوست" سے چمٹا رو رہا تھا۔ کچھ اہلِ جذب و شوق بھی دُنیا و مافیہا سے بے خبر دیوارِ "دوست" سے ہمکنار تھے۔ عشّاق کی ایک بڑی تعداد "دوست" کی بلائیں لینے کی خاطر اس کے حُسن المآب کا طواف کر رہی تھی۔ "حریمِ دوست" اہلِ جذب و شوق کی آہ و فغاں کی صداؤں اور ملائکہ کے نغماتِ حمد و ثنا سے گونج رہی تھی، اور یہ گونج فردوسِ گوش تھی۔ اس گُونج میں آوازِ "دوست" کا سحرِ حُسن بھی تھا۔ میں ان قُدسی و اُلوہی نظاروں کی جنّت میں تھا کہ کسی نے میرے کندھے کو جنبش دی اور دامنِ "دوست" ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"دوست" کے آنگن میں

حرم شریف جو جلوہ گاہِ "دوست" ہے، رات کے وقت اس کا آنگن شبستانِ حُسن و نُور ہوتا ہے۔ عروسِ شب شبستانِ "دوست" میں آتی ہے تو اس کا انداز کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ وہ آتی ہے تو اپنے ساتھ بہارِ رنگ و نُور اور موجِ بوئے "دوست" لاتی ہے، جو فضا کو معطّر اور روح کو مسحور کر دیتی ہے۔ قلب و نظر کے لیے شبستانِ "دوست" حُسن و نور اور رنگ و بو کا مقدّس طلسم کدہ بن جاتا ہے۔ تشنہ کامانِ محبّت کی روح بیں نظریں بن بن کر شہیدِ نظّارہ ہوتی جاتی ہیں۔ یہ منظر اہلِ حُسن و سُرور کے حسین ترین خواب و خیال سے بھی کہیں زیادہ حسین و سحر انگیز ہوتا ہے۔ یوں تو حریمِ "دوست" کا ہر گوشہ، گوشۂ خلدِ بریں ہے، لیکن اس کا آنگن، جسے حطیم کہتے ہیں، اہلِ جذب و شوق کو فردوسِ بریں سے بھی بڑھ کر محبوب ہے۔ اس کی قدر کچھ وہی تشنہ کامانِ محبّت جانتے ہیں، جن کی محبت سچّی ہوتی ہے، اور وہ اس کے ایک نظّارے کی خاطر سو جان قربان کرنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت و خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

چونکہ "دوست" کے آنگن میں نفل پڑھنے کا ثواب بے حساب ملتا ہے، اس لیے یہ مغفرت و رحمت کے طلب گاروں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے اگلے حصّے میں مومن اور

پچھلی صفوں میں مومنات اپنے اِلٰہ کے حضور قیام و سجود اور دُعا و فریاد میں محو ہوتی ہیں۔ سب کے دل سوز و گداز کی لذّت سے سرشار ہوتے ہیں اور سب پر رقّت و محویّت کی کیفیّت طاری ہوتی ہے، لیکن اہلِ جذب و شوق کی کیفیّت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ انھیں تمنّا ہوتی ہے تو دیدِ "دوست" کی اور طلب و آرزو ہوتی ہے تو اس کی حضوری کی۔ وہاں کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا، سب یادیں محو جاتی ہیں، بجز یادِ "دوست" کے، اور سب خواہشیں مٹ جاتی ہیں، سوائے خواہشِ مغفرت و رحمت کے۔

عشاء کا وقت تھا کہ ہم اس رشکِ فردوسِ بریں میں داخل ہوئے۔ اس مقدّس جگہ داخل ہوتے ہی بوئے "دوست" سے مشامِ جاں معطّر اور رُوح مسحور ہوگئی، اور اِس احساس سے کہ میں سچ مچ "دوست" کے آنگن میں ہوں، میرے دل پہ برقِ حُسن گری اور صبر و شکیب کو فنا کرگئی۔ دل خون خون اور جگر لخت لخت ہوگیا۔ آنکھیں خوننابہ فشاں ہوگئیں اور جگر کے ٹکڑے آہ و فغاں کی صورت فضا میں اُڑنے لگے۔ میں دیوارِ "دوست" کے سائے میں بیٹھ گیا۔ اس کا سایہ میرے لیے سایۂ ہُما کیا، سایۂ طوبیٰ سے افضل و محبوب تھا۔ اس میں "فردوسی ٹھنڈک" تھی، روح پرور و سرور انگیز۔ میں اُسے دیدۂ شوق و حیرت سے اس طرح تکنے لگا، جس طرح مہجور و منتظر عاشق مدّتوں کے بچھڑے محبوب سے اچانک ملنے پر اُسے دیکھتا ہے۔ وہ محض دیوار نہ تھی، "دوست" کی دیوار تھی۔ اس لیے معروضِ محبّت اور جنّتِ نگاہ تھی۔ وہ حریمِ "دوست" کا پردۂ جلوہ نما تھی۔ میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ آخر میری نگاہِ شوق چیر گئی دلِ وجود۔

حریمِ "دوست" میں

اب حریمِ "دوست" میری نظر میں تھی، اور وہ اس کے جمال و جلال اور انوار و تجلّیات سے اس طرح منوّر تھی کہ اس کے ایک نظّارے کے عوض لاکھ جانیں قربان کر دینا بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اس کا منظر فردوسِ بریں سے لاکھ گُنا حسین و دلآویز تھا۔ وہ مقدّس سحرکدۂ حُسن

تھی۔ اس میں "دوست"، اُس کے دوست اور ملائکہ تھے۔ وہ سب جلوہ بداماں تھے اور پنہاں بھی۔ اس کا عالم زمان و مکان کچھ اور تھا۔ اس کی وسعتیں بے حد و حد و بے ثغور ہونے کے باوصف نظر کی رسائی میں تھیں۔ ہر منظر دُور ہونے کے باوجود قریب اور نظّارہ سوز ہونے کے باوجود آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ میں حیرت و اشتیاق سے جلوہ گاہِ حُسنِ "دوست" کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً برقِ حُسن لہرائی اور میں نے ایک ناقابلِ فراموش نظّارہ دیکھا، جس کی قیمت ہزار جانیں بھی ہوں تو کم ہے۔ میری جان شہیدِ نظّارہ ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ ایک نئی جان ملتی گئی۔ میں نے وہاں اپنے آقا و مسیحا، آفتابِ حُسن و رحمت صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو جلوہ افروز دیکھا۔ آپؐ کے دائیں بائیں صدق و وفا کے دو ماہتاب درخشاں تھے، ایک آپؐ کے مورثِ اعلیٰ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام اور دوسرے معمارِ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام۔ اس بزم "دوست" میں اس کے اور بھی دوست ماہ و انجم کی طرح چمک رہے تھے۔ "دوست"، خود میرِ مجلس تھا، لیکن وہ کہاں تھا، یہ رازِ درونِ سرّالاسرار ہے کہ پوشیدگی و پنہانی جس کا مقدّر ہے۔

"دوست"، کی طرح اس کی بزم کا ہر منظر اور نظّارہ ماورائی تھا، جس کے بیان کی قدرت نہ زبان و قلم کو ہے اور نہ معرضِ اظہار میں آنا اس کا مقدور ہے۔ بہرحال ؎

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں

اس بزمِ "دوست" میں رنگ و نور کی پھوار پڑ رہی تھی، جو حد سے زیادہ حسین و دلکش اور روح پرور و سحر انگیز تھی۔ اس کا منظر دیدۂ حیراں کی ٹھنڈک تھا۔ اس میں طرح طرح کی خوشبوؤں کے جھونکے چل رہے تھے، جن کی مہک روح پرور اور وجد انگیز تھی۔ اس کی فضا میں غنائیت و شعریت کی بڑی ہی لطیف و مسحور کن گونج تھی۔ حُسن و نور اور رنگ و بُو کے اس مقدّس و اچھوتے طلسم کدے میں میری رُوح وجد و حال، جذب و مستی، کیف و سُرور اور لذّت و طرب کے ایک ایسے تجربے سے گزر رہی تھی، جس کا بیان

قلم و زبان کے اِمکان میں نہیں۔

"دوست" کی بزمِ حُسن و سُرور اس کے دوستوں سے آباد تھی۔ وہ ہمیشہ آباد رہی اور رہے گی۔ اس میں شرابِ طَہور کے دَور چل رہے تھے۔ حسین و نظر افروز اور تابندہ و متحرّک لعل و گوہر سے کہیں زیادہ خوبصورت و دلکش غِلمان اَن دیکھے نفیس و دیدہ زیب ساغر و مینا لیے اُن مہر و ماہ و انجم کے گرد طواف کر رہے تھے۔ وہ شرابِ طہور اصل میں حُسنِ سیّال تھی، جس سے "دوست" کے اہلِ حُسن و سُرور "جمالیاتی حظ" اُٹھا رہے تھے۔ یہ بڑے ہی فیّاض و کریم "ساقی" کی بزم تھی، جو میزبان بھی تھا اور دوست بھی۔ میں اگرچہ آلودۂ عصیاں، گدائے بے نوا تھا، لیکن ساقی کی فیّاضی و کرم گستری کا دریا موجزن تھا، وہ مجھے محروم و تشنہ کام رکھتا تو کیوں؟ اس کے در سے کب کوئی ناکام و نامُراد لوٹا تھا، جو میں محروم و تشنہ کام لوٹتا۔ میں اس جہانِ حُسن و سُرور میں عالمِ حیرت و مستی میں تھا کہ ایک آواز آئی۔ آواز کیا تھی، برقِ حُسن و سرور تھی، جو میرے دل کی دُنیا کو نُور و سُرور سے منوّر و معمور کر گئی۔ آوازِ "دوست" بے حرف و صوت تھی، لیکن روح اُسے جانتی، پہچانتی اور سمجھتی تھی۔ ارشادِ "دوست" تھا:

"میرے اس بندے کو بھی رحیقِ مختوم (مُہر شدہ بادۂ ناب) کا ایک جام دو۔ یہ ہمارے "حبیب ﷺ" کا سیرت نگار ہے۔"

اگر وہ "دوست" کا موت نا آشنا عالمِ جاودانی نہ ہوتا تو میں خوشی سے مر گیا ہوتا۔ میرے لیے یہ ایک انہونی سی بات تھی، اور ایک لرزشِ سُرور سارے بدن میں تھی۔ اتنے میں ایک گوہرِ زندہ و تابندہ نے مجھے اس بادۂ ناب کا ایک جام دیا، جو لعلِ فردوسی اور گوہرِ شہوار سے زیادہ حسین و نظر افروز تھا۔ جام ہاتھ میں لیتے ہی ایک اَن سونگھی خوشبو کی لپٹ آئی جو مشامِ جاں کو معطّر اور روح کو مسحور کر گئی۔ جام منھ سے لگایا تو مہک اور طرح کی تھی، جو پہلی سے زیادہ رُوح پرور و مسحور کُن تھی۔ پھر ہر سانس کے ساتھ خوشبو کی نوعیّت و کیفیت بدلتی رہی اور رنگیّت زیادہ ہوتی گئی۔ اس بادۂ ناب

کا گھونٹ بھرتے ہی میرے اندر لذّت و حلاوت، کیف و سُرور اور سرخوشی و طرب کی ایک موج گزر گئی۔ اس کا پہلا گھونٹ پیتے ہی روح وفورِ نشاط و طرب سے جھُوم اُٹھی۔ وہ "دوست" کی شراب تھی، اس لیے حُسنِ سیّال و طہور تھی، وہ وجاہ آفریں بھی تھی اور خرد فزا بھی۔ اُسے پی کر مجھے محسوس ہوا کہ میں صاحبِ حُسن و سُرور اور دانائے راز بن گیا ہُوں۔ اس شرابِ حُسن و سُرور کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ روح کی ٹھنڈک تھی، جو جتنی شدید تھی اتنی ہی سُرور انگیز و کیف پرور بھی تھی۔ اس تاثیر سے روح زندہ و بیدار ہو گئی اور اس پر جذب و سرمستی کی کیفیّت بھی طاری ہو گئی۔

اس عالم میں مجھے یہ احساس ہوا کہ ساقی نے اپنی نظرِ کرم سے مجھے اپنا رند بنا لیا ہے اور میں کچھ اور ہی ہو گیا ہوں۔ اس کی برکت سے میں عظیم بن گیا ہوں۔ قریب تھا کہ میری زبان سے "انا الاعظم" کا نعرہ نکل جاتا کہ ساقی کی نظرِ التفات سے زبان گنگ ہو گئی، اور میں دم بخود اور گُم صُم ہو کے رہ گیا۔ پھر مجھ پر قیامت ٹُوٹ پڑی اور وہ عالم رہا، نہ منظر۔ میرے سامنے دیوارِ "دوست" تھی اور چاروں طرف اہلِ جذب و شوق کا ہجُوم، جو طواف و نماز اور گریہ و زاری میں مشغول تھے۔ حریمِ "دوست" میں حُسن و نُور کی پھُوار پڑ رہی تھی اور شمیمِ جانفزا بوئے "دوست" لیے عشّاق کی مشامِ جاں معطّر کر رہی تھی۔ آسمان سے ملائکہ اور تارے شبستانِ "دوست" کے نظّارے میں محو تھے۔ "دوست" خود محوِ نظّارہ تھا، اس وقت "دوست آشنا" روح کی جو کیفیّت ہو گی، اس کا اندازہ وہی تشنہ کامانِ محبّت کر سکتے ہیں، جو اس تجربے سے گُزرے ہوں۔

میں عالمِ حیرت میں تھا، اور جس مشاہدے اور تجربے سے گُزرا تھا، وہ کبھی خواب معلوم ہوتا اور کبھی حقیقت۔ میرے اندر اس بادۂ طہور کی ٹھنڈک تھی، رُوح اس کی لذّت سے سرمست اور نشّے سے سرشار تھی، اس لیے وہ تجربہ حق تھا۔ لیکن جب یہ سوچتا کہ وہ بزمِ "دوست" کیا ہوئی اور وہ نظّارے کہاں گئے تو جو کچھ دیکھا تھا خواب،

جو سُنا افسانہ، اور جو پایا تھا، خیال معلوم ہوتا۔ کبھی مسرّتِ وصال اور کبھی غمِ جُدائی سے آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ گاہے جمالِ "دوست" سے مجھ پر جذب و حیرت کی کیفیّت طاری ہو جاتی، اور گاہے اس کے جلال کی ہیبت سے لرزنے لگتا اور اپنے آپ میں آجاتا۔ "دوست" کی محبّت میں جذب و مستی بھی ہے اور ہوش مندی و فرزانگی بھی، خود آگاہی بھی ہے اور خدا آگاہی بھی۔ میں ان ماورائی و فردوسی نظاروں سے متکیّف سوچ میں مستغرق ہو گیا اور "دوست" کی نظرِ کرم سے مجھ پر اسرار منکشف ہونے لگے۔ میں اس عالمِ کشف میں بیٹھا تھا کہ دربان کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا: "آپ نفل پڑھ چکے ہیں اور دیر سے یہاں بیٹھے ہیں، لہٰذا کسی دوسرے تشنہ کامِ محبّت کے لیے جگہ خالی کردیں۔" مجھے بادلِ ناخواستہ دوست کے آنگن سے نکلنا پڑا۔

میزابِ رحمت، ناظورۂ اہلِ شوق

میزاب پرنالے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ ربِّ حُسن و رحمت کے گھر کا پرنالہ ہے، جس پر شب و روز ہمہ وقت رحمت کے فرشتے نزول فرماتے رہتے اور نُور و رحمت کی بارش ہوتی رہتی ہے، اس لیے اسے میزابِ رحمت کہتے ہیں۔ نیز چونکہ یہ بامِ "دوست" کا پرنالہ ہے، لہٰذا یہ عشّاق کا معروضِ محبّت (OBJECT OF LOVE) اور ناظورۂ اہلِ جذب و شوق ہے۔ یہ "دوست" کے آنگن یعنی حطیم میں گرتا ہے، جہاں اہلِ ذوق و نظر اُسے دیکھتے اور جمالیاتی سُرور حاصل کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں، یہ ان کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتا اور ان کے شوقِ دید کو فزوں کرتا ہے۔ اس مہبطِ رحمت و نُور، جولانگاہِ ملائکہ اور جلوہ گاہِ حسنِ "دوست" پر ابرِ نیساں برستا ہے تو اس کے پانی میں بھی برکت و رحمت شامل ہو جاتی ہے، اور وہ اہلِ جذب و شوق کے لیے آبِ حیات اور طالبانِ مغفرت و رحمت کے لیے آبِ رحمت بن جاتا ہے۔ پھر یہ آبِ رحمت و حیات میزابِ "دوست" کے ذریعے اس کے آنگن میں گرتا ہے، جہاں

تشنگانِ مغفرت و رحمت اُس کے انتظار میں دیدۂ حسرت کو روزنِ میزاب بنائے ہوتے ہیں۔ وہ اُسے فرش پر گرنے سے پہلے ہی سر آنکھوں پہ لیتے ہیں، چُلّو بھر بھر پیتے ہیں، اس میں نہاتے، اس سے وضو کرتے، اُسے آنکھوں سے لگاتے اور تن بدن پر ملتے ہیں۔ وہ اسے مبارک سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس متبرک پانی سے تن بدن ہی نہیں قلب و نظر بھی پاک ہو جاتے ہیں۔ تشنہ کامانِ محبت کے لیے میزابِ رحمت کا پانی "دوست" کا ارمغانِ محبت اور آبِ حیات ہے، جو نہ صرف رُوحوں کی پیاس بجھاتا بلکہ انھیں حیاتِ جاودانی بھی بخشتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ میزابِ محبت کو دیدۂ شوق و محبت سے اس طرح دیکھتے رہتے ہیں، جیسے مشتاقانِ دید محبوب کے در و بام کو دیکھتے ہیں۔

ایک ادائے عاشقانہ اور انوکھا تجربہ

یہ حُسنِ اتفاق تھا یا مشیّتِ "دوست" کہ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دو مردانِ جذب و شوق تہجّد و عصر کے وقت میزابِ رحمت کے نیچے کھڑے ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں، جیسے وہ نہا رہے ہوں۔ میں اسے ایک ادائے عاشقانہ سمجھ کر بغیر توجّہ کیے گزر جاتا۔ آخر ایک دن مجھ میں شوقِ تجسّس پیدا ہوا، اور میں انھیں ایسی حرکتیں کرتے غور سے دیکھنے لگا۔ میں اس کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ شاید یہ "دوست" کا اشارہ تھا کہ دل بے تاب ہو گیا اور مجھ سے رہا نہ گیا، اور میں بھی صحنِ "دوست" میں اُن کے پاس کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اپنے اس شغلِ جنوں کاری سے فارغ ہوں تو اس کا سبب پُوچھوں۔ ناگہاں "کوئی" دھکیل کر مجھے میزابِ رحمت کے نیچے لے گیا۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے نُور و رحمت کی بارش کا پرنالہ بہہ رہا ہے۔ اس غیر متوقّع صورتِ حال نے مجھے خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ میں اِس آبِ رحمت و حیات میں نہانے لگا۔ کبھی اُسے سر آنکھوں پر لگاتا، جسم پر ملتا، کبھی اس سے وضو کرتا اور کبھی چُلّو چُلّو

پیتا۔ میری یہ حرکات، جو اضطراری بھی تھیں اور شعوری بھی، دیکھنے والوں کی نظروں میں یقیناً مجنونانہ ہوں گی، لیکن "دوست" کے سوا دلوں کا حال کون جانتا ہے۔ حضرت باہوؒ نے سچ کہا ہے :

دِل دریا سمندروں ڈُونگے، کون دِلاں دیاں جانے ہُو!

(دِلوں کے دریا سمندروں سے گہرے ہوتے ہیں۔ کون ہے جو دِلوں کی باتیں جانتا ہے، سوائے اُس (ہُو) کے!)

اس آبِ رحمت و حیات کی تاثیر سے جسم کے ساتھ قلب و روح بھی پاک و صاف ہو گئے اور گلزارِ ہستی سرسبز و شاداب ہو گیا۔ اس سے میرے اندر ایک عجیب قسم کی ٹھنڈک کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس ٹھنڈک میں بڑی ہی عجیب و غریب جمالیاتی لذّت تھی، جو جتنی شدید تھی اُتنی ہی سرور انگیز و کیف پرور تھی۔ اس سے تزکیۂ نفس ہوا اور قلب و رُوح زندہ و فعّال اور حسین و منوّر ہو گئے۔ میں دولتِ رحمت لُوٹنے میں مشغول تھا کہ زائرین کا ایک ریلا آیا اور مجھے دھکیلتا ہوا دُور لے گیا۔

میں جدّ و جہد کے بعد میزابِ رحمت کے نیچے پہنچ تو گیا، لیکن وہاں نہ وہ مردانِ جذب و شوق تھے اور نہ میزابِ رحمت ہی بہہ رہا تھا۔ پھر دربان بھی مجھے وہاں ٹھہرنے سے منع کرنے لگے۔ میں صحنِ "دوست" سے باہر نکلا تو میری کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ غسلِ رحمت کا یہ تجربہ اس قدر مبارک اور انوکھا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ میں تشکّر و امتنان کے جذبات سے معمور دل کے ساتھ "دوست" کے حضور سجدے میں گر گیا۔ آنکھوں سے تشکّر و مسرّت کے اشکوں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ میں سراپا عجز و نیاز اور تشکّر و امتنان بنا "دوست" کے قدموں میں گرا رہا۔ "دوست" اُلوہیت کے مقامِ ارفع و اعظم پر سرفراز و متمکّن تھا اور میں عبودیّت کے مقامِ تذلّل و تضرّع پر سرنگون و سجدہ ریز تھا۔ میں اس وقت کہاں اور کس عالم میں تھا؟ میں اپنے جہانِ زمان و مکان میں تھا کہ اُس کے

عالمِ لازمان و لامکان میں ؟ مجھے معلوم نہیں۔ یہ راز "دوست" ہی جانتا ہے، جو غیب و شہود کا علم رکھتا ہے۔ شاید اُسے یہ نظّارہ معبودیّت پسند آیا تھا، اُس نے صدیوں مجھے اس عالم میں رکھا، لیکن جب اُس کے اشارے سے میں اس عالم میں نہ رہا اور سجدے سے سر اُٹھایا تو حریم "دوست" کا وہی عالم و منظر تھا، اور وہ مردانِ جذب و شوق میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔ ان کی نورانی آنکھیں متبسّم تھیں اور اس تبسّم میں حُسن کی بجلیاں لہرا رہی تھیں۔ میں اُٹھ کر اُن سے ملنا چاہتا تھا کہ وہ طواف کرنے والے ہجومِ عشّاق میں غائب ہو گئے۔

مقامِ ابراہیمؑ اور نظّارۂ "دوست"

حرم شریف کی مقدّس و ملکوتی فضا میں مجھے اس حقیقت کا عین الیقین ہوا کہ رات کے پچھلے پہر اللہ جلّ شانہٗ ہماری دُنیا کے آسمان سے ہم پر جلوہ فگن ہوتا ہے۔ تہجّد کا وقت تھا اور میں نماز پڑھ کر مقامِ ابراہیمؑ پر بیٹھا "دوست" کے حُسنِ المآب کو دیدۂ شوق سے دیکھنے میں محو تھا کہ اس سے حُسن کا ہیولیٰ سا نمودار ہوا اور برق نمط رفتار سے اُوپر اُٹھا۔ نظر خود بخود اس کے تعاقب میں اُفق پر پہنچ گئی۔ یہ بڑا ہی عجیب و غریب اور حیرت انگیز و سُرور آگیں نظّارہ تھا۔ میں مجسمۂ حیرت بنا اُفق کو دیکھ رہا تھا کہ ایسا لگا جیسے فضائے سماوی حُسنِ "دوست" سے مزیّن ہو گئی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ نُور کی پھوار پڑ رہی ہے اور غیر مرئی ملکوتی ہستیوں کے سائے متحرّک ہیں۔ یہ منظر بڑا ہی سہانا اور پُربہار تھا، اور اس قدر جمیل و جلیل، دلآویز و نظر افروز، وجد آفریں و سحر انگیز اور ایمان پرور و بصیرت افروز تھا کہ قلب و جاں مسحور ہو گئے۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انوار و تجلّیات سے میرے اندر کی دُنیا منوّر ہو گئی ہے۔ میں اس عالمِ حیرت و مستی میں تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان پر ایک حیرت انگیز نورانی ہالہ نمودار ہوا، جو دیکھتے دیکھتے ایک صورت میں تبدیل ہو گیا، جو کُل کائنات کو محیط تھی۔ یہ صُورت کیا تھی ؟

حُسنِ مُصوّر تھی، جمال و جلال کی سحر انگیز و نظر افروز تصویر تھی۔ یہ "دوست" کی صورتِ مجاز تھی۔ یہ محبوبیّت و جاذبیّت، حیرت و سرمستی، جذب و انجذاب اور کیف و سُرور کی ایک ناقابلِ بیان و فہم شکل تھی۔ اُسے دیکھتے ہی رُوح اُس پر قربان ہوجانے کے لیے مچلنے لگی، لیکن نظر اس پر پڑتی تو شہیدِ نظّارہ ہوجاتی۔ مجھے دل میں ایک عجیب سی سُرور آگیں ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ یہ ٹھنڈک جوں جوں شدید سے شدید تر ہوتی جاتی، سرمستی بڑھتی جاتی اور مسرّت کی شدّت ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی۔ میں حیران ہوں کہ مجھے شادیٔ مرگ کیوں نہ ہوئی یا میں مجذوب کیوں نہ ہُوا؟ یہ راز "دوست" ہی جانتا ہے۔ میں کب تک محوِ نظّارۂ "دوست" رہا، خُدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا کہ یہ مدّتِ نظّارہ صدیوں پر حاوی تھی۔

کڑی : ۹

سیرۃ النبیؐ کی تقریبِ تقسیم انعامات

اگرچہ ایک دن اور دو راتیں ہم نے مکّہ مکّرمہ میں گزاری تھیں، لیکن ہم نے ابھی تک اس کی سیر نہیں کی تھی، حالانکہ روح اس کے لیے بے قرار تھی۔ وجہ یہ تھی کہ حریمِ "دوست" کے نظّارے اور "دوست" کے اشارے کہیں جانے ہی نہیں دیتے تھے۔ یک شنبہ ربیع الآخرۃ ۱۳۹۹ھ کو بہرحال مجھے دس بجے رابطۂ عالمِ اسلامی کے دفتر جانا تھا، جہاں سیرۃ النبیؐ کے عالمی مقابلے میں انعام یافتہ سیرت نگاروں کو انعام دینے کی تقریب منعقد ہونا تھی۔ چونکہ سعودی عرب میں اس قسم کی تقاریب میں عورتوں کی شمولیّت ممنوع ہے، لہٰذا میں بیگم صاحبہ کو حرم شریف میں چھوڑ کر خود اکیلا ہی وہاں گیا۔

سیرۃ النبیؐ کے سلسلے کی یہ تقریبِ تقسیم انعامات بالائی منزل میں منعقد ہوئی۔ عہدِ آفرین و تاریخ ساز شخصیت اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ کے حوالے سے یہ بڑی اہم، مقدّس اور یادگار تقریب تھی۔ اس کی صدارت مکّہ مکّرمہ کے گورنر نے کی، جو حکمران شاہی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور بڑی وجیہہ اور پُرکشش شخصیّت کے مالک تھے۔ اُن کی کُرسیٔ صدارت کے دائیں بائیں سٹیج پر قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے دار رونق افروز تھے۔ ان کے ورے رابطۂ عالمِ اسلامی کے ناظم الامور کی کرسی تھی، جنھیں سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دینے تھے۔ اس تقریب میں اکابرِ شہر، عمایدینِ حکومت، جامعہ مکّہ مکرمہ کے اساتذہ، اہلِ علم و دانش اور صحافیوں کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے نمایندوں نے بھی شرکت کی۔

حاضرین کے سامنے ہیڈ فون رکھے تھے۔ ٹیلی وژن کے کیمرے موزوں جگہوں پر لگائے گئے تھے۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ ٹھنڈے اور گرم مشروبات کے دَور چل رہے تھے۔ کارکن اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے، لیکن ہال میں ایسی خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی متنفّس نہ ہو۔ نظم و ضبط دیدنی تھا اور پہلے کبھی میرے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

جلوسِ شاہی کا نظّارہ

بارہ بجے والیِ مکّہ اس انداز میں تشریف لائے کہ میں دنگ رہ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ماضی کے شاہی دربار میں ہوں اور بادشاہ کے جلوس کا نظّارہ دیکھ رہا ہُوں۔ وہی کرّوفر تھا، وہی شان و شوکت۔ والیِ شہر شہزادہ تھا، جس کے ساتھ ساتھ دائیں بائیں دو "خوشبودار" تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں دو منقّش و دیدہ زیب خوشبودان تھے، جن کے "دُودِ عنبر فشاں" کی موجوں سے ہال مہک اُٹھا اور مشامِ جاں معطّر ہوگئے۔ شہزادے کے جلو میں دو رویہ شمشیر بکف محافظ فوجی دستہ تھا۔ دائیں جانب کے شمشیرزن جوانوں کی تلواروں کے دستے سونے کے تھے اور ان میں نہایت نفیس منبّت کاری کی گئی تھی، اور بائیں طرف کے محافظ دستے کے جوانوں کی شمشیروں کے دستے نقرئی و منقّش تھے۔ بے نیام شمشیروں کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوتی جاتی تھیں، اور ان کے طلائی و نقرئی دستوں کے نقش و نگار کی نظر افروزی و درخشانی کا نظّارہ قابلِ دید تھا۔ یہ منظر اگرچہ دلکش و نادر تھا، لیکن اس میں "قیصریّت" کا انداز و رنگ تھا، حالانکہ صدرِ مجلس کی آمد میں، تقریب کی مناسبت اور دیارِ حبیبِ خُدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی رعایت سے، خلفائے راشدینؓ کا اندازِ فقر ہونا چاہیے تھا۔ فرعونیّت و ہامانیّت، نمرودیّت و قارونیّت اور قیصریّت و کسرویّت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے والی تحریکِ اسلامؐ کے علمبردارؐ کے شہرِ مقدّس میں اور کُل جہانوں کے شہنشاہِ جلیل و اکبر کے حرم شریف کے زیرِ سایہ یہ قیصریّت و کسرویّت کی یہ نمائش دلِ فقر پسند پر سخت ناگوار گزری۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

بہر حال، والیِ شہر شہزادوں کے روایتی کرّ و فر کے ساتھ اہلِ علم و دانش کی مجلس میں تشریف لائے اور کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اُن کے آتے ہی ٹیلی وژن کے کیمرے حرکت میں آ گئے۔ کرسیِ صدارت کے سامنے خوبصورت میز پر خوشبودان سجا دیے گئے، اور شمشیر بکف محافظ سپاہی سٹیج پر پیچھے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ گرم قہوہ اور ٹھنڈے پھلوں کے رس کے دَور بدستور چلتے رہے۔ صدر کے آتے ہی تلاوتِ قرآنِ مجید سے اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا۔

دو تقریریں ہوئیں اور وہ بھی مختصر۔ اس کے بعد والیِ مکّہ نے مختصر خطبۂ صدارت دیا، جس میں انھوں نے سیرتِ طیبّہ کے مطالعہ کی اہمیّت اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے تتبّع پر زور دیا، اور سیرت نگاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ بعد ازاں، اُنھوں نے سیرت نگاروں کو باری باری انعامات دیے، اُن سے مصافحہ کیا اور مبارک دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ تقریب ختم ہو گئی۔ بعد میں اس تقریب کی کارروائی ٹیلی وژن پر دکھائی گئی، ریڈیو سے نشر ہوئی اور اخبارات میں شائع ہوئی۔

نظم و ضبط اور اخوّت و مساوات

اس تقریب کے دوران جن دو چیزوں سے میں بہت متاثّر ہوا، ان میں ایک تو نظم و ضبط اور دوسرا اخوّت و مساوات کا مظاہرہ تھا۔ نظم و ضبط کی یہ کیفیّت تھی کہ کارروائی سے پہلے، پیچھے اور دوران میں مقرّرین کی آواز کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دی۔ سامعین وقتِ مقرّرہ سے پہلے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ چکے تھے۔ دوڑ دھوپ، افراتفری، جلد بازی اور بدحواسی کا کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ اجلاس کے اختتام پر حاضرین بڑے نظم و ضبط کے ساتھ باری باری سیرت نگاروں کے پاس آتے، سلام و مصافحہ کرتے، مبارک باد دیتے اور رخصت ہو جاتے۔ اخوّت و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ گورنر، قاضی القضاۃ، شہزادے، امراء، عوام، مہمان، افسر و ماتحت، سپہ سالار و سپاہی، حتیٰ کہ

چپڑاسی تک ایک ہی پیالی اور گلاس میں مشروبات پیتے تھے۔ کھانے پینے میں اسلامی اخوت و مساوات کا یہ مظاہرہ دفتروں، گھروں، کاروباری اداروں، ہوٹلوں، تقریبوں وغیرہ ہر جگہ دیکھنے میں آتا ہے۔

یہ نظارہ بڑا ہی دل خوش کن تھا، لیکن معاً دل میں خیال آیا: کاش اخوت و مساوات کے یہ مظاہر سعودی عرب کی کُل زندگی میں دکھائی دیتے تو اس ارضِ مقدس میں شہنشاہیت کے بجائے اسلامی حکومت یا خلافت ہوتی، معاشرے میں عدل و احسان ہوتا، معاشی ناہمواری نہ ہوتی، تقریر و تحریر کی آزادی ہوتی، تقریبات پر پابندی اور زبان و قلم پر پہرے نہ بٹھائے جاتے۔ لوگوں میں شہنشاہیت کے خوف کے بجائے اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا، نیز اپنے اسلاف کی طرح حق گوئی و بے باکی ان کا مسلک، فقر و غنا ان کا وتیرہ، جدّ و جہد اور جہاد ان کا شیوہ اور شہادت ان کی مطلوب و مقصود ہوتی۔

میں اس تقریب سے متأثر تو بہت ہوا، مگر میرے تأثرات و احساسات ملے جُلے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سیرۃ النبیؐ کے بین الاقوامی مقابلے میں گراں قدر انعام حاصل کرنا، اور سیرت نگاروں اور اہلِ علم و دانش کی ایسی پُرشکوہ تقریب میں شامل ہونا، بہت بڑا اعزاز تھا، لیکن مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ایک تو اپنے اِلٰہ و ربّ نے مجھ سے اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیبہ لکھوائی اور مجھے آپؐ کے سیرت نگاروں میں شامل کیا، اور دوسرے اُس نے مجھے اور میری اہلیہ کو عُمرے کی سعادت بخشی اور روضۂ اطہر کی زیارت کا موقع عطا کیا۔

کڑی : ۱۰

نقوشِ حُسن و عشق کی تلاش میں

"دوست" کا گھر بلاشبہ اہلِ شوق و نظر کے لیے معروضِ محبّت اور جنّتِ نگاہ ہے۔ وہ بے شک آنکھوں کی ٹھنڈک اور ذوقِ حُسن کی تسکین کا سامانِ بے عدیل ہے، اور روح کو درِ "دوست" ہی پر پڑے رہنے کی خواہش رہتی ہے، لیکن دل کو "دوست" کے حبیب اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے مقدّس گھر اور ان گلیوں، بازاروں، وادیوں اور جگہوں کو بھی جی بھر کے دیکھنے کی طلب و جستجو تھی، جنھیں آپؐ کے قدمِ مبارک چُومنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور جن کی فضائیں آپؐ کے جسمِ اطہر و طیّب کی بُوئے عنبریں و جانفزا سے معطّر ہُوئیں اور اب بھی ہیں، لیکن اُن کے لیے جن کے دل آپؐ کی محبّت سے سرشار اور مشامِ جاں آپؐ کی بُوئے رُوح پرور کی لذّت سے آشنا ہے۔ آپؐ کا ہر نقشِ حیات، چاہے نقشِ پائے مبارک تھا یا نقشِ آوازِ حق، نقشِ حُسنِ عمل تھا یا نقشِ حُسنِ سکنات، حقیقت میں نقشِ حُسن و عشق تھا، اس لیے انمٹ تھا، اور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ زندۂ جاوید ہیں اور آپؐ کی طرح آپؐ کے نقوشِ زندگی بھی، جو نقوشِ حُسن و عشق ہیں، زندہ و پائندہ اور تابندہ ہیں، لیکن انھیں وہی خوش نصیب دیکھتے ہیں، جو اہلِ جذب و شوق اور صاحبِ نظر ہوتے ہیں اور جنھیں ان کا دکھانا "دوست" کو منظور ہوتا ہے۔

میں اس قابل تو نہ تھا کہ آپؐ کے نقوشِ حُسن و عشق کو دیکھتا اور ان کے نظّاروں سے آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سُرور اور رُوح کی تب و تاب حاصل کرتا، لیکن "وہ" جو انسان کے سینے کے اندر رہتا ہے، اس کا اشارہ تھا کہ میں انھیں دیکھنے نکلوں، لہٰذا

میں اپنی اہلیہ کو لے کر دیارِ مقدّس کی سیر کو نکلا۔ یہ محض کہنے کی بات نہیں، مشاہدہ و تجربہ اور واردات دل کی بات ہے۔ یہ حق کی بات ہے کہ دیدۂ شوق کے لیے مکّہ مکرّمہ کی فضا آج بھی پیکرِ حُسن و نُور کی حُسن پاشیوں سے منوّر و نظر افروز ہے۔ گوشِ حق نیوش ہو تو دیارِ مقدّس کی فضا میں آج بھی پیکرِ صدق و صفاؓ کی "صدائے اللّٰہُ ہُو" کی گونج سنائی دیتی ہے۔ جمالیاتی حِس زندہ و فعّال ہو تو نکہتِ جسمِ اطہرؐ آج بھی اس وادیٔ حُسن و عشق میں عنبر فشانی کرتی محسوس ہوتی ہے۔ حق یہ ہے کہ دل میں جذب و شوق اور نیّت میں حُسن و خلوص ہو تو آپؐ کے دمِ مسیحائی سے آج بھی زندگی ملتی ہے، بلکہ سب کچھ ملتا ہے، آپؐ بھی ملتے ہیں، جو سب کے ہادی و مسیحا اور رحمۃٌ لّلعالمین ہیں، اور "دوست" بھی ملتا ہے، جو سب کا اِلٰہ (یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ العالمین ہے۔

بات فلسفے کی نہیں، حکمت کی ہے، جذبہ و خواہش کی نہیں، صدق و ایمان کی ہے۔ خواب و خیال کی نہیں، مشاہدہ و تجربہ کی ہے کہ حُسن و عشق ہی اصلِ ایمان، غایتِ زندگی اور دولتِ دل ہیں، نیز سوزِ مہرِ عشق اور تاثیرِ برقِ حُسن ہی سے رُوح نظر بن کر دلِ وجود کو چیرتی اور حریمِ ذات میں پہنچتی اور "دوست" کا مشاہدہ کرتی ہے۔ دیارِ "دوست" کیا ہے؟ اس کی حقیقت تو وہی جانتا ہے۔ میں تو صرف اس قدر جانتا ہوں کہ یہ برقِ حُسنِ بے مثال ہے، جس کی تاثیر میں سحر انگیز لذّتِ عشق و مستی، وجد آفرین کیف و سُرور، حیرت انگیز نشاط و طرب اور روح پرور طمانیت و سکینت، نیز حیات و قیومیّت ہے۔ بہائے نظّارہ ہزار فردوسِ بریں اور ہزار جانیں بھی ہوں تو سرمۂ مفتِ نظر ہے۔ اصل یہ ہے کہ حریمِ ذات جمال و جلال اور حیات و سُرور کا بحرِ بیکراں ہے، جس میں رُوح حبابِ حُسن و سُرور بن کر قیام تو کرتی ہے، مگر فنا ہوتی ہے نہ معدوم۔

کُوچہ بکُوچہ، کُو بکُو

میں دیدۂ شوق و حیران بن کر اُس دیارِ مقدّس میں نقوشِ حُسن و عشق کی تلاش میں نکلا تھا جو میرے ہادی و رہنما

اور محسن و مسیحا پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا مولد و منشا تھا، اور جس میں آپؐ نے اپنی عُمرِ عزیز کے باون برس گزارے تھے۔ یہی قریۂ حُسن و عشق تھا جس میں آپؐ منصبِ نبوّت و رسالت سے سرفراز ہوئے تھے، جس میں آپؐ نے تحریکِ اسلام یا تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی بنیاد رکھی تھی اور اُسے دشمنوں کی خون آشام تلواروں اور زبان کے دلدوز تیروں کے سائے میں چلایا تھا۔ اسی وادیِ مقدّس میں ابلیس و شیاطین نے جو معاشرتی بُرائیاں اور مشرکانہ عقائد پھیلائے اور رسومات رائج کی تھیں، ان کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تھا اور شمعِ توحید روشن کی تھی۔

ہم نے اُن گلیوں، کوچوں اور بازاروں کی زیارت کی، جنھوں نے آپؐ کے قدم چُومے تھے اور جن کی فضائیں آپؐ کے جسمِ اطہر کی نکہتِ جانفزا سے معطّر اور آپؐ کی آواز کی برقِ حُسن سے منوّر ہوئی تھیں۔ ہر گلی کوچے کا ذرّہ ذرّہ اہلِ جذب و شوق کے لیے خورشیدِ جمال تھا، جنھیں چُومنے اور آنکھوں سے لگانے کو دل چاہتا تھا۔ عشق و مستی میں یہی نہیں، اس سے بڑھ کر بھی ہوا کرتا ہے۔ ہم نے ان گلیوں کو بھی دیدۂ شوق سے دیکھا، جن میں آپؐ کے خلفائے راشدینؓ اور دیگر اعزّہ و اقارب رہتے تھے۔ اب وہ نقشہ بدل چکا ہے، لیکن مقام تو بہرحال وہی ہے۔ زمان بدل گیا ہے، مکان تو وہی ہے، فضا تو وہی ہے، اور اس میں آپؐ اور آپؐ کے صحابۂ کرامؓ کے نقوشِ حُسن و عشق مرتسم ہیں۔

دیارِ مقدّس کی سیر کرتے کرتے مجھے ایسا لگا جیسے میں عہدِ رسالت مآبؐ میں پہنچ گیا ہوں۔ وہی گلی کوچے، وہی مناظر اور وہی لوگ تھے، اور ان میں آپؐ ماہِ حُسن و صُورت بنے جلوہ افروز تھے۔ آنکھیں آپؐ (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کے جمالِ دل فروز سے خُنک و منوّر اور مشامِ جاں آپؐ کی نکہتِ جسمِ اطہر سے معطّر ہو گئی۔ چونکہ سہ

تاثیرِ برقِ حُسن اُن کے سخن میں تھی
اِک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

رُوح آپؐ کی آوازِ فردوسِ گوش سن کر وفورِ مسرّت و اشتیاق سے مچلنے لگی۔ "ددست" کا فیضانِ نظر تھا کہ دل آپؐ کے حُسن کی برقِ نظّارہ سوز کی تاب لا سکا۔ ماحول آپؐ کے نقوشِ حُسن و عشق کا نگارستان تھا۔ وہ نقوش ایمان افروز بھی تھے اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان بھی۔ اُن میں آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھی اور قلب و رُوح کا سوز و گداز بھی۔ ان میں ایسے نقوش بھی تھے جو بصیرت افروز بھی تھے اور عبرت کا سامان بھی۔

کاشانۂ نبوّتؐ یا قصرِ فردوس بریں

ایک مکان میں برقِ حُسن سی لہراتی دکھائی دی، ساتھ ہی وہاں سے ایک موجِ بُوئے عنبریں آئی اور مسحُور کر گئی۔ پھر گوشِ دل میں نوائے سروش آئی کہ یہ تمھارے محسن و مسیحا اور ہادی و رہنما ختمی مرتبت حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا حُسن المآب ہے۔ یہ اہلِ جذب و شوق ہی کی نہیں، ملائکہ کی بھی زیارت گاہ ہے۔ یہاں حُسن و نور کی بارش ہوتی رہتی ہے اور اس کی فضا نکہتِ گُلِ رسالت مآبؐ سے مہکتی رہتی ہے، لیکن اُن کے لیے جو اہلِ حُسن و عشق ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں کون ہُوں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ نظّارۂ برقِ حُسن، شمیمِ گُلِ نبوّتؐ اور آوازِ ہاتفِ غیبی نے مجھ پہ رقّت طاری کر دی، دِل بھر آیا اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔

سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا گھر محل نہیں، بنگلہ یا حویلی نہیں پتّھر گارے کا ایک چھوٹا سا مکان ہے، لیکن اہلِ حسن و عشق کی نظر میں یہ لعل و گوہر اور یاقوت و زمرّد کا قصرِ فردوسِ بریں ہے، جس کا مسالہ مشک و عنبر ہے۔ اس کے گلستان کا ہر پھُول حُسن کی صورت اور خوشبو جمالِ شمیم کی رُوح ہے۔ اب وہ نہ فرش تھا اور نہ وہ در و دیوار ہی تھے، جو آپؐ کے عہد میں تھے، لیکن فضا تو وہی تھی، زمین و آسمان تو وہی تھے،

اور ان میں آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کے نقوشِ حُسن و عشق تو مرتسم تھے۔ میں اور آپؐ کے مقدّس و مطہّر حُسن المآب میں؟ یہ خُدا ساز بات تھی۔ یہ واقعہ بھی ہے اور میرا مشاہدہ و تجربہ بھی، لیکن پھر بھی مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا۔ پھر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میرا ہادی و مسیحا رحمۃ للعالمینؐ اور میرا اِلٰہ ربّ العالمین ہے، جو جمیل و جلیل اور رحیم و کریم ہے اور اس کی رحمت بے پایاں، بخشش و کرم بے قیاس، جود و سخا بے حساب اور ظرف لامحدود ہے تو میری حیرت و تشکیک ایقان و تشکّر میں بدل جاتی ہے، اور مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے۔ پھر یہ احساس بھی میرے اس یقین کو محکم کرتا ہے کہ اگر "دوست" کی مجھ پر نظرِ لطف و کرم نہ ہوتی تو آپؐ کیوں مجھے اپنے اعجازِ یدِ بیضا سے میری موت سے پہلے مجھے مارتے، کیوں اپنے دمِ مسیحائی سے مجھے زندہ کرتے اور پھر کیوں مجھے اپنی سیرت طیبہ لکھنے پر مامور کرتے؟

حُسن و نُور، توحید و ایمان اور صدق و امانت کا یہ مسکنِ نبوّت آج بھی علم و حکمت کا گھر ہے۔ یہاں کتب خانہ قائم ہے۔ یہاں علم و عرفان بھی ملتا ہے اور حکمت و نظر بھی۔ یہاں خاتونِ جنّت اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبرٰی، آپؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک خاتونِ جنّت حضرت فاطمۃ الزھرا رضی اللہ عنہما رہتی تھیں۔ یہاں امیرالمومنین حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہٗ نے پرورش پائی تھی۔ یہاں رُوح القدس علیہ السّلام آپؐ کے لیے وحی و تنزیل لے کر تشریف لاتے تھے، اور ملائکہ کا نزول ہوتا تھا، جو شب و روز آپؐ پر درود و سلام بھیجتے تھے۔ یہ گھر تحریکِ اسلام کا مرکز تھا اور یہاں ہی سے توحید و رحمت کا سرچشمہ پھوٹتا تھا، جسے سارے عالم کو سیراب کرنا تھا۔ آپؐ کا یہ مسکنِ مبارک دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ آپؐ کتنی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ سادگی آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے، لیکن یہ بات مسلمان بھول گیا ہے۔ حقیقت یہ کہ وہ اُسوۂ حسنہ کے مفہوم سے کم آشنا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ جانتا ہے پر مانتا نہیں، اسی لیے وہ

ذلّت و مسکنت کا شکار ہے۔

زندگی کی حقیقت جذبہ و نظر میں مضمر ہے۔ جذبہ و نظر بدل جائے تو دُنیا بھی بدل جاتی ہے، ظاہر کی بھی اور باطن کی بھی۔ دل میں جذبۂ محبّت اور نظر میں حُسنِ محبوب ہو تو اُس کی ہر چیز معروضِ حُسن و محبّت ہوتی ہے۔ میرا آقا و مسیحا، پیکرِ حُسن و رحمت ﷺ ہے۔ میرا ناظورہِ زندگی بھی ہے اور منظورِ نظر بھی، ایمانِ آرزو بھی ہے اور جانِ تمنّا بھی۔ میں آپ ﷺ کے حُسن المآب میں تھا۔ اُس وقت میرے جو جذبات و احساسات تھے انھیں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہُوں کہ اس وقت میری کیفیت ایسی تھی جیسے کوئی مہجور و تشنہ کام رہ نوردِ شوق دشتِ پُرخار میں اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہو کہ اچانک فیضانِ "دوست" سے اُس کے قصرِ رشکِ فردوس میں پہنچ جائے، جہاں اس کے لیے اَن دیکھی نعمتیں بھی ہوں اور اُس کی جانِ آرزو بھی۔ ظاہر ہے۔ محبوب کی جنّت سے نکلنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔ اگر نکلنا ہی پڑے تو دل پر کیا کیا قیامتیں نہیں ٹوٹیں گی؟ ہمیں بادلِ ناخواستہ جنّتِ محبوبِ الٰہی ﷺ سے نکلنا پڑا تو ہمارے دلوں پر بھی قیامت ٹوٹ پڑی، حسرت برقِ فنا بن کر خرمنِ دل پر گری اور متاعِ صبر و شکیب کو غارت کر گئی۔ رُخصت ہونے سے پہلے میری چشمِ قلب نے جہاں جہاں پیکرِ حُسن نور ﷺ کے نقوشِ پائے مبارک دیکھے، وہاں سے خاکِ مقدس و عنبریں اُٹھائی، اُسے لب و رخسار اور چشم و پیشانی سے لگایا ہی تھا کہ ایک بے صوت صدا آئی: یہ تمھارے ہی محسنِ کائنات، مسیحائے دوراں اور پیکرِ حُسن و رحمت ﷺ کی خاکِ پائے مبارک ہے۔ اس میں زندگی، رحمت اور شفا ہے۔ اسے سینے سے لگاؤ اور دل پر ملو۔ "دوست آشنا" رُوح نے آواز پہچان لی۔ میرا اُس جوہرِ حُسن و رحمت کو سینے سے لگانا اور دل پر ملنا تھا کہ میرے اندر طمانیت و سُرور کی ایک لہر دوڑ گئی، جس میں اتنی شدید کیف پرور و نشاط انگیز ٹھنڈک تھی کہ رُوح مسحور ہو گئی۔ اس ٹھنڈک کی کیفیت کو نہ فلاسفر سمجھ سکتے

ہیں نہ سائنس دان۔ اس کا ادراک نہ تجربیّت پسند مفکّرین کر سکتے ہیں اور نہ عقلیّت پسند اہلِ علم و دانش۔ اس ٹھنڈک کی لذّت و کیفیّت کو اہلِ جذب و شوق ہی جانتے ہیں، جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

شاید جنّت سے نکلنا اولادِ آدم کا مقدّر ہے۔ ہم امیرِ جنّتؑ کے قصرِ حُسن و رحمت سے رُخصت ہونے لگے تو رُوح بیک وقت دو کیفیات سے گزر رہی تھی۔ وہ اپنے ناظورِ حیاتؑ کے نقوشِ حُسن و عشق کی تاثیر سے کیف آور ٹھنڈک بھی محسوس کر رہی تھی اور احساسِ جدائی کے سوز سے چُھنک بھی رہی تھی۔ ہم حسرت بھری نظروں سے اُس کے در و دیوار دیکھتے ہوئے کوئے حبیبؐ سے رخصت ہوئے۔

آج ہمیں اور بھی بہت کچھ دیکھنا تھا، لیکن دیکھ نہ سکے۔ نقوشِ پیکرِ حُسن و عشقؑ دیکھنے کے بعد دل کو کچھ اور دیکھنا منظور نہ تھا۔ ہم سیدھے ہوٹل پہنچے۔ کچھ دیر حسین یادوں میں کھو گئے۔ پھر "دوست" نے یاد کیا اور ہم اُس کی آوازِ دلکش کے پیچھے یوں چلنے لگے جیسے از خود رفتہ مجنوں جرسِ ناقۂ لیلیٰ کا پیچھا کر رہا ہو۔ ہم حریمِ "دوست" میں پہنچے تو نکہتِ "دوست" نے ہمارا استقبال کیا، کیونکہ ہم اس کے مہمان تھے۔ میزبان "دوست" ہو، "دوست" خُدا ہو اور خُدا بے اِنتہا مہربان و مہمان نواز ہو اور مہمان گدائے بے نوا و تشنہ کامِ محبّت ہو تو پھر اُسے شادی مرگ نہ ہو، محال ہے۔ ہم خوشی سے مر گئے ہوتے اگر "دوست" کو ہمارا عالمِ جذب و شوق میں تڑپنا اور اُسے یاد کر کر کے رونا منظور نہ ہوتا۔

محبّت میں رونا کیوں آتا ہے؟

ایک دن میں نے "دوست" سے پُوچھا: "محبّت میں رونا کیوں آتا ہے؟ فراق میں رونا آئے تو بات ہوئی، لیکن محبوب ملنے پر رونا کیوں آتا ہے؟ "دوست" کی یاد بلاشبہ وجۂ طمانیت و مسرّت ہے۔ لیکن اُس کی یاد سے رونا کیوں آتا ہے؟ "دوست" کا

گھر رُوح کی جنّت ہے، لیکن اس جنّت میں رونا کیوں آتا ہے؟ دیوارِ "دوست" کا سایہ، سایۂ طوبیٰ سے زیادہ کلیجے کی ٹھنڈک اور رُوح کا سُرور ہے، لیکن اس میں بیٹھ کر رونا کیوں آتا ہے؟ آبِ زمزم، آبِ حیواں ہے اور تشنہ کامانِ محبّت کو سیراب کرتا ہے، لیکن اُسے پی کر رونا کیوں آتا ہے؟ طوافِ اہلِ عشق و وفا کا رقصِ جاں نثاری ہے، جس سے زندگی اور اس کی مسرّتیں ملتی ہیں، لیکن اس میں رونا کیوں آتا ہے؟ ندا آئی:

"گریہ تاثیرِ سوز و سازِ محبّت ہے اور یہ ہر حال میں اہلِ جذب و شوق کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، چاہے گریۂ غمِ فراق ہو یا گریۂ مسرّتِ وصال۔ سنو! ہر اشکِ محبّت "دوست" کی نظر میں گوہرِ بے بہا ہے، جس کا صلہ سوز و سازِ زندگی ہے۔ سوز سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے اور ساز سے گلستانِ دل میں طمانیّت و مسرّت کے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ گریہ سے درِ اجابت وا ہوتا، آہ رسا اور دُعا مُستجاب ہوتی ہے۔ اس سے دل کی آنکھ کھلتی، نورِ نظر کی تکمیل ہوتی اور دیدِ "دوست" میسّر آتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ بندے جو گریۂ محبّت کی لذّت سے سرشار رہتے ہیں۔"

"حریمِ دوست" کی ایک اور خاص بات

"حریمِ دوست" کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہاں ہر صبح و شام نئے اور پُراسرار چہرے نظر آتے ہیں۔ وہ جو پُراسرار ہوتے اور بصورتِ بشر ہونے کے باوجود ما فوق البشر سے لگتے ہیں۔ ان میں بعض کی نظریں حُسن فشاں اور بعض کی شعلہ فشاں ہوتی ہیں اور چہرے کے گرد نُور کا ہالہ ہوتا ہے۔ کچھ خاموش و دم بخود اور کچھ محوِ آہ و فغاں ہوتے ہیں۔ بعض کی آنکھیں خشک و غبار فشاں اور بعض کی خونِ نابہ فشاں ہوتی ہیں۔ کچھ "دوست" کے "خانۂ نور" کے گرد پروانوں کی طرح گھومتے رہتے اور کچھ اس کی نور افشانی کا تماشا کرتے رہتے ہیں۔ ان پُراسرار ہستیوں کی حقیقت معلوم نہ ہو سکی۔ ہم حسبِ معمول عشاء کی نماز تک "جلوہ گاہِ دوست" میں

رہے، اور اس کے حُسن کے تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو نظاروں سے کیف و سُرور حاصل کرتے رہے۔ "دوست" کی تاثیرِ برقِ حُسن سے شمعِ جذب و شوق کی لَو تیز، اور نور کی تکمیل ہوتی رہی اور دل میں مسرّتوں کے پھُول کھلتے رہے۔ اہلِ جذب و شوق کی طرح ہم بھی "دولتِ دوست" لُوٹتے اور اُس سے دامنِ حیات کو بھرتے رہے۔ اس عالم میں وہاں سے جانے کو دل مانتا تو نہیں تھا، لیکن جانا بھی ضروری تھا۔ بندہ آزاد و خود مختار ہی سہی، مجبور و بے بس بھی بہت ہے۔ میں حُسن و نور کی بارش میں شرابور، صہبائے دیدِ "دوست" کے نشے میں سرشار، ملکوتی و اُلوہی نظاروں کو مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہوئے روضۂ فردوسِ ارضی سے اس طرح نکلا، جیسے کوئی مجبور و بے بس تشنہ کام محبّت شبستانِ دوست سے رخصت ہوتا ہے۔

ساقی گری ہو تو ایسی ہو

ساقی "دوست" ہو اور "دوست" روحِ حُسن و رحمت بھی ہو اور جانِ آرزو بھی، وہ پروردگارِ رحیم و کریم بھی ہو اور میزبان بھی، پھر اُس کا گھر میخانۂ فردوسِ بریں ہو اور شراب جوہرِ کیف و سُرور بھی ہو اور حسین و طہور بھی، اُس کے رند اہلِ ذوق و شوق ہوں اور وہ ہر وقت مائل بہ کرم ہو تو پھر اس کی ساقی گری سے کوئی محروم و تشنہ کام کیسے رہ سکتا ہے؟ پھر کس رند کا اپنے میخانۂ "دوست" سے نکلنے کو دل چاہے گا؟ ہم تہجّد سے عشاء تک اپنے ساقی کے حضور رہتے اور اس کی ساقی گری سے مستفیض و لُطف اندوز ہوتے، نیز اس کی شرابِ دید سے سرشار بھی رہتے۔ اس سرشاری و سرمستی میں نہ تن بدن کا ہوش رہتا اور نہ دُنیا و مافیہا کا۔ رُوح "دوست" کی ہم آغوشی کے لیے مچلتی تو اُس کے در و دیوار کو سینے سے لگاتے، اور اس کے سنگِ آستاں کو، جو گوہرِ شاہوارِ جنّت ہے، چُومتے اور آنکھوں سے لگاتے۔ جب روح وفورِ جذب و شوق میں "دوست" پر فدا ہو جانے کے لیے بے قرار ہو جاتی تو اُس کی بلائیں لینے کی خاطر ہم اُس کا طواف

کرنے لگتے۔ فداکاری و جاں نثاری کی یہ رسمِ عاشقی ادا ہوتی رہتی۔ جب مہرِ نیم روز کی تن سوز تمازت، مطاف کے فرشِ پاسوز کی آتشِ خاموش اور گرمیٔ جذبِ دروں سے تشنگی شکیب رُبا ہوجاتی اور جسم و جاں بے قرار ہوجاتے تو آبِ زمزم، جو "دوست" کی صہبائے طہور ہے، پیتے، جس سے کلفت دُور ہوجاتی اور جسم و جاں کو ایسی تسکین پہنچتی کہ ہم تازہ دم ہوجاتے۔

میخانۂ "دوست" میں ساقی کی کرم گستری کی کوئی انتہا نہ تھی اور کوئی رندِ بلا نوش بھی تشنہ کام نہ رہتا۔ اُس کے رندوں کے لیے ہر شب، شبِ برأت اور ہر روز، روزِ عید تھا، چونکہ ہر ساغرِ صہبا آئینہ دار روئے "دوست" تھا، اس لیے ہر رند اہلِ نظر و صاحبِ حُسن و سُرور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ روح ہر وقت میخانۂ "دوست" میں رہنے اور بادۂ حُسنِ "دوست" سے سرشار رہنے پر جان دیتی تھی۔ نیند نفس کے لیے مقدّر نہ ہوتی تو میخانۂ "دوست" میں شب بیداری و میخواری ہمارا معمول ہوتا۔ موت کی طرح نیند بھی نفس کی تقدیر ہے۔ نیند کی بے خودی و از خود رفتگی میں ہلکا سا ذائقۂ موت ہے۔ قدرت نفس کو موت سے پہلے اس کی لذّت سے آشنا کرتی ہے تاکہ اُسے موت یاد رہے۔ موت کی یاد سے انسان اپنی اوقات نہیں بھولتا، خدا نہیں بھولتا، اور نہ اُس سے بے خوف ہی ہوتا ہے۔ موت کی یاد سے آخرت کی ابدی زندگی نگاہ میں رہتی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اُسے جنّت کے بجائے دوزخ میں گزارے، جہاں وہ زندگی کی لذّت سے آشنا ہوگا نہ موت کی لذّت سے۔ علاوہ بریں، موت کی یاد انسان کو زندگی کی غرض و غایت کی یاد دلاتی ہے، اور اس میں اس حقیقت کا احساس و شعور پیدا کرتی ہے کہ یہ دُنیا مُسافر خانہ ہے، جس میں انسان کو چند روزہ مسافر کی طرح رہنا چاہیے، لہٰذا اس سے نہ دل لگانا چاہیے، نہ اس میں دوسروں کے لیے جائیدادیں بنانا اور نہ مال و دولت ہی چھوڑنا چاہیے، بلکہ دولتِ دل حاصل کرنی چاہیے، جس کے عوض

ابدی زندگی گزارنے کے لیے جنّت ملتی ہے ۔ جنّتِ دوست کا سرمدی مہمان خانہ ہے ، جس میں اُس کے بندے ہمیشہ اُس کے مہمان بن کر رہیں گے ۔ اس اَن دیکھی حسین و بےنظیر تفرّج گاہ میں اَن دیکھی اور اَن سُنی خوب سے خوب تر نعمتوں کے علاوہ اہلِ حُسن و سرُور کی کی رفاقت اور سب سے بڑھ کر "دوست" کی دید نصیب ہو گی ۔

موت کی یاد سے ابلیس انسان سے دُور بھاگتا ہے اور بندہ اپنے اِلٰہ و ربّ کے قریب ہوتا جاتا ہے ۔ نیز اس سے جذبۂ تکاثُر و خود پرستی سرد پڑ جاتا ہے، نام و نمود، عزّت و شہرت، قوّت و اقتدار اور سطوت و حکومت کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے ۔ شاید اسی لیے نیند جو موت کی مثیل ہے نفس کا مقدّر ہے ۔ چنانچہ عشاء کے بعد شبستانِ "دوست" سے ہوٹل کی خوابگاہ میں جانا، گویا ہمارا مقدّر تھا ۔

پھر کوُئے جاناں میں

ایک تو ہمارے پاس وقت مختصر تھا اور دُوسرے "دوست" ہمیں اپنے گھر سے باہر جانے ہی نہیں دیتا تھا ۔ وہ ہمیں اپنی ساقی گری و جلوہ فروشی سے بےخود و سرشار بنائے رکھتا، لیکن ہمیں اس کے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے نقوشِ حُسن و عشق دیکھنے تھے، لہٰذا آج ہم صبح کا ناشتا کر کے پھر کوُئے جاناں کو چلے ۔ کل کی طرح آج بھی ہم جب کاشانۂ نبوّتؐ میں میں حاضر ہوئے تو میری نظر پھیر گئی دلِ وجود ۔ میں نے پھر وہی نظّارے دیکھے جو پہلے دیکھ چکا تھا اور اسی کیفیّت سے گزرا جس سے کل گزرا تھا ۔ آج بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ملی اور لذّتِ گریہ بھی، طمانیت و سکینت بھی ملی اور لذّتِ جذب و مستی بھی، درد و سوز بھی ملا اور کیف و سرور بھی ۔ ہم نفس گُم کردہ بھی رہے اور گریہ کناں بھی ۔ میں نے حال کے مناظر بھی دیکھے اور ماضی کے نظّارے بھی ۔

محلّہ مُسفلہ یا کوُئے صدق و صفا

میں ان نظّاروں میں کھو جانا چاہتا تھا، لیکن "دوست" کو یہ منظور نہ ہوا ۔ نظّارے

جاتے رہے اور یہیں کوئی قوتِ غیبی کوئے جاناں سے کشاں کشاں کوئے صدق و وفا میں لے گئی، جسے محلّہ مُسفلہ کہتے ہیں۔ یہاں نقوشِ صدق و وفا ہیں۔ یہاں حضور پرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یارِ غار و ہمراز حضرت ابوبکر صدّیق اور آپؐ کے معتمدِ خاص و دستِ راست حضرت عمر فاروقِ اعظم رضوان اللہ عنہما کے مکان ہیں، جو حکومتِ سعودی عرب کے محکمۂ اوقاف کی تحویل میں ہیں۔

مسکنِ صدّیقِ اکبرؓ یا جلوہ گاہِ صدق و وفا

پہلے ہم نے حضرت صدّیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہُ کے آستانۂ صدّیقیّت پر حاضری دی۔ مقامِ نبوّت کے بعد صدیقیّت عبدیّت کا بلند ترین مقام ہے، جس کی منتہائے رفعت پر حضرت ابوبکر صدّیقؓ متمکن ہیں۔ آپؐ کے اعلانِ نبوّت سے پہلے وہ آپؐ کے دوست تھے، اور بعد میں انھیں ہمراز و معتمدِ خاص، یارِ غار و رفیقِ ہجرت اور خلیفۂ اوّل ہونے اور آپؐ کے روضۂ مبارک میں آپؐ کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت ابوبکر صدّیقؓ کا مکان علامت ہے صدّیقیّت کی، یعنی صدق و ایمان اور وفاداری بشرطِ استواری کی۔ نیز یہ نقوشِ حُسن و عشق کی جلوہ گاہ اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مولد و منشا ہے۔ ہجرت کی تاریخ ساز رات جب پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم محاصرین سے بچ کر اپنے گھر سے نکلے تو سیدھے یہاں ہی تشریف لائے تھے، اور یہاں ہی سے آپؐ نے اپنے ہمراز و یارِ وفادار حضرت صدّیقِ اکبرؓ کے ساتھ عہد آفرین سفرِ ہجرت کا آغاز کیا تھا۔ اس اعتبار سے اسے اوّلین مقامِ ہجرت کی فضیلت حاصل ہے۔ اس کی دوسری فضیلت جو اہلِ صدق و ایمان کے نزدیک سب سے بڑی ہے، یہ ہے کہ قصرِ نبوّتؐ کے بعد وہ پہلا گھر ہے جس میں ایمان و توحید کی شمع روشن ہوئی تھی، اور یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ واقعی صدّیق تھے، کیونکہ قرآنِ حکیم کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد صدّیق کا مقام ہے۔

اس حقیقت کا دُوسرا ثبوت یہ ہے کہ چونکہ نبوّت و صدّیقیّت لازم و ملزوم ہیں، لہٰذا نبی کریم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے راہِ ہجرت میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ ہی کو اپنا ہمراز و دستِ راست اور ہم سفر و یارِ غار بنایا تھا۔

آستانۂ صدّیقیّت کو چونکہ قصرِ نبوّت کے بعد پہلا بیت الایمان اور دارالسّلام بننے کا شرف حاصل ہے، اور یہ جمیل و جلیل اِلٰہ و ربّ کے حبیب و پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نقوشِ حسین و مبارک کا امین ہے، اس لیے یہ اہلِ صدق و ایمان، اصحابِ حُسن و نظر اور اربابِ جذب و شوق کا معروضِ حُسن و محبّت اور ان کی زیارت گاہ ہے۔ ہم وہاں پہنچے تو شمیمِ خُلدِ بریں کا ایک جھونکا آیا اور مشامِ جاں کو معطّر کر گیا۔ اس کے اندر داخل ہوئے تو ماحول کو صدّیقیّت کی شمعِ فروزاں سے منوّر اور اس کے گُلِ عشق و وفا کی بُوئے مشکیں سے معطّر پایا۔ روح کو ایک عجیب قسم کی تسکین آفریں و کیف پرور ٹھنڈک پہنچی اور میں مسحور ہو گیا۔ میری چشمِ تصوّر کے سامنے ہجرت کے واقعات کی "تصویرِ رواں" متحرک ہو گئی۔ میں نے تاریخ کے عظیم ترین انسان اور رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کو تاریخ کا حسین ترین و ہمہ گیر انقلابِ رحمتِ عالم لانے کے لیے سوئے یثرب گامزن دیکھا۔ نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم ناقۂ خوش نصیب پر اپنے دوست صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے ہم رکاب تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نے جب بھی دیکھا، نبوّت و صدّیقیّت کو سفر و حضر، رزم و بزم اور امن و خطر میں یک جان و دو قالب ہی دیکھا۔

یہ صدّیقیت کی تاثیرِ برقِ حُسن تھی کہ میرا دل صدق و صفا سے چمک اُٹھا اور دل و جاں پر ایک کیفیّتِ سرخوشی طاری ہو گئی۔ دل جلوۂ صدیقیّت سے نکلنا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن نکلنا تو بہرحال تھا ہی۔

آستانۂ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ یا جلوہ گاہِ جلالتِ اسلام	وہاں سے نکلے تو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے آستانۂ مبارک پر پہنچے۔ یہ بھی ایک چھوٹا اور سادہ سا مکان ہے۔ یہ اُس عظیم القدر ہستی کا گھر تھا، جسے اللہ جلّ شانہٗ نے حق و باطل میں امتیاز کرنے کی بصیرت عطا کی تھی، اس لیے حضرت عمرؓ کو فاروقِ اعظم کا لقب ملا، جسے بقائے دوام حاصل ہے۔ اصل یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی صدّیقیت اور حضرت عمرؓ کی فاروقیّت کے نقوشِ جمیل و جلیل لوحِ دہر پر اس طرح مرتسم ہیں کہ اس کی طرح انھیں بھی ثبات و دوام حاصل ہے۔

ہم آستانۂ فاروقیّت میں داخل ہوئے تو اس کی ہیبت و جلالت سے ایک لرزشِ خفی میرے سارے بدن میں تھی۔ یہ چونکہ جلالت وسطوتِ اسلام کا قصرِ ایمان افروز ہے، اس لیے یہ اہلِ صدق و ایمان کا ناظورِ ہستی اور قرّۃُ العین، نیز ان کی زیارت گاہ ہے۔ اس کا ہر نقشِ عشق و وفا صیرفیِ حق و باطل ہے اور زبانِ حال سے پُکار پُکار کر کہتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حبیبؐ ربِّ جلیل کے یارانِ صدق و صفاؓ کے کوئے عشق و وفا سے نکلے تو دل سوز و ساز سے اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں۔

بیتِ ارقمؓ یا تحریکِ اسلام کا مرکزِ اوّل

آج میں اکیلا ہی ایسی از بس اہم تاریخی یادگار دیکھنے گیا، جسے تحریکِ اسلام کی سرگرمیوں کا مرکزِ اوّل بننے کا شرف حاصل ہے۔ یہ ناظورۂ اہلِ حُسن و نظر حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر ہے، جو آپؐ کے اوّل صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم میں سے ہیں۔ مدینہ منوّرہ میں حضرت ایّوب انصاریؓ اور مکّہ مکرّمہ میں حضرت ارقمؓ کے گھر کی تاریخی اہمیّت اور فضیلت اس سے کہیں زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ یہ دیکھنے میں سادہ اور مختصر مکان ہے، لیکن دانائے راز اور اہلِ عشق و وفا کی نظر میں

عہد آفریں اہمیت اور غیر معمولی عظمت و شرف کا حامل ہے۔ یہ وہ مقدس آستانۂ عالیہ ہے، جہاں آپؐ اور تحریکِ اسلام کے فدائی جمع ہوا کرتے تھے، اور آپؐ ان میں قرآنِ حکیم کا ذوق و شوق پیدا کرتے، انھیں تعلیم و تربیت دیتے، حکمت سکھاتے، ان کا تزکیہ کرتے، انھیں عبادت کرنے کا طریقہ سکھاتے اور حسین و رحمت مداماں عالمگیر و ہمہ گیر انقلاب کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتے، نیز انھیں انقلاب آفریں تحریکِ اسلام کو کامیابی سے چلانے کے لیے تیار کرتے۔

تحریکِ اسلام کو مکہ مکرمہ میں بالخصوص بڑے ہی صبر آزما، بلکہ شکیب رُبا تجربات سے گزرنا پڑا تھا، اور اس کے فدائیوں کو بڑے مصائب و شدائد برداشت کرنا پڑتے تھے، لہٰذا اُسے خفیہ طور سے بھی چلانا پڑتا تھا۔ اس اعتبار سے بیت ارقمؓ تحریکِ اسلام کی زیرِ زمیں سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اسی مرکزِ جذب و شوق دانائے راز و صاحبِ دید بانیٔ تحریکِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آرزو پوری اور دُعا مستجاب ہوئی تھی، اور حضرت عمرؓ حلقہ بگوشِ اسلام اور مبتلائے عشقِ رسولِ مقبولؐ ہوئے تھے، اور ان کے جوش و خروشِ ایمانی کے صلے میں آپؐ نے اُن کو "فاروق" (حق و باطل میں امتیاز کرنے والا) کا لقب عطا کیا تھا، جن کی قسمت میں بقائے دوام لکھی تھی۔ یہ اس اعتبار سے تاریخ ساز واقعہ ہے کہ آپؐ کے فیضانِ نظر سے حضرت عُمر فاروقِ اعظمؓ دُنیا کی عظیم و تاریخ ساز شخصیت ثابت ہوئے، اُنؓ کے عہدِ خلافت اور قیادت میں تحریکِ اسلام ایشیا اور افریقہ کے برّاعظموں میں پھیل گئی اور اُنھوںؓ نے تاریخِ عالم کا رُخ صحیح سمت موڑ کر انسانیت کی تقدیر بدل ڈالی۔

میں وہاں پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بارگاہِ حضورِ رسالت مآبؐ میں حاضر ہوں۔ میرے دیدۂ شوق و حیراں نے آسمانِ انسانیت کے ماہِ کاملؐ کو اپنے مدار کے نجومِ تابندہ و پایندہ کے ساتھ جلوہ افروز دیکھا۔ حُسن و عشق کا ہر نظارہ بصیرت افروز و

جنّتِ نگاہ اور ہر آدائے جذب و شوق ایمان افروز و فردوسِ گوش تھی۔ اسلام کی تحریکِ رحمۃٌ لِلعالمینی جو تحریکِ انقلاب بھی تھی، اس کا ہر کارکن لذّتِ ایمان سے سرشار، پیکرِ خلوص و صدق اور مجسمۂ ایثار و قربانی تھا۔ ان کے جوش و خروش کا نظّارہ دیدنی تھا۔ فضا آپؐ کے حُسن و نُور سے منوّر اور بُوئے عنبریں سے معطّر تھی، اور اس میں نورانی سائے جلوہ فگن تھے۔ نظر شہیدِ نظّارہ اور رُوح مسحور ہو گئی۔ یہ مرکزِ عشق و وفا اہلِ جذب و شوق کی زیارت گاہ ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا، اور اس سے وہ ہمیشہ آنکھوں کی ٹھنڈک، رُوح کا حُسن و سُرور اور سوز و سازِ زندگی حاصل کرتے رہیں گے۔

جنّتُ المُعلّٰی

دُنیا کی عظیم ترین تحریکِ انقلابِ رحمت کے علمبرداروں کے مرکز سے نکل کر میں اُن کی آخری آرام گاہیں دیکھنے کے لیے جنّتُ المُعلّٰی گیا، جو اہلِ مکّہ کا مشہور قبرستان ہے، جس طرح جنّت البقیع اہلِ مدینہ کا گورستان ہے۔ اس کے ایک احاطے میں رسولِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا آبائی قبرستان ہے، اور دوسرے میں صحابۂ کرام رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین محوِ استراحت ہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے سلام کیا تو شمیمِ جانفزا کا ایک جھونکا آیا اور مشامِ جاں کو معطّر کر گیا۔ اس جنّتِ ارضی کی خستہ حالی کا منظر بڑا ہی عبرت آموز و رقّت انگیز تھا۔ اُسے دیکھ کر بے اختیار رونا آیا اور رقّت طاری ہو گئی۔ ماحول میں پُراسرار و معنی خیز خاموشی تھی۔ مجھے بے ثباتیِ حیات کا خیال آیا تو اہلِ عشق و وفا کے بے نام و نشان آرام گاہوں سے ندا آئی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

پھر ہاتفِ غیبی نے کہا: "موت راہِ عشق و وفا کے شہیدوں پر حرام ہے۔ عشق نفس کو اپنے سوز کی کٹھالی میں پگھلا کر ہر آلائش اور کھوٹ سے پاک و منزّہ کر کے "خالص"

زندگی عطا کرتا ہے ؟ اور "خالص زندگی" عبارت ہے لذّت و سُرور کی حسین و منوّر حیاتِ ابدی سے ۔ یہ اہلِ جذب و شوق زندۂ جاوید ہیں ۔ یہ فردوسِ بریں میں اپنے ربِ جمیل و کریم کے مہمان ہیں ، جہاں وہ اپنے ایمانِ آرزو اور جانِ تمنّا اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں ایسی حسین و سُرور انگیز زندگی گزار رہے ہیں ، جس کا اس دُنیا میں کوئی جن و بشر تصوّر نہیں کر سکتا ۔ ان کے مزار بے نام و نشان ہی سہی ، لیکن ان کے نام اور نقوشِ ہستی لوحِ زمانہ پر اس طرح مرتسم ہیں کہ ہمیشہ زندہ و پایندہ اور تابندہ رہیں گے ۔"

اس ندائے سروش کے مختصر نقوش میں زندگی کی حقیقت درخشاں تھی ۔ اس آوازِ سحر انگیز کا اثر تھا کہ میرا باطن برقِ جلوۂ جمال سے منوّر ہو گیا ، اور زمان و مکان بدل گئے ۔ میری چشمِ باطن نے دیکھا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے محبوب و ساقیِ کوثر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی صحبت میں فردوسِ بریں میں جلوہ افروز ہیں ۔ عقل نے کہا : اہلِ حُسن و سُرور ، جو زندۂ جاوید ہوں اور جنھیں اپنے الٰہ و ربّ کی دید و حضوری اور سرورِ کائنات ؐ کی صحبت و رفاقت میسّر ہو ، اُن سے بڑھ کر خوش نصیب و کامیاب اور کون ہو سکتا ہے ، لہٰذا ان کے لیے آنکھیں اشکبار اور دل سوگوار ہو تو کیوں ؟ اندازِ فکر و نظر بدلا تو دل کی دُنیا میں حسین انقلاب اور روح کو قرار آ گیا ۔ میں نے خلوصِ دل سے فاتحہ پڑھی اور خشوع و خضوع سے دُعا مانگی : "میرے الٰہ و ربّ ! میں اس قابل تو نہیں ہوں ، لیکن تیری رحمت کا اُمّید وار ہُوں اور تو اپنی رحمتِ بے پایاں کے صدقے میرا حشر بھی ان اہلِ حُسن و سُرور کے ساتھ کر اور مجھے بھی ان میں شامل کر دے ۔"

مسجدِ جنّ اور ہستیِ پُراسرار

جنّت المُعلّٰی سے نکل کر میں نے مسجدِ جنّ کا رُخ کیا ، جو اس کے قریب ہی واقع ہے ۔ اس کی اہمیّت اس واقعہ کی وجہ سے ہے ، جس کا ذکر قرآنِ مجید کی سورۂ جنّ میں ہے ۔

یہاں ایک بڑا ہی پُراسرار اور غیر معمولی نوعیّت کا واقعہ پیش آیا، جس نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، اور جو حقیقت ہے مگر لگتا فسانہ ہے۔

مسجد سُنسان تھی۔ اس میں کسی متنفّس کے آثار نہ تھے۔ میں نے اسے اندر باہر سے دیکھا اور ژرف نگاہی سے دیکھا، اور پھر اس کے اندر دوگانہ پڑھنے لگا۔ نماز پڑھنے کے بعد دُعا مانگنے لگا تو کانوں میں برقِ حُسن آواز لہرائی۔ غور کے کانوں سے سُنا تو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی خوش الحان قاری تلاوتِ قرآنِ مجید کر رہا ہے۔ اُس کی آواز میں غضب کا سوز و گداز تھا۔ دل میں جذب و شوق کی آگ بھڑک اُٹھی، روح وجد و حال میں آ گئی۔ میں دُعا بھول گیا اور اُس ہستیِ مقدّس کو ڈھونڈھنے لگا جس کی تلاوت میں تاثیر برقِ حُسن تھی۔ آواز ساری مسجد میں گونج رہی تھی اور مسجد خالی تھی۔ میں حیران بھی تھا اور خوف زدہ بھی کہ یہ پُراسرار آواز کہاں سے آ رہی ہے کہ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ کونا جو تھوڑی دیر پہلے خالی تھا، اُس میں ایک پُراسرار بزرگ تلاوت کر رہے ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اُن کی قرأت میں اتنی حلاوت اور کشش تھی کہ میں بے اختیار اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ تلاوت کرتے رہے اور مجھ پر کیف و سُرور کی سحر انگیز کیفیّت طاری ہوتی گئی۔ وہ کانوں میں رس گھولتے رہے اور میری آنکھیں آنسو بہاتی رہیں۔ سُورت ختم ہوئی تو اُنھوں نے دستِ دُعا بلند کیے تو میں بھی دُعا مانگنے لگا، اور آمین کہتا رہا۔

وہ مردِ پُراسرار دُعا مانگ کر فارغ ہوئے اور میری آنکھیں اُن کی آنکھوں سے ملیں تو حیرت و دہشت سے جُھک گئیں۔ اُن کی آنکھیں شعلہ بار اور بُشرے میں پُراسرار اجنبیّت تھی۔ میرے دل میں ڈر بھی تھا، دہشت و حیرت بھی تھی، لیکن اُن سے باتیں کرنے کا اشتیاق بھی تھا۔ میں نے سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اُنھوں نے سلام کا جواب دیا، گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پُوچھا:

آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟

میں : پاکستان کے شہر لاہور سے ۔

وہ : وہ جو امرتسر کی سرحد پر ہے ؟

میں امرتسر کا نام سُن کر حیران رہ گیا اور کہا : ہاں ۔

وہ : آپ امرتسر کے رہنے والے تھے ؟

میں : ہاں ، لیکن آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟

وہ : میں ایک مدت سے یہیں رہتا ہوں ۔

میں : کیوں ؟

وہ : اس لیے کہ مجھے اس مسجد سے پیار ہے ۔ یہاں جنوں نے حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قرآن مجید سُنا تھا اور ایمان لائے تھے ۔ یہ اُن کے لیے یادگارِ رُشد و ہدایت ہے ۔

میں : کیا آپ نے کبھی جن دیکھا ہے ؟

وہ : ہاں ۔

میں : کیا جنات اب بھی اِس مسجد میں آتے ہیں ؟

وہ : ہاں ۔

میں : کیوں ؟

وہ : یہ اُن کی زیارت گاہ ہے ، جو مومن ہیں ۔

میں : کیا آپ اُنھیں پہچان لیتے ہیں ؟

وہ : ہاں ۔

میں : کیا آپ کو اُن سے ڈر نہیں لگتا ؟

وہ : نہیں ۔ مردانِ خود آگاہ و خُدا شناس غیر اللہ سے نہیں ڈرا کرتے ۔ (قدرے

توقف کے بعد) اکثر انسان تو جنوں پر یقین ہی نہیں رکھتے۔ انھیں وحشی یا صحرائی یا غیر مہذب دیہاتی انسانی مخلوق سمجھتے ہیں۔ آپ کا جنوں کے بارے میں کیا اعتقاد ہے؟

میں: میں تو جنوں کو غیر انسانی اور ناری مخلوق سمجھتا ہوں، لیکن کیا جن جو غیر مرئی مخلوق ہیں، انسانی صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں؟

وہ: کیوں نہیں؟

میں: جن انسانی صورت میں ہو تو اُس کی نشانی کیا ہوتی ہے؟

وہ: یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟

میں: تجسس و اشتیاق کی تشفی کے لیے۔

وہ: اس سے تجسس بھی بڑھے گا اور حیرت بھی۔ اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو مومن جن کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اُس کا بُشرہ آتشی رنگ کا اور آنکھیں شعلہ بار ہوتی ہیں۔

میرے مُنھ سے بے ساختہ نکلا: آپ کی طرح؟

یہ سُن کر وہ پریشان و مضطرب ہو گئے، اُٹھے اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ اُن کی اس غیر متوقع حرکت سے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا۔ پھر بھی میں چند لمحات کے توقف کے بعد اُن کے پیچھے لپکا، لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیے۔ وہ اس طرح غائب ہوئے کہ میں حیرت زدہ ہی نہیں، خوف زدہ بھی ہو گیا۔ وہاں صرف میں تھا اور مسجد کی پُر اسرار تنہائی اور ع

ایک لرزش سی تھی میرے سارے بدن میں تھی

یہ انوکھا اور ناقابلِ فراموش واقعہ اکثر یاد آتا ہے اور ساتھ ہی یہ سوال جواب مانگتا ہے کہ وہ پُر اسرار ہستی کون تھی؟

غارِ حراء یا اوّلین مقامِ وحی و تنزیل

آج ہمیں نقوشِ حُسن و عشق کی اُس مقدّس جلوہ گاہ کو دیکھنے کی آرزو تھی، جس کے خلوت کدے میں پیکرِ حُسن و عشق صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اپنے اِلٰہ و ربّ کی طلب و جستجو میں ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے، اور جہاں ناموسِ اکبر، روح الامین حضرت جبریل علیہ السّلام پہلی مرتبہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے پاس آپؐ کے "دوست" کا پیغام لے کر آئے تھے، اور آپؐ کو آخری خلعتِ نبوّت و رسالت سے آراستہ کیا تھا، نیز جہاں پہلی بار آپؐ وحی تنزیل کے انوکھے تجربے سے گزرے تھے۔ یہ ایک عالمگیر و ہمہ گیر اور حسین ترین و اہم ترین انقلاب کی تاریخی یادگار ہے اور غارِ حراء کے نام سے مشہور ہے، اور جس کوہِ مقدّس کی چوٹی پر واقع ہے، اُسے جبلِ نُور اور جبلِ رحمت کہتے ہیں۔ اس کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ یہ آپؐ اور وحی و تنزیل کے نقوشِ حُسن و نُور کی جلوہ گاہ اور مہبطِ رُوح القدس ہے اور اس پر انوار و تجلّیات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ غارِ حراء حرم شریف سے تقریبًا چار میل دُور ہے۔

اگرچہ میری نظر اس کا اندرونی منظر دیکھنے کی مشتاق اور دل جذبۂ شوق سے سرشار تھا، لیکن اس کے اندر داخل ہوا تو اس کی تنگنائے کی کیفیّت و ماحول کو دیکھ کر دل گرفتہ و حیران رہ گیا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال ستانے لگا کہ میرے ہادی و مسیحا اور ربِّ جلیل کے حبیبِ صادق صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کس کلفت و مشقّت میں یہاں شب و روز گزارتے اور عبادت کرتے ہوں گے۔ میں اس سوچ میں مستغرق تھا کہ ناگہاں دیکھا کہ تنگنائے حراء فردوسِ بریں کا ایک گوشۂ صد رنگ تھی، جس کی وسعت و پہنائی حدِّ نگاہ سے بھی ماوراء تھی۔ اس کی فضا میں رنگ و نُور کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ نظر قندیلِ نظّارہ اور رُوح مسحور ہو گئی۔ یہ گلشنِ نبوّت، جو حسین سے حسین تصوّر سے بھی زیادہ جمیل و دلکش اور سرور انگیز و رُوح پرور تھا، زیارت گاہِ اہلِ حُسن و سرور تھا، جن میں انبیاءؑ و رُسل

علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ صدیقین رض، شہداء رض اور صالحین رض بھی تھے۔ ان میں ملائکہ بھی تھے اور جنت کے دیگر مکین بھی۔ وہ دیکھنے میں بے شک غار تھا، لیکن اصل میں باغیچۂ فردوس تھا، جسے حسن و سرور کے مقدس سحر کدے سے تعبیر کر سکتے ہیں، اگرچہ یہ تعبیر و تشبیہ بھی ناقص ہے۔ بہرحال مقدر ہوتا تو وہیں کا ہو رہتا، لیکن یہ تو دوسرے ہی جہان کا منظر تھا۔ جب بھی اس کی یاد آتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گزری ہوئی زندگی کی طرح ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

زمانے کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے۔ مکہ مکرمہ کا شہر، اس کے کوچہ و بازار اور گھر بار بدل گئے، حرم شریف کا نقشہ بدل گیا کوہِ صفا و مروہ کی ہیئت بدل گئی، زیارت گاہیں بدل گئیں اور ان کے راستے بدل گئے، لیکن غارِ حراء بدلا نہ اس تک پہنچنے کا جادۂ ناہموار ہی بدلا، جو اسی طرح ڈھلواں، سنگلاخ اور دشوار گذار ہے۔ اہلِ جذب و شوق کی نظر میں اس پگڈنڈی کی اہمیت و فضیلت ہی کچھ اور ہے اور اس درجہ سے ہے کہ یہ آپ کا جادۂ مبارک ہے، اس پر آپ کے نقوشِ پا مرتسم ہیں، اس نے آپ کے نعلین مبارک کو چوما ہے اور پیکرِ نبوت و رسالت کا بارِ حسن و رحمت اٹھایا ہے۔ لیکن اکثر زائرین کی آرزو ہے کہ اس تاریخی جادۂ ناہموار کو ضعیف و ناتواں رہ نوردانِ شوق کے لیے بالخصوص، اس کے شایانِ شان ایک حسین و محفوظ زینے دار راستے میں تبدیل کر دینا چاہیے، جس کے دونوں جانب سنگِ مرمر کے مضبوط و دیدہ زیب جالی دار کٹہرے ہوں، نیز جبل الرحمت کی چوٹی کو ہموار کر کے اس پر تفریح گاہ بنانی چاہیے، جس میں زائرین کے آرام و راحت کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ اسی طرح اس کے نیچے دامن میں بھی زائرین کے لیے خوبصورت سیر گاہ بنانی چاہیے، جس میں کھانے پینے اور آرام و راحت کا معقول و مناسب بندوبست ہو۔

غارِ حرا عشقِ الٰہی، محبّتِ انسانیت اور سچّی سوچ کی زندہ علامت ہے۔ آپؐ ابھی تک رسمی طور پر نبوّت و رسالت پر فائز نہیں ہوئے تھے، لیکن آپؐ کا قلبِ مبارک دردِ انسانیت سے معمور تھا۔ آپؐ دیکھ رہے تھے کہ انسان اپنے حقیقی اِلٰہ و ربّ سے دُور و مہجور ہو چکا ہے اور اس نے اپنی خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنا لیا ہے۔ لوگ شرک و بُت پرستی کرتے ہیں اور اس میں اپنی نجات کو مضمر سمجھتے ہیں۔ اُمرا، سردار، جاگیردار، زمیندار اور سرمایہ کار لوگوں کا استحصال کرتے اور اُن کا خون چوستے ہیں اور معاشرہ اسے جائز و روا سمجھتا ہے۔ اکتناز و احتکار اور بُخل و سُود خوری نے قبائلِ عرب کی معاشی زندگی ابتر بلکہ اجیرن بنا رکھی ہے، غلامی کا رواج عام ہے اور غلاموں پر طرح طرح کے مظالم توڑے جاتے ہیں۔ عورت کی حیثیت ایک بکاؤ مال کی سی ہے۔ قبائل آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں اور خونریزی ان کی زندگی کا چلن بن چکا ہے۔ عوام پر سردار اور جاگیردار حکومت کرتے ہیں۔ شراب نوشی، قمار بازی اور حرام کاری کا عام رواج ہے۔ لوگ طہارت و حیا کے مفہوم تک سے ناآشنا ہو چکے ہیں۔ جزیرۃ العرب متعدّد قبائل میں منقسم ہے، جو ایک دوسرے کے حلیف بھی ہیں اور دشمن بھی۔ وہ قومیت یا ملّت کے تصوّر سے ناآشنا ہیں۔ مفلوک الحالی، جہالت، ناخواندگی ان کی قسمت کا لکھا بن چکا ہے۔ مختصر یہ کہ آپؐ کو غم تھا تو اس بات کا کہ عرب کے لوگ جو جاہل و ظالم، وحشی و خونخوار اور مشرک و بُت پرست تھے، انھیں مہذّب و بااخلاق، موحّد و مُحسن، خواندہ و عالم اور خوشحال و ترقّی یافتہ کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ انھیں متحد کر کے ایک ملّتِ واحدہ میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں ان کے اِلٰہ و ربّ سے کیسے ملایا جا سکتا ہے؟ یہ اور ایسے ہی سوالات تھے۔ جو آپؐ کو غارِ حرا میں لے جاتے تھے تاکہ آپؐ اس خلوت کدے میں بیٹھ کر ان سوالوں کا جواب معلوم کریں۔

آپؐ کے دل میں اپنے اِلٰہ کی جو طلب و آرزو تھی، وہ جذب و مستی میں تبدیل ہو چکی

تھی۔ آپؐ کے قلبِ مبارک میں عشقِ الٰہی کی آتشِ خاموش اب شُعلہ زن ہو چکی تھی۔ اسے شعلہ زن کرنے والا خود آپؐ کا "دوست" تھا، جو آپؐ کو ابدی نبوّت اور سرمدی رسالت عطا کرنے اور رحمۃ للعالمین بنانے والا تھا۔ محبّت کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ یہ محبّت دُہری نوعیت کی تھی: اِدھر انسانیّت اور اپنے اِلٰہ کی محبّت، اور اُدھر اپنی مخلوق اور حبیبؐ کی محبّت۔ آپؐ عالمِ جذب و شوق میں غارِ حرا کے خلوت کدے میں جاتے اور کئی کئی دن وہاں غمِ محبّتِ اِلٰہ اور غمِ عشقِ انسان میں، بیوی بچّوں سے دُور، جوانی کے دن اور راتیں گزارتے۔ اپنے اِلٰہ کا پیغام سُننے کی ایک بے نام آرزو تیرِ نیم کش کی طرح آپؐ کے قلبِ مبارک میں پیوست ہو چکی تھی۔ آپؐ کو کسی چیز کا انتظار تھا، جس کی آپؐ کو ابھی خبر نہ تھی۔ ایک راز تھا جو منکشف ہونے والا تھا اور ایک عُقدہ تھا جو حل ہونے والا تھا، لیکن آپؐ کا جذب و شوق اِنتہا کو پُہنچ چکا تھا۔ عشق اِنتہا کو پہنچ جائے تو بات بنتی ہے۔ آپؐ کو سب سے پہلے حسین خواب آنے لگے، جو سچّے ثابت ہوتے تو آپؐ کو حیرت و مسرّت ہوتی۔ سچّے خوابوں کے ساتھ آپؐ کو عجیب و غریب مشاہدات بھی ہونے لگے، جو حکمت آموز و بصیرت افروز ہوتے۔ پھر "دوست" آپؐ کو اِلہام و اِلقا کی لذّت سے آشنا کرنے لگا۔ آپؐ پر مابعد الطبیعی یا روحانی وارداتیں گزرنے لگیں، اور آپؐ کا قلبِ مُبارک علم و حکمت اور عرفان و معرفت کی دولت سے معمور ہونے اور "دوست" کے اشاروں کو سمجھنے لگا۔ ربِّ جمیل و حکیم آپؐ کو اِن انوکھے تجربوں سے گزار رہا تھا تاکہ آپؐ وحی و تنزیل کے صبر آزما تجربے سے گزرنے کے لیے تیّار ہو جائیں۔ ان مشاہدات و واردات سے آپؐ کا ذوق و شوق اور سوزِ دروں فزوں تر ہوتا چلا گیا، آتشِ عشق شعلۂ جوّالہ بن گئی اور آپؐ کو کسی نامعلوم تجربہ و شدنی کا شدّت سے اِنتظار رہنے لگا۔

آخرِ کار انتظار کا صبر آزما زمانہ ختم ہوا، اور آپؐ کو خلعتِ نبوّت و رسالت سے مزیّن کرنے کی ساعتِ صفر (ZERO HOUR) آ گئی۔ وہ ساعت ہزاروں ساعتوں سے،

اور وہ رات ہزاروں راتوں سے افضل و مبارک تھی، جس میں رُوح الامین حضرت جبریل علیہ السلام آپؐ کے پاس غارِ حرا میں تشریف لائے اور نُورِ ملکوتی سے آپؐ کی یہ عبادت گاہ ناگہاں منوّر ہو گئی۔ یہ بڑا ہی حسین و بصیرت افروز نظارہ تھا۔ آپؐ ابھی اسے دیدۂ شوق و حیرت سے دیکھ ہی رہے تھے کہ رُوح الامین علیہ السّلام صورتِ مجاز میں جلوہ گر ہوئے۔ اگرچہ اُن کا حُسن، حسنِ برقِ فنا تھا، لیکن آپؐ کی نظر اس لیے تابِ نظارہ لا سکی کہ وہ پیکرِ حُسن و نُور کی نظر تھی اور پھر خوگرِ دیدِ حُسن و نُور بھی تھی۔ یہ روح کے لیے جس قدر حسین و سُرور انگیز نظارہ تھا، دل کے لیے اُسی قدر ہیبت ناک و شکیب رُبا تھا۔ آپؐ ابھی حیرت و استعجاب کے عالم میں ہی تھے کہ حضرت جبریل علیہ السّلام کی آوازِ سلام برقِ مسرّت بن کر آپؐ کے گوشِ مبارک میں لہرائی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے آپؐ کو پیغامِ "دوست" دیا اور نبوّت و رسالت اور رحمۃٌ لِلعالمینی کی خلعتِ فاخرہ سے آپؐ کو آراستہ کیا۔

آپؐ کی تاج پوشیِ نبوّت کی رسم پوری ہوئی تو حضرت روح الامینؑ نے آپؐ کو کلامِ الٰہی پیش کیا اور پڑھنے کے لیے کہا۔ آپؐ چونکہ پڑھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے پڑھتے تو کیسے؟ آپؐ اس لیے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے کہ ربِّ جلیل کو یہ گوارا نہ تھا کہ سیّد المرسلینؐ، رحمۃٌ للعالمینؐ اور معلّمِ انس و جانؐ اس کے اپنے سوا کسی اور کے شاگرد ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے جواب دیا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ حضرت جبریل علیہ السّلام نے پھر کہا: پڑھیے۔ آپؐ نے پھر فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ ربِّ جلیل و حکیم کا حکم تھا، رُوح الامینؑ نے پھر کہا: پڑھیے، اور ساتھ ہی آپؐ کو زور سے سینے سے لگا لیا۔ روح الامین علیہ السّلام کے معانقے میں ایسی تاثیر برقِ حُسن و نور تھی کہ آپؐ کا سینۂ مبارک سرچشمۂ حُسن و نُور، خزینۂ علم و حکمت اور مخزنِ عرفان و معرفت بن گیا۔ آپؐ کی "دوست" آشنا نظر نے "دوست" کے نقوشِ وحی و تنزیل کو پہچان لیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ اس طرح آپؐ وحی و تنزیل کے بڑے ہی انوکھے، حیرت انگیز اور صبر آزما تجربے سے کامیاب گزر گئے۔ پھر آپؐ

پے در پے ان تجربات سے گزرنے لگے۔ شروع میں آپؒ کے جذب و شوق کو تیز سے تیز تر کرنے کے لیے "دوست" نے وحی و تنزیل کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے بند بھی کر دیا، جس نے آپؐ کو بے حد مضطرب کر دیا۔ اسے "فترت" کا زمانہ کہتے ہیں۔ "دوست" کی دید و حضوری اور ہمکلامی کی لذّت سے محرومی کی اذیّت کا احساس و اندازہ وہی اہلِ عشق و وفا کر سکتے ہیں، جو ہجر و فراق میں ایسے تجربے سے گزرے ہوں۔ کہتے ہیں کہ فترتِ وحی و تنزیل کے زمانے کی مدّت کوئی چھ ماہ تھی، اگرچہ عشق میں یہ زمانہ کئی صدیوں پر حاوی ہوتا ہے۔ یہ بھی رسمِ محبوبیّت ہوگی۔ اس کے بعد پھر وحی و تنزیل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپؐ "احسان" کے بلند ترین مقامِ شاہدیّت پر ہمیشہ کے لیے متمکن ہو گئے۔ آپؐ پر اسرارِ حیات آشکارا ہونے لگے اور آپؐ کو اپنے سوالات کے جوابات ملنے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ملنے لگا۔

آپؐ جبلُ الرحمت کے غارِ حرا میں معتکف ہوئے تھے تو جویائے حُسن و حق اور اہلِ جذب و شوق تھے، لیکن جب وہاں سے نکلے تو آفتابِ رُشد و ہدایت، رحمۃً للعالمین اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ و آلہٖ وسلّم بن کر نکلے۔ یہ "دوست" کا فضلِ بے قیاس اور رحمتِ بے پایاں تھی۔ آج بھی زائرین میں سے جو اہلِ جذب و شوق ہوتے ہیں، وہ یہاں سے لوٹتے ہیں تو فیضانِ "دوست" سے تہی دست نہیں لوٹتے۔ کچھ نہ کچھ دولتِ دل لے کر ہی لوٹتے ہیں۔ وہاں کے نظاروں کو دیکھ کر چشم و دل کو سیری کیا ہوتی، البتہ تشنگیِ دید فزوں سے فزوں تر ہوتی جاتی تھی۔ وہاں سے رخصت ہونا ایسا تھا جیسے کسی کو جنّت سے نکلنا پڑے۔ لیکن اُس شبستانِ فردوس سے نکلنا ناگزیر تھا۔ نکلے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی اور دُنیا میں آگیا ہوں، اور میں "میں" نہیں ہوں، کوئی اور ہوں۔ پھر آج تک پتا نہ چل سکا کہ "میں" کون ہوں۔

غارِ ثور یا سفرِ ہجرت کی پہلی منزل

"دوست" کی راہِ عشق میں حوصلہ شکن تجربوں اور شکیب رُبا امتحانوں سے گزرنا، نیز ہجرت کرنا ہی پڑتی ہے۔ یہ رسمِ عاشقی بھی ہے اور امتحانِ وفا بھی۔ آپؐ رحمۃ للعالمین اور سیدالمرسلینؐ تھے اس لیے آپؐ کا عشق "عشقِ کُل" تھا۔ "دوست" سے بھی تھا اور اس کی کُل مخلوقات سے بھی۔ اس راہِ عشق میں آپؐ کے جسم و جان اور عزتِ نفس پر حملے بھی ہوئے اور آپؐ کو سنگین خطرات اور حوصلہ شکن تجربات سے گزرنا بھی پڑا، اور اپنے جاں نثار رضا کارانِ تحریکِ اسلام کو مظالم سہتے اور ہجرت کرتے دیکھنا بھی پڑا۔ آخر میں 'دوست' کے اشارے پر اپنے وطنِ مالوف اور گھر بار کے علاوہ "دوست" کا گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ اپنا گھر تو اپنا گھر ہی ہوتا ہے، لیکن "دوست" کا گھر جو حُسنِ رُخِ "دوست" کی جلوہ گاہ تھا۔ آپؐ کے لیے فردوسِ بریں سے بھی عزیز تر تھا، اُسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانا، عشق و وفا کا ازبس دشوار مرحلہ تھا۔ آپؐ اہلِ عشق و وفا بھی تھے اور پیکرِ تسلیم و رضا بھی، اس مرحلے سے گزرے اور کامیاب گزرے۔

ہجرت کا مقامِ آغاز آپؐ کے ہمراز و ندیم اور معتمد و یارِ غار حضرت صدیق اکبرؓ کا گھر تھا تو اس سفر کی منزلِ اوّل غارِ ثور تھی۔ ہجرت دُنیا کا اہم ترین تاریخ ساز و عہد آفرین واقعہ ہے۔ اس نسبت سے اس کے سفر کی منزلِ اوّل غارِ ثور ایک ازبس اہم تاریخی یادگار ہے۔ ہجرت، اہلِ عشق و عرفان کی نظر میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اپنی ذات سے ذاتِ الٰہی کی طرف اور اپنی دُنیا سے "دوست" کی دُنیا کی طرف ہجرت تھی۔ یہ آپؐ کے اپنے نفس سے کُل انس و جان کی طرف اور خلوت سے جلوت کی طرف ہجرت تھی۔ یہ شرک و بُت پرستی، ظلم و استحصال اور جُرم و گناہ کے ظلمت کدے سے یثرب کی طرف ہجرت تھی، جسے آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے سے ایمان و توحید، عدل و احسان، اُخوت و آزادی اور امن و سلامتی کا بہشت بننا تھا۔ یہ دارالحرب سے دارالسلام کی طرف،

ہجرت تھی۔ یہ مظلومی و مجبوری اور محکومی و غلامی کی سرزمین سے آزادی و مختاری کی دُنیا کی طرف ہجرت تھی۔ یہ فردیّت سے مِلّت اور انتشار و تشتّت سے عالمگیر اتّحاد و وحدت کی طرف ہجرت تھی۔ غرض کہ یہ تحریکِ اسلام کی تنگنائے زندان سے نکل کر اپنی آزاد و آفاقی جولانگاہ کی طرف ہجرت تھی۔

آج ہم ہجرت کی ازبس اہم تاریخی یادگار دیکھنے گئے، جو حرم شریف سے کوئی تین میل دُور جبلِ ثور میں واقع ہے۔ اُوپر جانے کی رہگزر سنگلاخ، ڈھلوان، دشوار گزار اور ہمّت طلب ہے۔ مجھے غارِ حراء کی طرح غارِ ثور کی یہ بات بہت پسند آئی کہ ان دونوں مقدّس یادگاروں کی رہ گزریں اور جگہیں اُسی حالت میں ہیں، جو حضورِ رسالت مآبؐ کے عہدِ مبارک میں تھی۔ زمانہ بدلا، تاریخ بدلی، حکومتیں بدلیں، حکمران بدلے اور لوگ بدلے، لیکن یہ دونوں مقامات اپنی اصلی حالت میں ہیں۔ زمانے کی دست بُرد سے محفوظ، انسان کی ہُنرمندی سے ناآشنا اور نقوشِ عشق و وفا کے امین۔

جذبۂ عشق صادق ہو تو ہر مرحلۂ شوق چاہے کتنا ہی دشوار و ہمّت شکن کیوں نہ ہو، طے ہو ہی جاتا ہے۔ چڑھائی کے وقت دیدۂ شوق و تجسّس کو ہر قدم پر نبوّت و صدّیقیّت کے نقوشِ پا کا گمان ہوتا تھا۔ ہر سنگریزے، ہر سنگ اور چٹان کو چُومنے اور آنکھوں سے لگانے کو دل چاہتا تھا۔ ہر قدم جو اُوپر اُٹھتا تھا، سوئے خلدِ بریں اُٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ غارِ ثور، جو پناہ گاہِ نبوّت و صدیقیّت ہے، اہلِ حُسن و عشق کی نظر میں واقعی فردوسِ بریں ہے۔

ہجرت کی عہد آفریں رات، جب پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اپنے صدیق، صدّیقِ اکبرؓ کے ساتھ مکّہ مکرّمہ سے تاریخ ساز سفر پر نکلے تھے تو یہاں فروکش ہوئے تھے۔ جب قریشِ مکّہ آپؐ کی تلاش میں اس غار کے دہانے کے قریب پہنچے اور صدّیقِ اکبرؓ کا دل، جو آخر بشر کا دل تھا، اس اندیشے سے سہم گیا تھا کہ کہیں آپؐ کے دُشمنِ جاں آپؐ پر قابو نہ پالیں

تو "دوست" کی ندا آئی تھی: "غم نہ کر، اللہ تمھارے ساتھ ہے۔" آوازِ "دوست" کی صدائے بازگشت آج بھی وہاں سنائی دیتی ہے اور غار کی فضا ہی میں نہیں، اہلِ جذب و شوق کے دلوں کی دُنیا میں بھی برقِ حُسن بن کر لہراتی رہتی ہے۔ وہاں انسان ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کسی سحر آگیں شبستانِ رنگ و بُو میں آگیا ہو۔ اس کے نظّارے سے قلب و نظر مسحور اور مشامِ جاں معطّر ہو جاتی ہے۔

غارِ ثور وہ مقدّس و متبرّک مقام ہے، جہاں آپؐ اپنے رفیقِ سفر حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے ساتھ تین دن ٹھہرے تھے۔ یہاں یہ نکتہ بڑا ہی بصیرت افروز اور قابلِ ذکر ہے کہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ کو اس سفرِ ہجرت میں نہ صرف رفاقتِ سفر بلکہ آپؐ کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ اس غار میں آپؐ کے ارشاد و منصوبہ بندی کے مطابق حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے اہلِ بیت آپؐ کو روزانہ تازہ کھانا، دودھ اور پانی مہیّا کرتے، نیز کفّارِ مکّہ کے منصوبوں اور کارروائیوں سے آپؐ کو مسلسل مطلع کرتے رہتے تھے۔ یہ شرفِ رفاقت و میزبانی حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے صدق و صفا، ایمان و تقوٰی، عشقِ رسولؐ اور آپؐ سے وفاداری بشرطِ استواری کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ نبوّت کو صِدّیقیت و ہجرت مستلزم ہیں۔ اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ رہ نوردانِ شوق کو اپنا الٰہ و ربّ پانے کے لیے اپنی دُنیا سے اس کی دُنیا کی طرف ہجرت کرنا ہی پڑتی ہے۔ اس کے عشق میں مہاجر بننا ہی پڑتا ہے۔ چونکہ "دوست" ہر آن ایک نئی شان سے دوسری نئی شان میں سفر کرتا رہتا ہے، اس لیے اس کے اہلِ دید و نظر کو بھی ایک مقامِ دید و نظر سے دوسرے مقامِ دید و نظر کی طرف متواتر ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ ہجرت ازلی و ابدی ہے۔ یہ تقدیرِ حیاتِ انسانی ہے۔ مبارک و کامیاب ہیں وہ لوگ جو "دوست" کی راہ میں ہجرت کرتے ہیں اور جنھیں "اللہ کے مہاجر" کہہ سکتے ہیں۔ اللہ کے مہاجر ہی اپنے حُسن المآب میں پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں، جو ان کا اصل گھر ہے: امن و سلامتی، حُسن و سُرور

اور لذّت و راحت کا فردوسِ بریں۔ یہاں انھیں خوف و حزن، اضمحلال و انحطاط اور بیماری و موت سے ناآشنا، سدا بہار، سدا جوان، سدا حسین و مسرُور ابدی زندگی ملتی ہے، علاوہ ازیں انھیں وہ نعمتِ بے عدیل و بے بہا بھی ملتی ہے جسے "دیدِ دوست" کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اہلِ دید و نظر ہی جانتے ہیں کہ "دیدِ دوست" ہی اصلِ حیات، آرزوئے رُوح، غایتِ دین اور رضائے "دوست" ہے۔ چنانچہ مولائے رومؒ نے کیا خوب اور سچ کہا ہے ؎

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است
جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو در نظر رو در نظر

اصل یہ ہے کہ "دوست" کا شہر مکّہ مکرّمہ ہو یا "اُس" کے حبیبؐ کا شہر مدینہ منوّرہ، زائرین کا ہمہ تن دید و نظر بنے بغیر نقوشِ حُسن و عشق کا مشاہدہ ممکن نہیں، اور یہ جذب و شوق ہے جو انسان کو مہاجر و صاحبِ دید و نظر بناتا ہے۔ وہی حجّاج و زائرین کامیاب و کامران لوٹتے ہیں، جو مہاجر و اہلِ دید و نظر بن کر لوٹتے ہیں۔ میں ذہن کے ٹیلی وژن پر ہجرت کی تصویر دیکھنے میں محو تھا کہ ندائے سروش آئی :

"ماضی، حال اور مستقبل تو دہر کی ایک آنِ سیّال اور جلوۂ حُسنِ "دوست" کی ایک شان ہیں۔ کب تک ماضی کی سیر کرتے رہو گے۔ چلو کہ "دوست" اپنے گھر میں تمھارا منتظر ہے، کیونکہ تم اس کے مہمان ہو اور وہ اپنے مہمانوں سے محبّت اور ان پر بے انتہا لطف و کرم کرنے والا ہے۔" یہ آواز برقِ حُسن کی طرح لہرائی اور میں اپنی دُنیا میں واپس آگیا۔

راہِ ہجرت دیکھنے کی طلب و جستجو

میں نے حسرت بھری نظروں سے غارِ جنّت نگاہ کو دیکھا، اس کے

کوہ و کمر اور وادی کو دیکھا، پھر مجھے اُس راہِ ہجرت کے دیکھنے کی جستجو ہوئی، جو آپؐ نے مدینہ منوّرہ جانے کے لیے اختیار کی تھی۔ میں متجسّس و مشتاق نظروں سے آپؐ کی بے نام و نشان رہ گزر کو ڈھونڈھنے لگا۔ نظر ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئی تو دل نے حسرت سے کہا: کاش کوئی حکومت اس تاریخی رہ گزر کی نشان دہی کر دیتی تو کس قدر اچّھا ہوتا! ذوقِ تحقیق و نظر کی تسکین اور شوقِ دید و تجسّس کی تشفّی تو ہو جاتی۔ خُدا ہی جانتا ہے کہ چودہ سو برس میں کیوں کسی حکومت، حکمران یا جماعت کو ایسا کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ بہرکیف، دل میں یہ حسرت لیے ہم وہاں سے لوٹے اور سیدھے "دوست" کے گھر پہنچے، جو سچ مچ اہلِ جذب و شوق کا حُسن المآب ہے۔

ظہر کی نماز میں ابھی خاصا وقت تھا، لہٰذا ہم مطاف میں آئے اور طواف کرنے لگے۔ وہاں اہلِ جذب و شوق کا اژدحام تھا۔ اُن کے اُوپر آفتاب نصف النہار اور نیچے سنگِ سوزاں و تپاں تھا، اُن کے تن کفن بردوش اور پاؤں آبلوں سے پُر تھے۔ سر سے پاؤں تک جسم پسینے سے شرابور اور آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں، زبان پر دُعائیں تھیں اور نظر میں "حُسن کدۂ دوست" تھا۔ لیکن اللہ کے ان پُراسرار بندوں کو نہ تن بدن کا ہوش تھا، نہ دُنیا و مافیہا کا۔ آفتابِ نیم روز کی تن سوز شعاعیں اُن کے لیے "دوست" کے جمالِ دل فروز کی تجلّیات تھیں، جن میں آنکھوں کی ٹھنڈک، رُوح کی طمانیت اور دل کی مسرّت تھی، تشنگی اُن کے لیے تشنہ کامیٔ دیدِ "دوست" تھی، جس میں لذّتِ کیف و مستی تھی، جراحتِ آبلہ پائی کا درد اُن کے لیے دردِ محبّت تھا، جس میں حلاوتِ کیف آور تھی، تمازتِ آفتاب اُن کے لیے سوزِ دروں تھی، جس میں رُوح کی ٹھنڈک تھی۔

عشق کی انتہا اور عبدیّت کی معراج

"شمع خانۂ دوست" کے طواف سے یہ راز کُھلا کہ پروانے کیوں رُخِ شمع چُوم لینے کے لیے اس کا طواف کرتے کرتے آخر کار اس پر قربان ہو جاتے ہیں۔ عشق کی انتہا اور

عبدیت کی معراج یہ ہے کہ بندہ "شہیدِ دوست" ہو جائے اور اس کے صلے میں ہمیشہ کے لیے اس کا دوست، شاہد اور رہبان بن جائے۔ یہ حرفِ راز ہے جس میں فلسفہ و حکمت کے دفاتر مضمر ہیں، یہ قطرۂ حقیقت ہے جس میں حقائق کے سمندر بند ہیں، یہ ذرّۂ حقیقت ہے، جس میں آفتابِ ایمان و عرفان کی روشنی و توانائی پوشیدہ ہے۔ لیکن دل کو تلاشِ حق، فکر و نظر کو طلب و جستجوئے حسن اور روح کو آرزوئے دیدِ "دوست" ہو تو انسان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے، اور اُسے جذب و شوق اور دید و حضوری کی دولتِ لایزال عطا ہوتی ہے ؎

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

حج کا زمانہ تھا نہ ایام، لیکن مقاماتِ حج کی زیارت کیے بغیر ذوق و شوق کی تسکین کیسے ہو سکتی تھی؟ لہٰذا ہم نے ان مقدس و تاریخی مقامات کی سیر کی۔ اپنے شاہدات و تأثرات کی روداد لکھنے سے پہلے میں عازمینِ حج کے استفادے اور حجاج کرام کی یاد تازہ کرنے کی خاطر حج کے مقامات و مناسک سے متعلق ضروری معلومات درج کیے دیتا ہوں۔

کڑی : ۱۱

حج اور اُس کے مقامات

فرضیتِ حج

سب سے پہلے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبہ کی رُو سے حج ہر صاحبِ استطاعت مسلمان مرد اور عورت پر عمر بھر میں صرف ایک بار فرض ہے، اس سے زیادہ جو کرے وہ نفل ہے۔ حج ۹ ہجری میں فرض ہوا۔ اس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ کو امیر الحجّاج بنا کر بھیجا اور ان کے پیچھے حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ سورۂ برأت کا اعلان کریں۔ چنانچہ حضرت صدّیقِ اکبرؓ نے لوگوں کو حج کرایا اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے سورہ برأت کی ابتدائی چالیس آیات پڑھ کر سنائیں۔ نیز یہ احکام بھی سنائے کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک مکّہ مکرمہ میں داخل نہیں ہو سکے گا، اور نہ کوئی شخص ننگا ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کر سکے گا (صحیح بخاری)۔

حج کے فضائل

حج کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اسلام کے ارکانِ خمسہ (توحید، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو تاکہ اپنے (دینی اور دُنیوی) فوائد کے لیے آموجود ہوں۔ پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دُور کر دیں، اپنی نذریں پوری کریں اور اس اوّلین خانۂ خُدا کا طواف کریں" (الحج ۲۲ : ۲۷ تا ۲۹)۔

احادیثِ طیبہ میں اس کے فضائل کثرت سے بیان ہوئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے

مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا :

اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَیْسَ لَہٗ جَزَاءٌ اِلَّا الْجَنَّۃُ (بخاری) :

حجِ مقبول کا اجر صرف جنّت ہے۔

یہ بھی آپؐ کے ارشاد ہیں :

مَنْ حَجَّ لِلّٰہِ فَلَمْ یَرْفُثْ وَلَمْ یَفْسُقْ رَجَعَ کَیَوْمٍ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ (بخاری) :

جو شخص اللہ کے لیے حج کرے اور اس میں فسق و فجور سے بچے تو وہ سے پاک ہو کر ایسا لوٹتا ہے جیسے وہ ماں کے پیٹ سے بے گناہ آیا ہے۔

حج اور عمرہ کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی دعوت پر یہ اللہ کے گھر آئے۔ جب یہ مانگیں گے، اللہ قبول کرے گا (نسائی)۔

حج پچھلے گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے (مُسلم)۔

حج اور عُمرہ فقر و فاقہ اور معصیت کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹّی لوہے، سونے اور چاندی کے میل کچیل کو ختم کر دیتی ہے (ترمذی)۔

بیتُ اللہ کی طرف حاجی اور اس کی سواری کا اُٹھنے والا ہر قدم حاجی کا ایک گناہ مٹاتا ہے اور ایک درجہ بلند کرتا ہے (بیہقی)۔

حج کی راہ میں مرنے والا حاجی حشر کے میدان میں احرام کے اندر لبیک کہتا ہوا اُٹھے گا (بخاری و مُسلم)۔

حج کے مقامات

اب ہمیں ان جگہوں کی زیارت کرنی تھی جو حج کے مقامات ہیں اور وہ مندرجہ ذیل ہیں :

مکّہ مکرّمہ، منیٰ، وادیِ محسّر، مُزدلفہ، وادیِ عرفہ، عرفات اور جبلُ الرحمۃ۔

ان مقامات کی زیارت کی روداد بیان کرنے سے پہلے اہلِ شوق کی معلومات کے لیے مناسکِ حج کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے :

۸۔ ذوالحجہ : حج کی تیاری و شروعات کا دن

حج کی تیاری

۸۔ ذوالحجہ حج کی تیاری اور شروعات کا دن ہے۔ اس دن حجاج نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد غسل کر کے احرام باندھتے ہیں۔ پھر اپنے قیام کی جگہ یا مسجد الحرام میں دو نفل پڑھ کر حج کی نیت کرتے ہیں، اور لَبَّیۡکَ پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔

مکہ مکرمہ سے منیٰ

چونکہ انھیں اسی دن، دوپہر سے پہلے، اپنی پہلی منزل منیٰ پر پہنچنا ہوتا ہے، اس لیے وہ عموماً صبح ہی کسی سواری کے ذریعے یا پیدل ہی منیٰ روانہ ہو جاتے ہیں، جو حرم شریف سے تقریباً ساڑھے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ معلّم کے خیموں میں اپنا سامان رکھ کر آرام کرتے ہیں، اور ظہر کی نماز عموماً مسجد خیف میں پڑھتے ہیں۔

مسجدِ خیف اور نمازِ قصر

یہ منیٰ کی ایک بڑی کشادہ مسجد ہے، جس میں گنبد نما ایک گول احاطہ ہے۔ مشہور ہے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے حجۃ الوداع کے موقع پر یہاں اپنا خیمہ لگایا تھا۔ چونکہ اس موقع پر آپؐ نے یہاں نمازِ قصر پڑھی تھی، اس لیے آج کل بھی یہاں نمازِ قصر ہی پڑھائی جاتی ہے۔ نمازِ قصر میں صرف دو فرض پڑھے جاتے ہیں، البتہ نمازِ عشا میں ایک وتر کا اور نمازِ فجر میں دو سنّتوں کا اضافہ ضروری ہے۔

۹۔ ذوالحجہ

منیٰ سے عرفات

۹۔ ذوالحجہ کو حاجی طلوعِ آفتاب کے بعد یہاں سے کُوچ کرتے ہیں، کیونکہ نمازِ ظہر سے پہلے عرفات کی حدود میں

داخل ہونا ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے معلّم کے خیموں میں قیام کرتے ہیں۔

مسجدِ نمرہ سب سے پہلے مسجدِ نمرہ میں پہنچنا سُنّت ہے، جو میدانِ عرفات کی حد پر واقع ہے۔ عرفات مکّہ مکرّمہ سے تقریباً آٹھ میل دُور ہے۔ دوپہر کے بعد امام اس مسجد میں خطبہ حج پڑھتا ہے۔ پھر ظہر اور عصر کے دو دو فرض پڑھاتا اور حاجی واپس اپنی اپنی قیام گاہ میں آجاتے ہیں۔

میدانِ عرفات حجّاج مغرب تک میدانِ عرفات میں قیام کرتے ہیں۔ اہلِ جذب و شوق یہ وقت تلاوت، ذکرِ الٰہی اور دُعائیں گزارتے ہیں۔ یہ اعمال کھڑے ہو کر سرانجام دیتے ہیں؛ اگرچہ ایسا کرنا بیٹھ کر بھی جائز ہے۔ وہ گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ مَغْفِرَتُكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِيْ وَرَحْمَتُكَ اَرْجٰى عِنْدِيْ مِنْ عَمَلِيْ ؛

یا اللہ! تیری بخشش میرے گناہوں کی بہ نسبت بہت وسیع ہے اور مجھے اپنے عمل کے مقابلے میں تیری رحمت کی بہت زیادہ اُمید ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ میدانِ عرفات کے لیے کوئی خصوصی دُعا مقرر نہیں۔ جو دُعائیں یاد ہوں مانگیں، جو کچھ یاد ہو پڑھیں، قرآن مجید کی تلاوت بھی کریں، نیز گریہ و زاری کریں اور سچّے دل کے ساتھ توبہ کریں اور اپنے اعزّہ و احباب، اہلِ وطن اور کُل مسلمانانِ عالم کے لیے دُعائیں مانگیں۔

عرفات سے مزدلفہ حجّاج کے لیے غروبِ آفتاب تک عرفات میں حاضر رہنا ضروری ہے، لیکن نمازِ مغرب وہاں پڑھنے کی ممانعت ہے۔ شام ہوتے ہی یہاں سے نکل جانے اور مزدلفہ پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے قصر پڑھیں۔ ہو سکے تو باجماعت ادا کریں، اور

سو جائیں، کیونکہ یہاں سونا سُنّت ہے۔

۱۰۔ ذوالحجہ

مشعر الحرام مزدلفہ کی وادی مشعر الحرام کہلاتی ہے۔

صبح کی نماز اور ذکرِ الٰہی فجر کی نماز مسجد مشعر الحرام میں با جماعت ادا کریں۔ اس وادی میں ذکرِ الٰہی کرنے کا حکم ہے:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (البقرۃ ۲: ۱۹۸) پھر مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو۔ چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ کی تکبیر و تمجید اور حمد و ثنا خوب کرنی چاہیے، مثلاً سُبْحَانَ اللّٰهِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وغیرہ کی تسبیح۔

مزدلفہ سے منیٰ صبح سویرے یعنی سورج نکلنے سے کچھ پہلے حجاج کو مزدلفہ سے منیٰ کی طرف کوچ کرنا ہوتا ہے۔ راستے میں رمی جمار کے لیے کابلی چنے جتنی موٹی ستر کنکریاں چن لیں۔

منیٰ میں پہلا کام منیٰ میں سامان اپنے ڈیرے میں رکھ کر جمرۂ عقبیٰ پہنچیں اور کم سے کم پانچ قدم کے فاصلے سے کھڑے ہو کر ایک ایک کر کے سات کنکریاں اس جمرے کو ماریں۔ یہ یاد رہے کہ اس موقع پر دایاں ہاتھ منیٰ کی جانب اور بایاں ہاتھ مکہ مکرمہ کی طرف ہونا چاہیے۔ کنکری شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے پکڑ کر جمرے کی طرف پھینکنی چاہیے۔ بازو اتنا بلند کریں کہ بغل نظر آئے اور کنکری مارنے سے پہلے ہر بار یہ دعا پڑھیں:

بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَّبْرُوْرًا وَّسَعْيًا مَّشْكُوْرًا وَّذَنْبًا مَّغْفُوْرًا۔

قُربانی رمی جمار یا کنکریاں مارنے کے بعد قُربانی کرنے کا حکم ہے۔ قربانی کے جانور مذبح کے پاس مل جاتے ہیں، جو منیٰ ہی میں مسجدِ خیف سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ قُربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کریں یا کسی اور سے ذبح کروائیں۔ ایسے لوگ اُجرت پر مل جاتے ہیں۔ چھُری چلاتے وقت یہ پڑھتے جائیں :

بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا مِنْكَ وَلَكَ تَقَبَّلْ مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِكَ :

اللہ کے نام پر ذبح کرتا ہوں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ یا اللہ! یہ قربانی تیری ہے اور تیرے لیے ہے۔ اسے میری طرف سے قبول فرما، جیسے تُونے اپنے دوست حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے قبول فرمائی۔

قربانی کا گوشت جتنا درکار ہو لے آئیں، باقی سب کچھ وہاں چھوڑ آئیں۔

حجامت قربانی کے بعد سر مُنڈوا ڈالیں، یہ افضل ہے۔ ویسے سر کے بال کترِوانا بھی جائز ہے (مشکوٰۃ)۔

طوافِ اِفاضہ اس دن مکّہ مکرّمہ پہنچ کر طواف و سعی کرنا افضل ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو یا دیر ہو جائے تو رات منیٰ میں قیام کریں اور گیارہ تاریخ کو مکّہ مکرّمہ پہنچ کر طواف و سعی کریں اور منیٰ لوٹ آئیں، کیوں کہ رات منیٰ میں گزارنی ضروری ہے (مشکوٰۃ)۔

رمی جمار یعنی تینوں جمروں پر کنکریاں مارنا۔ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجّہ کو زوال کے بعد تینوں جمروں پر کنکریاں مارنے کے بعد کسی جگہ قبلہ رُخ ہو کر خوب دُعا مانگیں۔ یہ قبولیّت دُعا کا موقع ہوتا ہے، لیکن یہ بات یاد رہے کہ تیسرے جمرے پر کنکریاں مار کر فوراً وہاں سے چل دیں، نہ ٹھہریں، نہ ہی دُعا مانگیں (مشکوٰۃ)۔

مکّہ مکرّمہ کو واپسی اگر کوئی شخص چاہے کہ ۱۳ تاریخ کی کنکریاں بھی ایک دن پہلے

یعنی ۱۲ تاریخ کو مار کر فارغ ہو جائے، یعنی اس دن بجائے ہر جمرے پر سات کنکریاں مارنے کے چودہ چودہ کنکریاں مارے اور اسی دن یعنی بارہ ذوالحجہ ہی کو منیٰ سے کوچ کر کے مکہ مکرمہ پہنچ جائے تو قرآنِ مجید کی رُو سے اس کی اجازت ہے۔ لیکن اگر مغرب کی نماز منیٰ میں ہو جائے تو رات منیٰ میں گزار کر ۱۳ تاریخ کو زوال کے بعد کنکریاں ماریں اور پھر مغرب سے پہلے پہلے وہاں سے کوچ کر کے مکہ مکرمہ پہنچ جائیں۔

ایک رعایت

کمزور، معذور اور مجبور اشخاص اگر ۱۲ ذوالحجہ کو ہی مکہ مکرمہ پہنچ کر طوافِ افاضہ کر لیں تو جائز ہے۔ پھر واپس منیٰ جانا ضروری نہیں۔

قبولیتِ حج کی علامت

شریعت کی رُو سے قبولیتِ حج کی علامت تزکیۂ نفس ہے، یعنی نفس کا پاک و صاف ہو کر نشوونما کرنے لگنا۔ تزکیۂ نفس سے نفسِ امّارہ مغلوب و مطیع ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زبانِ مبارک میں انسان کے شیطان کا مسلمان ہو جانا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ نفس مطمئن ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی آگ سرد پڑ جاتی ہے۔ جمالیات کی زبان میں تزکیۂ نفس کو "جمالیاتی نفسیاتی انقلاب" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایجابی یا اثباتی لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ اور خلق و کردار میں جمالیاتی انقلاب یا حسین تبدیلی آ جائے اور اس کے نتیجے میں اس کا ارادہ و نیّت، فکر و نظر، آرزوئیں، خواہشیں، عادات و خصائل، رویّہ و سلوک اور جذبات و احساسات سب پاکیزہ، خالص، سچے اور حسین ہو جائیں۔ مختصر یہ کہ زندگی حسین، خالص اور سچی اور دوسروں کے لیے رحمت بن جائے، اور انسان قرآنِ مجید کی اصطلاح میں نفسِ مطمئنہ اور جمالیات کی زبان میں صاحبِ حُسن و سُرور بن جائے۔

سلبی یا منفی اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا قلب (دل و دماغ) شرک و بُت پرستی، ظلم و گناہ، جُرم و شر، کذب و کتمانِ حق، حسد و بغض، کینہ و دشمنی، بدنیتی و بداندیشی،

منافقت و ریاکاری اور بخل و حرام خوری وغیرہ کے قبیح اثرات سے پاک و منزہ ہو جائے، نتیجۃً اس کی قساوت و شقاوت دور ہو جائے اور اس کی حِسّی و قلبی قوتیں زندہ و فعال ہو جائیں۔ اسے تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان میں سننے، دیکھنے، غور و فکر کرنے، نیز حرام و حلال، حُسن و قُبح، خیر و شر، سُود و زیاں اور کامیابی و ناکامی میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے اور اس کے حوالے سے ہر کام کرنے کا داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ (نشو و نُما کرنے، حاجات برلانے والا آقا و مولیٰ) بنا لیتا ہے اور پھر اس پر قائم رہنے کا عزم بالجزم کر لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کی محبّت پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ موحّد و متوکّل، اہلِ جذب و شوق اور صاحبِ حُسن و سُرور بن جاتا ہے، نیز اس کی نماز، قربانی، زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جاتی ہے۔

حج کے بعد ہمیں یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر کمال نقطۂ منتہیٰ نہیں، بلکہ کمالِ نو کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں نہ تو کبھی کسی مقام کو مقامِ آخر اور نہ کسی منزل کو منزلِ آخر ہی سمجھ لینا چاہیے، اور نہ وہاں قیام ہی کر لینا چاہیے، بلکہ نئے سے نئے کمال اور خُوب سے خُوب تر کی تلاش و جستجو میں لگا رہنا چاہیے، نیز اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ یہ دُعا مانگتے رہنا چاہیے:

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا (التحریم ۶۶: ۸):

اے ہمارے ربّ! ہمارے لیے ہمارے نُور کی تکمیل کر دے اور ہمیں لغزش و گناہ وغیرہ سے محفوظ رکھ۔

دیکھا گیا ہے کہ فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد لوگ عام طور پر یہ نکتہ بھول جاتے ہیں اور سفرِ جذب و شوق میں سُست رو ہو جاتے ہیں، حالانکہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

انھیں تو بلکہ ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ "دوست" کے گھر میں دولتِ دل لوٹنے میں مشغول رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کون جانتا ہے کہ انسان کو یہ سعادت دوبارہ نصیب ہوگی یا نہیں۔ لہٰذا ہمیں اس وقت و موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کو سچے دل سے اپنا اِلٰہ و ربّ بنانے اور اپنا تزکیۂ نفس کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھنی چاہیے۔ چنانچہ انسان وہاں سے لوٹے تو اہلِ جذب و شوق، صاحبِ حُسن و سُرور، اہلِ احسان و رحمت اور اللہ تعالیٰ کا مقرّب و دوست بن کر لوٹے۔

طوافِ وداع مکہ مکرمہ سے وطن روانہ ہوتے وقت بیت اللہ شریف کا جو طواف کیا جاتا ہے، اُسے طوافِ وداع کہتے ہیں۔ یہ چونکہ ہمارے حج یا عُمرے کے زمانے کا آخری و الوداعی طواف ہوتا ہے، اس لیے اسے انتہائی خشوع و خضوع، صدق و خلوص اور جذب و شوق کے ساتھ کرنا چاہیے۔ علاوہ بریں، اس موقع پر خوب الحاح و زاری اور دُعا و فریاد کرنی چاہیے، اس ایقان و اذعان کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ مُجیبُ الدعوات اور غفور و رحیم ہے، ضرور مستجاب کرے گا۔ سیّد المرسلین صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جیسا گمان رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ویسا ہی بن جاتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو پھر ہمیں ایک تو اللہ تعالیٰ سے سب کچھ مانگنا چاہیے، اور دوسرے اس اِیقان و اِذعان اور اِعتماد و اُمّید کے ساتھ مانگنا چاہیے کہ وہ ہماری دعائیں مستجاب اور حاجات پوری کرے گا۔

واپسی کی دُعائیں واپسی کی دُعائیں بھی تقریباً وہی ہیں جو آتے ہوئے پڑھی جاتی ہیں۔

اپنے شہر یا گاؤں میں اپنے شہر، قصبے یا گاؤں میں پہنچ کر گھر جانے سے پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نفل ادا کریں (بخاری و

دُعا لیکن اس سے پہلے شہر، گاؤں یا گھر میں داخل ہونے سے پہلے جہاں لوگ استقبال کریں، حاجی سے اپنی مغفرت کی دُعا منگوائیں اور حاجی کے لیے حج کی قبولیت کی دُعا کریں۔

اختتامِ سفر کی دُعا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِعِزَّتِهٖ وَجَلَالِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ (مستدرک حاکم):

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس کی عزت اور جلال سے نیک کام تکمیل کو پہنچتے ہیں۔

کڑی : ۱۲

مقاماتِ حج کی زیارت کے تأثرات

خُوب سے خُوب تر کی تلاش

جمالیاتی حِس (AESTHETIC SENSE) زندہ و فعّال اور جمالیاتی ذوق (AESTHETIC TASTE) لطیف و ارفع ہو تو اہلِ ذوق و نظر کو خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ یہ ہو تو ذوقِ دید کی تسکین سے شوقِ نظر اور بڑھتا ہے، اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے، حتّٰی کہ نظر عالمِ مجاز کے جمیل و جلیل مناظر سے جمالیاتی حظ اُٹھانے کے ساتھ ساتھ دلِ وجود چیر کر "حریمِ دوست" تک جا پہنچتی ہے، جو حُسن کا محیطِ بے مثال ہے۔ شاید اسی لیے ربِّ جلیل نے "فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" یعنی دُنیا کی سیر کا حُکم دیا ہے۔

یہ لطیف نکتہ ذہن سے پھسلنے یا نکلنے نہ پائے کہ نظر ہی پر کسی مقام یا چیز کا دار و مدار ہوتا ہے۔ چنانچہ نظر بدل جائے تو باہر اور اندر کی ہر چیز بدل جاتی ہے، اور اس کی اہمیت و فضیلت کے ساتھ دل کے تأثرات بھی بدل جاتے ہیں۔ یہ عام مشاہدہ و تجربہ کی بات ہے کہ کوئی چیز بھی ہو، اگر وہ کسی اہلِ ذوق و نظر کا معروضِ حُسن و محبت ہے تو اُس کے نظارے سے اس کے تأثرات و جذبات ان لوگوں سے مختلف ہوں گے جن کی وہ چیز معروضِ حُسن و محبت نہیں ہے۔ لہٰذا کسی اہلِ نظر کے تأثرات و جذبات کو اپنے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ، ہم نے دیارِ "دوست" میں حج کے مقامِ اوّل حرم شریف کی زیارت کی اور خوب کی، پھر ذوق و تسکین کی خاطر "آثارِ حُسن و عشق" دیکھے لیکن

ذوقِ نظر کی تسکین کے ساتھ ساتھ شوقِ دید بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ ہم نے وہ مقدس و تاریخی مقامات دیکھنے کا پروگرام بنایا، جو مقاماتِ حج میں سے ہیں: منیٰ، مزدلفہ اور عرفات۔ ان کی زیارت و سیر کے بعد یہ راز آشکار ہوا کہ اُن کی فضیلت و اہمیت کی حقیقت کا اہلِ جذب و شوق ہی کو علم و عرفان ہے۔

عرفات یا محشرِ ارضی

ہم صبح ناشتا کرتے ہی محشرِ ارضی کی زیارت کو نکلے، جو مکۂ مکرمہ سے تقریباً آٹھ میل دُور ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض کوہستانی، صحرائی وادی یا میدان ہے، جس میں لاکھوں حاجی سما جاتے ہیں۔ ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں تیس لاکھ سے زائد حجاج نے یہاں حاضری دی تھی، اور ان کی تعداد ہر برس بڑھتی جاتی ہے۔ اس میں وہ مقدس و مبارک پہاڑی ہے، جسے جبل الرحمۃ کہتے ہیں۔ اس پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو مزدلفہ، وادیٔ محسّر اور منیٰ صاف دکھائی دیتے ہیں۔

راستے میں سب سے پہلے منیٰ آتا ہے جو حرم شریف سے تقریباً ساڑھے تین میل دُور ہے۔ اس مقامِ حج پر ہم تھوڑی دیر ٹھہر کر آگے بڑھے۔ ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر وادیٔ محسّر آئی، جو اصحابِ فیل کی ہلاکت و بربادی کا عبرت ناک تاریخی مقام ہے۔ ارشادِ نبویؐ کے مطابق ہم وہاں سے تیزی سے گزر کر مزدلفہ پہنچ گئے، جو وہاں سے ایک یا ڈیڑھ میل دُور ہے۔ وہاں رُکے بغیر ہم عرفات جا پہنچے جو ہماری منزلِ مقصود تھی۔

یومِ عَرَفہ

عرفات اس اعتبار سے حج کا اہم ترین مقام ہے کہ ۹ ذوالحجّہ کو حجّاج کے لیے یہاں دن ڈھلے سے پہلے حاضر ہونا ناگزیر ہے، ورنہ حج نہیں ہوتا۔ اس دن کو عرفات میں حاضری دینے کی رعایت سے "یومِ عَرَفہ" کہتے ہیں۔ اس روز عرفات میں محشر کا سا سماں ہوتا ہے۔ دن چڑھے سے دن ڈھلے تک

اس کی فضا لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کی دلدوز و رقّت انگیز صداؤں سے گونجتی رہتی ہے، ملائکہ کا نزول اور انوار و تجلّیات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ دل آرزوئے "دوست" سے زندہ و بیدار، روح بادۂ دیدِ "دوست" سے سرشار اور گوش حق نیوش ہوں تو وہاں اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کی ایمان افروز صداؤں کی گونج سارا سال سنائی دیتی ہے۔ ایامِ حج کے علاوہ بھی یہاں اہلِ جذب و شوق سارا سال اپنے اِلٰہ و ربّ کے حضور حاضری دینے آتے رہتے ہیں۔ حاضری دینے کا مقصد چہارگونہ ہے: اوّل، اللہ تعالیٰ کی بلاشرکتِ غیرے اُلوہیّت و ربوبیّت یا توحید کا زبان و دل سے اقرار کرنا، دوسرے قَالُوْا بَلٰی کے اِقرار و اِثبات اور روزِ ازل اللہ تعالیٰ سے ارواح کے میثاق کی تجدید کرنا، تیسرے بندے کی اپنی عبدیّت کا اعتراف اور اپنی عبودیّت کا اظہار کرنا، اور چوتھے اپنے گناہوں، خطاؤں، لغزشوں اور فروگزاشتوں، نیز اپنے عجز و درماندگی اور محتاجی و مربوبیّت کا اقرار و اعتراف کرنا اور اپنی مغفرت و بخشش کے لیے فریاد کرنا اور دُعا مانگنا۔

اجتماعی حاضری کی حکمت

ہزاروں، لاکھوں کفن بردوش فریادیوں کی بیک وقت حاضری کے نظارے اور ان کی گریہ وزاری اور فریاد و دُعا کی صداؤں سے ربِّ غفور و رحیم کا دریائے مغفرت و رحمت موجزن ہوکر چھلک پڑتا ہے اور ان پر رحمت و مغفرت کی بارش ہونے لگتی ہے، جس سے اُن کے گناہوں کے داغ دُھل جاتے ہیں اور ان کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ دانائے راز و پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ حجِّ مبرور کے بعد انسان ایسا پاک دل و معصوم ہو جاتا ہے، جیسے بچّہ شکمِ مادر سے نکلتے وقت پاک دل و معصوم ہوتا ہے۔ حج یا اجتماعی حاضری کا حُکم اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے انتہا مہربان ہے اور اُن سے اس قدر محبّت کرتا ہے کہ ان کی توبہ و دُعا قبول کرنے، اُن کی

مغفرت و بخشش کرنے اور اُن پر رحمت و مہربانی کرنے کے بہانے ڈھونڈھتا رہتا ہے۔

صرف دن کی حاضری کیوں؟ حجّاج کو عرفات میں دن چڑھے آنے اور دن ڈھلنے سے پہلے یہاں سے کوچ کر جانے کا حکم ہے۔ کیوں؟ یہ رازِ اسرارِ حج میں سے ہے۔ مجھے یہ راز معلوم کرنے کی طلب و جستجو ہوئی، لیکن کوئی محرمِ راز نہ ملا۔ آخر اُس ذاتِ اقدس سے سوال کیا، جو عالم الغیب و الشہادۃ ہے، اور مجیب الدعوات بھی ہے۔ ایک رات میں "حریمِ دوست" میں ذکر و فکر میں مستغرق، خواب و بیداری کے عالم میں تھا کہ ایک بزرگ و پُراسرار ہستی نے مجھ سے فرمایا: تُم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ انسانوں کو کیوں صرف دن کی حاضری لازم ہے اور شام سے پہلے کیوں انھیں عرفات کو خالی پڑتا ہے؟ یہ رازِ اسرارِ حج میں سے ہے۔ یہ رازِ "دوست" ہے، جسے عشق ہی سمجھ سکتا ہے۔ عشق و ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ اہلِ عشق ہی اللہ تعالیٰ کے دوست اور مومن ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عشق ہی صدق، ایمان اور عبادت ہے، نیز وہی شاہد مشہود اور شہود ہے۔ بہرحال، تمھارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کو اپنی خاکی مخلوق انسانوں اور رات کو اپنی ناری مخلوق جنّوں کی حاضری کے لیے مخصوص کیا ہے، لہٰذا انسان وہاں رات بسر کرنے کے اور جنّ وہاں دن گزارنے کے مجاز نہیں۔ اِنس و جنّ اور ملائکہ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں، جو اس وَادیِ لبّیک میں حاضری دیتی ہیں۔

محشر اور مثیلِ محشر میں فرق سنو! محشر اور مثیلِ محشر میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ قیامت کے دن بندے محشر میں اپنا حساب دینے کے لیے حاضر کیے جائیں گے۔ وہ اس دن مجبور و بے اختیار ہوں گے۔ وہ یومِ حشر دراصل یوم الدّین یعنی جزا و سزا کے فیصلے کا دن ہوگا۔ اس کے برعکس دُنیا

کہ اس مثیلِ حشر میں اللہ تعالیٰ کے بندے اپنے ارادہ و اختیار سے توبہ و استغفار کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت حاصل کرنے کی خاطر حاضر ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یومِ عرفہ توبہ و انابت اور مغفرت و رحمت کا دن ہے۔

مبارک و کامیاب اور عظیم و برگزیدہ ہیں وہ بندے جو حسنِ نیت، صدق و اخلاص اور جذب و شوق کے ساتھ اپنے الٰہ و ربّ کے حضور حاضری دیتے ہیں، جو رات دن اُس کے ذکر و فکر میں مستغرق اور بادۂ عشق سے سرشار رہتے ہیں، نیز اہلِ حسن و سرور بھی ہیں اور دوسروں کے لیے رحمت بھی۔ یہی اللہ تعالیٰ کے دوست (اولیاء اللہ)، یہی وارثِ جنّت اور شاہد "دوست" ہوتے ہیں۔

مسجدِ نمرہ اور غیر مرئی ہستیاں

یہ خود ذاتی مشاہدہ و واردات کی ایک بات تھی، جو حکایتِ جذب و عشق لکھتے ہوئے یاد آگئی۔ بہرکیف، عرفات کے حدود میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ہم نے مسجدِ نمرہ کی زیارت کی، جہاں خطبۂ حج دیا جاتا ہے اور اس دن ظہر و عصر کی قصر نمازیں اکٹھی پڑھی جاتی ہیں۔ یہ نوری و ناری مخلوق کی زیارت گاہ بھی ہے۔ یہ ایک کشادہ مسجد ہے، جس کی فضا اہلِ جذب و شوق کے پسینے کی خوشبو سے جانفزا سے مہکتی رہتی ہے۔ اُس کے خاموش و تنہا ماحول میں ہم نے فرداً فرداً نفل پڑھے، لیکن خدا جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ ہمارے سوا اور بھی غیر مرئی ہستیاں وہاں ذکر و فکر اور قیام و سجود میں مشغول ہیں۔ یہ احساس روح پرور بھی تھا اور بصیرت افروز بھی۔

جبلِ رحمت

مسجدِ نمرہ سے ہم جبلِ رحمت گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ اُوپر چڑھنے کے لیے زینے بنے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے ذریعے آسانی سے اُوپر چڑھے، جہاں چبوترہ بنا ہوا ہے۔ حج کے دن جبل الرحمۃ پہ پہنچنا ازبس دشوار بلکہ عموماً محال ہوتا ہے، کیونکہ لاکھوں حجاج کو اس کی چوٹی پر

پہنچنے اور نفل پڑھنے کی طلب و جستجو ہوتی ہے، لہٰذا ان کے عُشرِ عشیر ہی کو اپنی آرزو پوری کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں وہاں نفل پڑھنے کی سعادت ملی۔ یہ تصوّر و احساس کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ و آلہٖ وسلّم وہاں تشریف فرما ہوئے تھے، بیک وقت سُرور انگیز بھی تھا اور رقّت انگیز بھی۔ روح قدم بوسی کے لیے تڑپی، دل بار بار اس مقام پر سجدہ ریز ہونے کی آرزو مچلنے لگی، جیسے آپؐ کے پائے مبارک چُومنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ میں نے اس مقام کے لیے دُعا مانگی اور ایک جگہ سر بسجود ہو گیا۔ ایک خاص قسم کی خوشبو آئی اور مشامِ جاں کو معطّر کر گئی۔ آپؐ کے نقشِ قدم پر سر بسجود ہونے سے جو کیف و سُرور حاصل ہوا، اُس کا بیان محال ہے۔ روح کو آرزو تھی کہ سر اپنے مسیحا و ہادی اور حبیبؐ "دوست" علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے قدمِ مبارک پر پڑا رہے اور زمانے کی گردش رُک جائے اور ساعتِ حضوری جاوداں بن جائے، لیکن ایسی آرزو کہاں پوری ہوتی ہے۔ نفل و دُعا سے فارغ ہوئے تو ہمارے دل کی عجیب حالت تھی۔ ہم گرد و پیش کے صحرائی، کوہستانی مناظر دیکھنے لگے، اُن کے نظّارے میں آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سوز و ساز اور رُوح کا جذب و شوق تھا۔

"دوست" نے دیکھنا اور سوچنا مجھے فطرۃً ودیعت کیا ہے۔ سوچ کے سفر کے ساتھ احساسات و جذبات کی کیفیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ میری اس سوچ نے مجھے کسی اور ہی عالم میں پہنچا دیا کہ اس وادیِ مقدّس میں کروڑوں صدیقین، شہداء اور صالحین نے اپنے اللہ ربّ کے حضور حاضری دی ہوگی اور جبینِ رحمت پر خاص طور سے اس کی بارگاہ میں سر بسجود ہوتے ہوں گے، نیز یہ کہ ہم کس قدر خوش نصیب ہیں کہ "دوست" نے ہمیں بھی اس میدانِ مقدّس میں اپنے حضور حاضری دینے اور اپنی بارگاہ میں جبینِ عجز و نیاز جھکانے کی سعادت بخشی ہے۔ اس عالمِ جذب و مستی میں کیا دیکھتا ہوں کہ جبلِ رحمت پر بالخصوص نورِ رحمت کی "برفباری" ہو رہی ہے۔ میں نے برفباری کی تعبیر اس لیے اختیار کی ہے کہ نورِ رحمت کے گرنے کا نظّارہ بارش کی طرح نہیں، برفباری کی طرح ہوتا ہے۔

یہ بڑا ہی حسین و نظر افروز، دلآویز و بصیرت افروز اور سرور انگیز و کیف آفریں منظر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا اہلِ شوق و نظر ہی کو عین الیقین بلکہ حق الیقین ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی سچ مچ جبلِ رحمت ہے، کیونکہ یہاں رحمت برستی اور دلوں کو زندہ کرتی رہتی ہے۔

جذبۂ عشق ہو تو عرفات بہشت ہے

حج کے دن لاکھوں بندگانِ خدا اس میدان میں سما جاتے ہیں۔ اہلِ جذب و شوق کو نہ شدّتِ گرما کی پروا ہوتی ہے نہ تمازتِ آفتاب کی۔ اُن کے لیے یہ میدان بہشت ہوتا ہے، جہاں انھیں کوئی چیز تکلیف نہیں دیتی۔ وادیِ محبّت کا خارِ مغیلاں بھی پائے شوق کے لیے پھول کی پتّی ایسا ہوتا ہے۔ اہلِ شوق و مستی کے لیے میدانِ عرفات کا ذرّہ ذرّہ حُسن و دلکشی میں گوہرِ شہوار سے زیادہ نظر افروز و گران بہا ہے۔ کوئے یار میں جانا ہی ان کے لیے فردوسِ بریں میں پہنچ جانا ہوتا ہے۔ حج کے موقع پہ حاجیوں کو تکلیف ضرور ہوتی ہے، لیکن اہلِ محبّت کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ تو اس کے ہر نظّارے کے عوض جان دینے میں اپنی سعادت و کامرانی سمجھتے ہیں۔ وہ کوہِ ہر اس تکلیف پہ جان دینے کی تمنا رکھتے ہیں جو کوئے یار کی سیر میں درپیش آئے۔ لاکھوں حجّاج کے انبوہِ کثیر میں خُدا جانے کتنے لوگ اپنے اِلٰہ و ربّ کے سچّے پرستار اور دوست ہوتے ہیں۔ ان میں بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچّے سبھی ہوتے ہیں۔ وہ اس میدان میں اس طرح اللّٰہ تعالیٰ کے حضور ہوتے ہیں جس طرح محشر میں حاضر ہوں گے۔ احرام باندھے، دل میں آتشِ محبّت کی روشنی لیے اور مُنھ سے لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہتے، دعائیں مانگتے، حمد و ثنا کرتے، آہ و فغان اور الحاح و زاری کرتے عُمر کا ایک دن گزارتے ہیں، ایک دن جو قدر و قیمت میں ہزاروں دنوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ دل میں حُسن و نُور اور سچّا ذوق و شوق ہو تو میدانِ عرفات کی ہر ساعت عُمرِ عزیز کے برابر ہوتی ہے۔ حج کی مشکلات و تکالیف کی شکایت عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دل ذوق و شوق، سوز و مستی اور مہر و وفا سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ محبّت سے لذّتِ حضوری ملتی ہے اور جسے یہ نعمت

میسّر آ جائے اُسے نہ راحت و آرام، درد و تکلیف اور سود و زیاں کا احساس ہوتا ہے نہ دھیان۔

میدانِ عرفات کیا ہے؟ یہ اپنے اِلٰہ کے اظہارِ عبودیّت اور اقرارِ عبدیّت کا مقام ہے، یہ اپنے ربِّ جلیل و جمیل کے سامنے اپنی مربوبیّت کے اعتراف کی جگہ ہے۔ یہاں امیر و غریب سب کو کفن بدوش حاضر ہونا پڑتا ہے، اس ایقان و اذعان کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انھیں دیکھ رہا ہے، ان کی پکار سُن رہا ہے اور حشر کے روز اپنے اعمال کا حساب دینے، پھر انھیں اپنے ربِّ جلیل کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ حج در اصل شہنشاہِ دو جہاں کے حضور حاضری سے عبارت ہے۔ یہ ایقان کہ ایک حقیر و ناچیز بندہ اپنے خدائے ذوالجلال کے حضور حاضر ہے، اس قدر روح کو لرزا دینے اور دل میں ہیبت و خشیّت پیدا کرنے والا ہے کہ زبان و قلم اس کیفیّت کے بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ پھر یہ احساس و اذعان کہ ایک عابد و پرستار کو اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کی محفل میں باریابی نصیب ہوئی ہے، اتنا جانفزا اور سرور انگیز ہوتا ہے، کہ وہ اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر آن، آنِ جاودان بن جائے۔ یہ احساس کہ بندۂ محبّت اپنے اِلٰہ کا مشہود ہے، بے حد سُرور انگیز ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس سے دل میں یہ آرزو بھی پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ اپنے اِلٰہ کے حُسنِ صورت کا ایک جلوہ دیکھ کر شاہدیّت کے مقام پر فائز ہو جائے۔ شاہدیّت کے مقام پر فائز ہو کر ہی انسان صاحبِ حُسن و سُرور بنتا ہے۔ یہی کامیاب و کامران اور مثالی انسان ہوتا ہے۔

ربِّ رحیم و کریم کو اپنے بندوں کی توبہ بڑی محبوب ہے۔ چنانچہ توبہ کے لیے درِ اجابت ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ مغفرت خود توبہ کی منتظر رہتی ہے۔ قدرت کو خود توبہ کی آرزو رہتی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے بے انتہا عزیز ہیں۔ جس میدان میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم، صحابہ کرامؓ اور بڑے بڑے جلیل القدر بزرگوں نے حاضری دی اور توبہ و استغفار کی ہو، وہ کتنا متبرک مقام ہوگا، اس کا اندازہ کچھ اصحاب

حُسن و سُرور اور اہلِ جذب و شوق ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی روح پرور و رقت انگیز صدائیں ہر وقت وہاں سنائی دیتی ہیں، لیکن انھیں جن کے دل اپنے اللہ سے ملے ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے یہ حج کا دن ہے اور اللہ کے بندوں کی پکاریں، فریادیں، مناجاتیں اور دعائیں میرے دل کے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ کتنی شیریں، ایمان افروز اور وجد آفریں تھیں وہ صدائیں۔ میں نے اپنے عالمِ کیف و مستی اور جذب و شوق میں حج کا سُرور انگیز سوز و گداز حاصل کیا۔ دل تو یہ چاہتا تھا کہ زمانے کی رفتار تھم جائے اور ہم اس جنّتِ نگاہ منظر کو دیکھتے اور فردوسِ گوش صداؤں کو دل کے کانوں سے سنتے رہیں، لیکن زمانہ کہاں تھمتا ہے؟ وقت دریائے رواں ہے جو ہر آن رواں دواں رہتا ہے۔ عُمر بھی مستقلاً گزرتی اور گھٹتی رہتی ہے، لیکن انسان عموماً اس حقیقت سے بے خبر رہتا ہے یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتا ہے۔ ہمیں حرم شریف لوٹنا تھا، لہٰذا میدانِ عرفات سے رخصت ہونا پڑا۔ راستے میں مزدلفہ اور منیٰ آئے، لیکن ہم رک نہ سکے، کیونکہ ہمیں دوسرے دن ان کی زیارت کرنی تھی۔

عُمرۂ ثانی و صہبائے دو آتشہ

اگلے دن ہم نے دوبارہ عُمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ عُمرہ کے لیے احرام باندھنے کے مقام تنعیم میقات گئے، احرام باندھا، نوافل پڑھے اور حرم شریف پہنچ گئے۔ اس دفعہ عُمرے نے صہبائے دو آتشہ کا نشہ و کیف اور جذب و سُرور بخشا۔ طواف شروع کرتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ اللہ اپنے گھر میں جلوہ بداماں ہے۔ دل کے لیے یہ حشر بداماں نظارہ تھا، اور وہ کس طرح حریفِ نظارہ ہوا، "دوست" ہی یہ راز جانتا ہے۔ مجھ پر جذب و مستی اور جنون و شوق کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اہلِ جذب و شوق کے ساتھ میں بھی طواف میں مشغول تھا۔ میں بھی رکنِ یمانی کو مس کرتا اور حجرِ اسود کو چومتا اور دعائیں مانگتا رہا، لیکن نظریں اپنے اللہ پر مرتکز رہیں اور اس کے جمال و جلال کے نظارے سے جمالیاتی ٹھنڈک حاصل کرتی رہیں۔ یہ جمالیاتی ٹھنڈک تاثیرِ حُسن ہوتی ہے، جمالیاتی لذت و سُرور اور کیف و مستی کی روح پرور و مسحور کُن تھی۔

مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ جذب و مستی کے عالم میں والہانہ انداز میں طواف کر رہا تھا۔ دفعتاً کسی نے میرا بازو پکڑا۔ میں نے دیکھا تو وہ میری بیگم تھیں "کب تک طواف کرتے رہیں گے؟ سات چکر تو کب کے ہو چکے ہیں۔ آئیں، اب سعی کریں۔" بیگم کی آواز سے میں چونک پڑا۔ اس نے مجھے قرب و حضور کی سعادت ہی سے نہیں، میرے اللہ کی دید کی جمالیاتی ٹھنڈک سے بھی محروم کر دیا۔ میرے دل پر جو گزری، میرا خدا ہی جانتا ہے۔ نور کی برف باری اب بھی ہو رہی تھی، فرشتوں کے آنے جانے کا تانتا اب بھی بندھا ہوا تھا، جن و انس برابر طواف کر رہے تھے۔ ان میں اہلِ نظر اور صاحبِ حُسن و سُرور بھی تھے۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا، لیکن اب "دوست" جلوہ بداماں نہ تھا۔ میرا مشاہدہ و تجربہ ہے کہ وہ جمالیاتی لمحات ہی میں اہلِ شوق و نظر کو اپنی دید کی سعادت سے بہرہ مند کرتا ہے۔

ہم سعی کے لیے صفا و مروہ گئے۔ راستے میں آبِ زمزم پیا اور سعی کرنے لگے۔ دل پر ابھی تک جذب و مستی کی کیفیت طاری تھی۔ بیگم نے کہا: "آپ سعی نہیں کر سکیں گے۔ پھر ڈاکٹروں نے ایسا کرنے سے منع بھی کیا ہے۔ کہیں دردِ دل شروع نہ ہو جائے۔" میرے دل میں "دوست" کی تصویر تھی، میرا مسیحا میرے دل میں تھا۔ میرے مجروح و بیمار دل کو کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ ہم نے سعی کی اور مجھے درد و تکلیف اور تکان و اضمحلال کا احساس تک نہ ہوا۔ ہم نے بال ترشوائے اور ہوٹل لوٹ آئے۔

مزدلفہ: شبستان اہلِ جذب و شوق

اس روز ہم مزدلفہ و منیٰ کی زیارت کے لیے نہ گئے۔ دوسرے دن پہلے مزدلفہ پہنچے جسے مشعرِ الحرام بھی کہتے ہیں۔ یہ حرم شریف سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ حج کے دن حُجاج کے لیے غروبِ آفتاب سے پہلے عرفات سے نکلنا اور مزدلفہ میں قیام کرنا ضروری ہے۔ یہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں اکٹھی اور قصر پڑھنی سُنّت ہیں۔ یہاں شب بیداری کے بجائے سونا اُسوہ حسنہ ہے۔ یہ اہلِ جذب و شوق کا شبستان یا مقامِ استراحت ہے۔ یہاں ایک

عجیب قسم کی راحت و آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں کے منظر میں جلال سے زیادہ جمال پایا جاتا ہے۔ ہم دیدۂ شوق سے مقامِ مزدلفہ کا نظّارہ کرتے رہے۔ اس کا میدان عرفات کے میدان سے رقبے میں بہت کم دکھائی دیتا ہے، لیکن یہ کتنی بصیرت افروز بات ہے کہ تنگنائے مزدلفہ میں لاکھوں انسان سما جاتے اور استراحت کرتے ہیں۔ یہاں غروبِ آفتاب سے رات تک عُشّاق کاروان در کاروان آتے رہتے ہیں۔ میں مزدلفہ کے نظّارے میں محو تھا اور میری چشمِ تصوّر کے سامنے اہلِ جذب و شوق کے قافلے آ رہے تھے اور وہ اپنے اللہ کی خوشنودی کے لیے خوابِ محبّت کے مزے لوٹ رہے تھے کہ کسی نے چُپکے سے دل سے کہا: "مُزدلفہ اہلِ جذب و شوق کا شبستانِ محبّت ہے۔ وہاں سونا ہی رضائے "دوست" ہے تاکہ رُوح اپنے اِلٰہ کی دید و لقا کی لذّت و سعادت سے محروم نہ رہے۔" حجّاج کو وہاں صرف ایک رات ٹھہرنے کا اِذن ہوتا ہے۔ ۱۰۔ ذوالحجّہ کو یعنی دوسرے دن انھیں مسجد مشعرِ الحرام میں صبح کی نماز باجماعت پڑھنے کے بعد طلوعِ آفتاب سے ذرا پہلے کوچ کر کے منیٰ پہنچنا ہوتا ہے۔ منیٰ میں تین جمرے یا شیطان کے تین بے شکل و صورت مجسّمے ہیں، جن کو کنکریاں مارنا ہوتی ہیں۔ اس عمل کو رمی جمار کہتے ہیں، اس کے لیے حجّاج راستے میں چھوٹی چھوٹی ستّر کنکریاں اُٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان جمروں کو اولیٰ، وسطیٰ اور عقبیٰ کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک پر تین دن (۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجّہ) سات سات کنکریاں مارنی ہوتی ہیں۔

وادیِ محسّر یا موت کی وادی

مزدلفہ سے کچھ فاصلے پر وہ مقہور و مغضوب تاریخی میدان ہے، جہاں یمن کے حکمران ابرہہ کا لشکرِ جرّار عذابِ الٰہی سے ہلاک و برباد ہوا تھا۔ چونکہ اس لشکر کے ساتھ ہاتھی بھی تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انھیں "اصحاب الفیل" سے تعبیر کیا ہے، اور ان کے عبرتناک انجام کا ذکر سورۃ الفیل میں کیا ہے۔ ابرہہ نے خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کی خاطر مکّہ مکرمہ پر چڑھائی

کی تھی۔ دشمنِ خدا ابرہہ دشمنِ رسولؐ کی طرح ذلّت کی موت مرا تھا۔ ہم سُنّتِ رسولؐ کے مطابق تیزی سے وہاں سے گزر گئے۔

منٰی، قربان گاہِ ذبیح اللہؑ

ہم مزدلفہ سے منٰی پہنچے تو سب سے پہلے ان جمروں کو دیکھا، جو شیطنت کی علامت ہیں، اور اہلِ شوق کو شیطان سے نفرت کرنے اور اُسے ملامت کرنے کی ریاضت کرائی جاتی ہے۔ رمی جمار کیا ہے؟ شیطنت سے عملاً بے زاری و دشمنی کا اظہار و اعتراف ہے۔ اہلِ جذب و محبّت ان جمروں پر کنکریاں مار کر ابلیس کو جتلاتے ہیں کہ وہ اس سے بے زار ہیں اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ آدم و ابلیس میں آویزش روزِ اوّل سے جاری ہے۔ ابلیس کا وظیفۂ حیات اولادِ آدم کو اس کے اِلٰہ و ربّ سے دُور و مہجور کر کے اسے ناکام و نامراد بنانا ہے۔ وہ خود مردُود ہے، انسان کو بھی مردُود بنانا چاہتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اِنسان کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ شیطان سے بچے اور اس کے جالیاتی فریب میں نہ آئے، کیونکہ وہ اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ رمی جمار اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اللہ کے بندے شیطان کو اپنا دشمن سمجھتے اور اس سے بے زار ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ طیبّہ سچّی تھی اور اتنی سچّی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی آخری سچّی کتاب اس پر شاہد ہے۔ آپؑ کا قول و فعل سچّا، دل سچّا، سوچ سچّی اور نیّت سچّی تھی، الغرض وہ ایک سچا موتی تھے، اور اپنے اِلٰہ و ربّ کی نظر میں بڑے ہی محبوب تھے، اسی لیے اس نے آپؑ کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ محبّت جتنی زیادہ ہو، اتنی ہی بڑی قربانی بھی چاہتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی محبّت کو بھی امتحان سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ شاہدِ حقیقی نے خواب میں اپنے دوست کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے لختِ جگر حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کو قربان کر دے۔ آپؑ سچّے تھے، پیغمبر تھے اور آپؑ کا خواب بھی سچّا تھا۔ نیز آپؑ رموزِ محبّت سے بھی آگاہ تھے، لہٰذا آپؑ نے اپنی طرف سے اپنا لختِ جگر قربان کر دیا۔ اس طرح تسلیم و رضا، اطاعت و قربانی اور

وفاداری بشرطِ استواری کی ایسی مثال قائم کردی کہ آج تک پھر دیکھنے میں نہیں آئی۔

قربانی یادگارِ رسمِ عاشقی ہے

کیا ہم بھی "دوست" کے ایک اشارے پر اپنے لختِ جگر کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر سکتے ہیں؟ کیا ہم ایسے امتحان میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ غالباً نہیں۔ خدائے عالم الغیب یہ جانتا تھا، اسے انسان کی کمزوری کا علم تھا، لہٰذا اس نے صرف جانوروں کی قربانی کا حکم دیا تاکہ رسمِ عاشقی پوری اور اس کے دوست کے جذبۂ قربانی کی یاد تازہ ہوتی رہے، نیز اس کے بندے ثواب بے حساب لیتے رہیں۔ فیاضی ہو تو ایسی ہو۔

میں منیٰ میں ان خیالوں میں کھو گیا۔ مجھے اپنے دعوائے محبت پر سخت ندامت محسوس ہوئی۔ دل نے کہا: پھر کبھی مہر و وفا کا دعویٰ نہ کرنا۔ محبت ہو تو ایسی ہو جیسی خلیل اللہ علیہ السلام کی تھی۔ غیب سے ندا آئی: وہ تو جلیل القدر پیغمبر تھے، ان کی بات اور تھی۔ تمھارا کام اپنے لختِ جگر کو قربان کرنا نہیں، گائے بکرے وغیرہ کو قربان کرنا ہے۔ وہ عظیم تھے۔ ان کا امتحان بھی اتنا ہی عظیم تھا۔ تم نہایت چھوٹے ہو۔ تمھارا امتحان بھی اسی نسبت سے چھوٹا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ تمھیں اس امتحان میں بھی کامیاب ہونا ہے اور اس کے لیے سچے جذب و شوق کا ہونا ناگزیر ہے۔

جمرے ابلیس کی ناکامی کی علامت اور اس واقعیت کی یادگار ہیں کہ شیطنت سچی عبدیت کی حریف نہیں ہو سکتی اور اس سے شکست کھانا، اس کا مقدر ہے۔ اہلِ شوق جب قربانی کے جانور ذبح کرتے ہیں تو انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ عاشقِ صادق کی طرح اپنے لختِ جگر کی گردن پر چھری چلا رہے ہیں۔ وہ اس کا خون بہاتے ہیں تو اس تصور کے ساتھ کہ جیسے وہ اپنے جگر گوشے کا خون بہا رہے ہیں۔ محبت میں اپنی عزیز ترین خواہش، شے اور جان و دل تک کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ قانونِ محبت سے نابلد ہیں، انھیں اس قربانی کی حقیقت و اہمیت کا ادراک و احساس نہیں ہو سکتا۔ عقلِ عیار کو اس پر استہزا

کرتے بھی دیکھا ہے۔ قربانی دینا اہلِ جذب و شوق کا مسلک ہے۔ یہ رسمِ عاشقی ہے، جس کی حقیقت اہلِ جذب و شوق ہی جانتے ہیں۔ اللہ ربّ گوشت و خون سے بے نیاز ہے۔ اُسے تو وہ جذبہ عزیز ہے جس کا اظہار اس کے عشاق قربانی کرتے وقت کرتے ہیں۔ مجھے وہ وہ وقت یاد آ گیا جب میں بھی قربانی کرتا تھا۔ جب میں بھی بکرے کی گردن پہ چھری چلاتا تھا۔ کیا میرا جذبہ سچا ہوتا تھا یا میرا عمل محض رسمی ہوتا تھا؟ میرے دل میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی عظمت و عقیدت اِنتہا کو پہنچ گئی۔ آپ ایسے عظیم انسان اور عُشاق ہی اللہ تعالیٰ کے دوست ہو سکتے ہیں۔ میں ان تصورات میں گم تھا کہ دفعتاً کسی کی آواز پہ چونک پڑا۔ میری بیگم کہہ رہی تھیں کہ اب واپس چلنا چاہیے۔

کڑی: ۱۳

حرم شریف اور شیاطین

ایک دن دورانِ گفتگو میں ایک بزرگ نے بتایا کہ حرم شریف کے باہر شیاطین کی کمین گاہیں ہیں، جن کی نگرانی خود ابلیس کرتا ہے۔ اُس نے اللہ تعالیٰ کے گھر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اس پر مسلسل حملے کرتا رہتا ہے تاکہ اس کے بندوں کو اُن کے من کی جنّت سے نکالتا اور انھیں اہلِ نار بناتا رہے۔ وہ مقدّس مقامات پر خصوصیّت سے سرگرمِ عمل رہتا ہے، لہٰذا ہر جگہ اور ہر مقام پر اس سے چوکس اور ہوشیار رہنا اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں رہنا چاہیے اور اس کے لیے مسلسل دُعا کرتے رہنا چاہیے۔

میں نے پُوچھا: کیا حرم شریف کے اندر بھی شیاطین آتے جاتے ہیں؟

بُزرگ: ہاں۔ شیطان ہر جگہ آجا سکتا ہے۔

کیا وہ شیطان تھے؟

میرے دل میں خلش سی پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے مقدّس و مطہر گھر میں، جہاں وہ خود ہو، جہاں اس کے ملائکہ اور بندے ہر وقت اُس کے ذکر و فکر، حمد و ثنا، پرستش و عبادت اور طواف و سعی میں مشغول رہتے ہوں، وہاں شیاطین کیسے آنے کی جسارت کر سکتے ہیں؟ ابھی ایک ہی دن گزرا تھا کہ مغرب سے ذرا پہلے میں، مطاف میں ایک جگہ بیٹھا، جلوہ گاہِ "دوست" کے نظاروں میں محو تھا کہ اچانک میری نظر غیر ارادی طور پر ایک جوڑے پر پڑی اور مجھے متوحّش کر گئی۔ وہاں خاص کر عورت کو نظر بھر کر دیکھنے کا ہوش کسے اور کہاں ہوتا ہے؟ لیکن میری نظر جو بے ارادہ ان پر پڑی تو انھیں دیکھتی رہ گئی۔

پہلی نظر میں عورت خوبصورت دکھائی دی، لیکن دوسری نظر میں وہ اتنی قبیح، بدصورت اور مکروہ نظر آئی، جیسے بھیانک مُردار ہو۔ اس سے اس قدر گھن آئی کہ خُدا کی پناہ! اسی طرح وہ مرد اپنی جوانی و رعنائی کے باوجود نظرِ مکرّر میں ایسا دکھائی دیا جیسے کوئی گھناؤنا وجود اپنی بدترین صورت میں نمودار ہو گیا ہو۔ دونوں آنکھوں میں شیطنت کھیل رہی تھی۔
دل نے کہا: ہو نہ ہو یہ شیطان ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے میرے پاس ایک صاحبِ حال بُزرگ بیٹھے تھے میں نے جرأت کر کے اُن سے عرض کیا: گستاخی معاف، میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میری نظر ابھی اچانک ایک مرد اور عورت پر پڑی تھی، جن کے چہروں پر لعنتیں برستی تھیں اور آنکھوں میں شیطنت ناچتی تھی۔ مجھے ان پر شیطان ہونے کا گمان گزر رہا ہے۔ کیا میرا گمان غلط تو نہیں؟
اُنھوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور فرمایا: نہیں، آپ کا گمان غلط نہیں۔ وہ واقعی شیطان تھے۔ نہ تو آپ کی نظر اور نہ عقل ہی نے دھوکا کھایا۔ حُسنِ نظر ہو تو شیطان اپنی اصل قبیح و مکروہ شکل و صورت میں نظر آجاتا ہے۔
میں نے لاحول پڑھی، توبہ و استغفار کی اور شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔ پھر "حریم دوست" کے مناظر سے دولتِ دل لُوٹنے میں مشغول ہو گیا، لیکن دل سے اس مشاہدے کی خلش دُور نہ ہوئی۔

ابلیس، چیلّ اور بُزرگ

دوسرے دن عصر کے وقت ہم حسبِ معمول، بابُ الہجرت کے راستے، حرم شریف میں داخل ہوئے تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ اچانک میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک لحیم و شحیم لمبا تڑنگا سیاہ فام شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پھٹکار تھی اور اس سے مکّاری و عیّاری مترشّح تھی، آنکھوں میں شیطنت کھیل رہی تھی۔ وہ ابلیسی انداز میں حرم مقدّس کے اندر جھانک رہا تھا۔ میری آنکھیں اُس کی آنکھوں سے دوچار ہوئیں تو

وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ برقِ شیطنت بن کر میرے دل پر گری اور روح کانپ اٹھی۔ اس نے میرا چپل اٹھایا، اشارے سے کچھ کہا اور باہر نکل گیا۔ میں حیران و پریشان یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ گلی والے بزرگ اچانک نمودار ہوئے۔ مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں سلام و مصافحہ کرکے ان کے قریب بیٹھ گیا تو انھوں نے مجھے مخاطب کرکے فرمایا:

"آپ نے اس مردود کو دیکھا؟ وہ ابلیس تھا، جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اپنے جمالیاتی فریب سے ورغلانے یہاں آتا ہے۔ آپ کے چپل اٹھانا اس کی چال تھی۔ وہ اس بہانے آپ سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کیجیے کہ آپ نے اس کا پیچھا نہ کیا اور نہ چپل کی پروا کی۔ شیطان کا پیچھا کرنے سے اُسے انسان کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دوست بن کر انسان کو سبز باغ دکھا دکھا کر بہلاتا پھسلاتا اور اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ شیطان کی دوستی کا مطلب انسان کی اپنی ذات سے دشمنی ہے، جس کا نتیجہ ذلت و رسوائی، ناکامی و نامرادی اور ہلاکت و بربادی ہوا کرتا ہے۔

میں: مجھے یہ دیکھ کر بڑا ہی تعجب ہوا ہے کہ ابلیس و شیاطین حرم شریف ایسے مقدس و مطہر مقام میں بھی داخل ہو سکتے ہیں؟

وہ: شیطان کا ہر جگہ گزر ہو سکتا ہے، اور وہ ہر مقدس سے مقدس جگہ کو اپنی کارستانیوں کی جولانگاہ بنانے سے نہیں چوکتا۔ یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جہاں انسان ہو، وہاں شیطان ہوتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح سرگرمِ عمل رہتا ہے، جس طرح وجودِ انسانی میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بندے اُس سے ہمیشہ چوکنے اور ہوشیار رہتے اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے شیطان کو مسلمان بنانے اور اس کے شر سے بچنے کی خاطر اللہ تعالےٰ کی

پناہ میں آئے بغیر بات نہیں بنتی، اور انسان کا ایمان معتبر نہیں بنتا۔ یاد رکھو! اللہ جلّ شانہٗ کے بعد شیطان نفسیاتِ انسانی کا سب سے بڑا عالم اور اُسے دھوکا دینے اور گمراہ کرنے میں ماہرِ اعظم ہے۔ اس کا فریب جمالیاتی فریب ہے، جس سے اہلِ حُسن و نظر ہی محفوظ رہتے ہیں۔

میں : جمالیاتی فریب سے آپ کی مراد کیا ہے ؟

وہ : اسے واضح طور سے سمجھنے کے لیے اس حقیقت کی صراحت کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صُوری و معنوی یا ظاہری و باطنی طور سے حسین بنایا ہے اور اُسے جمالیاتی حِس ودیعت کی ہے، جس کی بدولت وہ طبعًا یا فطرتًا حُسن پسند ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حُسن یعنی جمال و جلال اور احسان و حسنہ سے محبت کرنا اور محسن بننا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ اس کی نقیض یہ ہوئی کہ وہ قبیح کے ہر مظہر سے، جیسے شرک، وثنیت پرستی، جرم و گناہ، ظلم و استحصال، بخل و شر، فتنہ و فساد، جنگ و جدال وغیرہ سے طبعًا نفرت کرتا ہے۔ شیطان انسان کی اس جمالیاتی۔نفسیاتی حقیقت سے خوب آگاہ ہے، لہٰذا وہ اس کی اصل خوبی یا (آج کے محاورے میں کمزوری) سے فائدہ اٹھانے کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ انسان کی ہر قبیح سے قبیح خواہش و حرکت اور قول و فعل کو مزین و خوشنما یا حسین بنا کر اُسے دکھاتا ہے اور ایسے جرم و گناہ کرنے پر مائل و آمادہ کرتا ہے۔ اپنے جمالیاتی فریب ہی کے ذریعے وہ انسان کی خواہشات کو اُس کا "اِلٰہ" (یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) بناتا ہے۔

میں : ابلیس کے جمالیاتی فریب سے بچنے کا طریقہ کیا ہے ؟

وہ : تزکیۂ نفس، اور تزکیۂ نفس کا مجرّب نسخہ محبتِ الٰہی ہے، جس کے سوز سے نفس جرم و گناہ کے اثرات سے پاک و منزّہ ہوتا ہے اور اس کی قوتیں نشو و ارتقاء کرنے لگتی ہیں اور انجام کار انسان دانا و بینا، صاحبِ ذوق و نظر اور اہلِ حُسن و سرور

بن جاتا ہے۔ ایسے ہی انسان حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے دوست اور اس کی جنّت کے وارث ہوتے ہیں۔ قرآنِ مجید ایسے ہی انسان کو اپنی زبان میں نفسِ مطمئنّہ کہتا ہے۔ اس میں یہ ازبس اہم نکتہ مضمر ہے کہ طمانیتِ نفس اہلِ جنّت کی علامت ہے۔ یہ عالمگیر معیار ہے، جس کے مطابق ہر شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرکے معلوم کرسکتا ہے کہ وہ نفسِ مطمئنّہ یا اہلِ جنّت سے ہے یا نہیں۔

اسی طرح اہلِ جہنّم کی نشانی یہ ہے کہ وہ اہلِ نار یا آتش بجاں ہوتے ہیں، یعنی ان کے دلوں کو خوف و حزن کی آگ لگی رہتی ہے، جس کے سبب وہ طمانیّت کو ترستے رہتے ہیں۔

شیطان اور امتحانِ زندگی

یہ دُنیا چونکہ دارالامتحان ہے، اس لیے انسان کے پیچھے شیطان، خیر کے پیچھے شر، حُسن کے پیچھے قُبح اور سچ کے پیچھے جھُوٹ لگا رہتا ہے۔ انسان کو یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے اور شیطان سے محترز د ہوشیار رہنا چاہیے۔ جو لوگ یہ حقیقت اس مقدّس سرزمین میں آکر بھُول جاتے ہیں، وہی ابلیس کے ہاتھوں مات کھا جاتے ہیں اور جیسے جاتے ہیں ویسے لوٹ آتے ہیں۔ لیکن جو اہلِ جذب و شوق یہ حقیقت یاد رکھتے ہیں اور شیطان سے خوف بداماں اور محترز رہتے ہیں، وہ اس دیارِ مقدّس سے عُمرہ یا حج کے بعد اس طرح لوٹتے ہیں جیسے انسان بطنِ مادر سے گناہوں سے پاک وصاف پیدا ہوتا ہے۔ شیطان اپنے بندوں کو سنگدل اور اہلِ نار بنا کر اور رحمٰن اپنے بندوں کو سعید اور اہلِ حُسن و سُرور بنا کر لوٹاتا ہے۔ ایک اندھے اور دوسرے بینا و بصیر لوٹتے ہیں۔ باتیں ان کی سچی ہوتی ہیں جو بینا، سچّے اور اہلِ حُسن و سُرور ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ان ان کی باتیں جھوٹی ہوتی ہیں، جو اندھے، جھوٹے اور سیاہ باطن ہوتے ہیں۔

شیطان دراصل ایک ذریعہ ہے امتحان کا، جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا لیتا ہے،

لہٰذا وہ ہر دم انسان کے تعاقب میں رہتا اور اسے امتحانِ زندگی میں ناکام بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ جس طرح حرم شریف کے اندر ملائکہ طواف و عبادت میں مشغول رہتے ہیں، شیاطین بھی اس کے باہر اپنی شیطنت میں سرگرم کار رہتے ہیں، لہٰذا غفلت لمحاتی بھی ہو تو انسان کی ناکامی و نامرادی کا باعث بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ جذب و شوق بھی جب حرمین شریفین سے باہر نکلتے ہیں تو شیطان سے ہوشیار و محترز رہتے ہیں۔ ابلیس دل کی دُنیا کا جیب کترا اور چور ہے اور دولتِ دل ہتھیانے اور چُرانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہے۔ ملائکہ اور شیاطین کی ایک پہچان یہ ہے کہ اوّل الذکر کی نظریں بڑی ہی معصوم و منوّر ہوتی ہیں اور ان سے جو نور نکلتا ہے وہ بڑا ہی تسکین دہ، حسین اور پیارا ہوتا ہے۔ فرشتوں کی آنکھوں میں اہلِ نظر کو حُسنِ الٰہی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی ہر نظر دل کو زندگی کا پیام دیتی اور روح کو سُرور انگیز ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ اس کے برعکس شیطان کی آنکھوں میں شیطنت ہوتی ہے، خوفناک اور دہشت انگیز۔ اس کی ہر نظر دل کے لیے موت کا پیام اور روح کے لیے مرگِ مسلسل ہوتی ہے۔ ابلیس یا شیطان کی آنکھوں میں شرارت ہوتی ہے جو معصوم دلوں پر بجلی بن کر گرتی ہے، لیکن سیاہ دلوں کو وہ بُری نہیں لگتی، کیونکہ وہ اس سے مانوس ہوتے ہیں۔

کڑی : ۱۴۱

آخری دن

طائف

دیارِ "دوست" سے رخصت سے پہلے ہم طائف دیکھنے گئے۔ راستے میں منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کی زیارت کی اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا کر طائف پہنچے، جو وہاں کا صحت افزا اور خنک مقام ہے۔ میری آنکھیں چودہ سو برس پہلے کا طائف ڈھونڈتی تھیں، لیکن وہاں نہ شہر پناہ تھی جو اس کی وجہ تسمیہ تھی اور نہ وہ قلعہ جس میں اہلِ طائف نے محصور ہو کر رسولِ اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لشکر کا مقابلہ کیا تھا۔ نہ وہ گلیاں تھیں نہ بازار اور نہ وہ نخلستان ہی تھا جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ظالموں کے ظلم و ستم سے بچ کر پناہ لی تھی۔ طائف اب جدید شہر بن چکا ہے۔ وہاں کوئی تاریخی مقام محفوظ نہیں اور نہ کسی کا نشان ہی باقی ہے۔ ہم طائف میں گھومتے پھرتے رہے، لیکن کوئی تاریخی آثار نہ ملے۔

ہم ایک ریستوران میں گئے، جو جدید فیشن کا تھا۔ یہاں چائے مطلوب تھی۔ ٹیلی ویژن پر بچوں کا پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ میں چودہ سو برس پہلے کے زمانے میں پہنچ چکا تھا۔ یہی طائف تھا جہاں پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تبلیغِ اسلام کے لیے تشریف لائے تھے، اور یہاں کے قوت و دولت کے نشے میں سرشار سرداروں نے آپ کی کوئی بات نہ سنی تھی، بلکہ اوباش لونڈوں کے ہاتھوں آپ کو اس قدر پٹوایا تھا کہ آپ لہولہان ہو گئے تھے۔ آپ پر سنگ ریزوں کی بوچھاڑ ہوتی، آپ نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے تو آپ کو پکڑ کر اٹھایا جاتا اور پھر سنگباری کی جاتی۔ یہی طائف تھا جس نے محبوبِ خدا اور

رحمۃ للعالمین ؐ کے ساتھ سخت ظالمانہ، سفاکانہ اور عبرت انگیز سلوک دیکھا تھا۔ اسی شہر میں جذب و شوق اور رحمت و محبت کی تذلیل و تحقیر کی گئی تھی، لہٰذا اس شہر میں کچھ کھانا مجھے گوارا نہ ہوا، اور ہم بھوکے پیاسے ہی وہاں سے لوٹ آئے۔

واپسی میں ہم نے پھر جبلِ رحمت اور مسجدِ نمرہ کی زیارت کی، جس میں حج کا خطبہ ہوتا ہے اور ظہر و عصر کی نمازیں اکٹھی اور قصر پڑھی جاتی ہیں۔ بعد ازاں مزدلفہ کی مسجد دیکھی اور پھر منیٰ میں شیطنت کے مجسموں یعنی جمروں کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا، ان پر لعنت بھیجی اور ہوٹل لوٹ آئے۔

طوافِ وداع

کل جمعرات تھی اور پروگرام کے مطابق ہمیں صبح مدینہ منورہ روانہ ہونا تھا، لہٰذا آج طوافِ وداع کرنا تھا۔ نمازِ عصر کے بعد ہم نے طوافِ وداع کرنا شروع کیا۔ بظاہر یہ ہمارا آخری طواف تھا۔ اس روز قلب و روح کی کچھ اور ہی حالت تھی، آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔ دل آہ و فغاں اور روح الحاح و زاری کر رہی تھی۔ کل سے فراق کا دَور شروع ہونے والا تھا۔ خدا معلوم ہم اپنے الٰہ و رب کا گھر دوبارہ دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ ہمیں اس کے طواف کی سعادت پھر نصیب ہو سکے گی یا نہیں؟ یہ خیال آتا تو چشم و قلب گریہ و زاری کرنے لگتے، ہچکی بندھ جاتی اور رُوح ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتی۔ مغرب کی نماز تک ہم طواف و فریاد اور آہ و زاری کرتے رہے۔

وہ بزرگ کون تھے اور خوشبو کس کی تھی؟

اذان سے تھوڑی دیر پہلے میں نے مطاف ہی میں نماز پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ایک جگہ دو درویش نما بزرگ بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان کچھ جگہ خالی تھی۔ میں ان کی اجازت سے وہاں بیٹھ گیا۔ ایک بزرگ کابل کے ایک مشہور قصبے ہجویر سے تشریف لائے تھے اور دُوسرے رُوسی ترکستان کے کسی علاقے سے۔ درویشِ ہجویری نے مجھے بظاہر

ایک میلی سی چادر دی کہ اسے مصلّٰی کے طور پر استعمال کروں۔ دونوں بزرگ اگرچہ سو سو سال سے اُوپر کے لگتے تھے مگر تندرست و توانا تھے اور خاک آلودہ دکھائی دیتے تھے۔ نماز شروع ہوئی اور جب میں سجدے میں گیا تو اس چادر سے ایک عجیب و غریب قسم کی خوشبو کی لپٹیں آئیں اور مشامِ جان کو معطّر و مسحور کر گئیں۔ ہر بار سجدے میں موجِ لُٹے مشکیں آتی رہی۔ وہ خوشبو بے مثل تھی، اتنی وجد آفرین و سُرور انگیز اور جاں فزا و رُوح پرور کہ اس پر باغِ فردوس کی خوشبو کا گمان ہوتا تھا۔ نماز ختم ہوئی تو اس خضر صورت بُزرگ نے مجھ سے چادر لے لی۔ میں سُنّت پڑھنے لگا تو وہ دونوں بزرگ اہلِ جذب و شوق کے ہجوم میں گُم ہو چکے تھے۔ وہ کون تھے؟ اور وہ خوشبو کس کی یا کہاں کی تھی؟ یہ سوال آج بھی میرا دل پُوچھتا رہتا ہے۔

شبِ وداع ہم عشاء تک وہاں رہے اور اپنے اللہ کے گھر کو دیکھتے رہے، جو بُقعہ نور بنا ہوا تھا۔ میں نور برستے صاف دیکھ رہا تھا۔

کتنی ٹھنڈک تھی اس نور میں، اور کتنی طمانیت و آسودگی اور لذّت و مسرّت تھی اس ٹھنڈک میں، میں بیان نہیں کر سکتا۔ عشّاق طواف میں مشغول تھے۔ جذب و محبّت اور عشق و جنون کے مناظر قلب و روح کے لیے سحر انگیز تھے۔ یہ رات یہاں ہماری آخری رات تھی۔ ہمیں اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود (اللہ) کے گھر کو چھوڑ کر جانا تھا۔ پھر کبھی آنا ہوگا یا نہیں؟ یہ خُدا ہی جانتا تھا۔ ہم فریاد کرتے، دُعا مانگتے اور توبہ و استغفار کرتے رہے۔ دفعتًا کسی نے چُپکے سے دل میں کہا: یہ کیا کم خوش نصیبی ہے کہ تم نے اپنے اللہ کا گھر دیکھ لیا۔ تمھیں اس کے طواف اور سعی کی سعادت حاصل ہو گئی، اور اب تمھیں روضۂ اطہر کی زیارت کی سعادت حاصل ہو گی؟ کیا تم اپنے اللہ و ربّ کا شکریہ ادا نہیں کرو گے؟ یہ بڑی ہی تسکین دہ اور بصیرت افروز آواز تھی۔ یہ تو فردوسِ گوش و رُوح تھی۔ میری زبان پر اس کی حمد و ثنا کے زمزمے جاری ہو گئے اور میں

اس کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔

سجدہ، موت اور شہادت

سجدے میں روح کو عجیب طرح کی آسودگی و طمانیت ملتی ہے۔ شاید اس حالت میں اسے اپنے اللہ کا قُرب حاصل ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ سجدہ اپنے اِلٰہ کے قُرب و حضور کا بہترین ذریعہ ہے۔ میں نے سجدے میں روضۂ اطہر کی زیارت کی اور اس منظرِ مقدّس کا نظّارہ کیا جس کا میں اپنے رویائے صادقہ میں مشاہدہ کر چکا تھا۔ رُوح کی دُعا تھی: کاش یہ مشاہدہ حقیقت بن جائے! ندا آئی "موت کے بعد"۔ موت اس اعتبار سے کیسی حسین شے ہے کہ وہ اہلِ جذب وشوق کو اپنے اِلٰہ سے ملاتی ہے، ہمیشہ کے لیے، اور خود ہمیشہ کے لیے فنا و معدوم ہو جاتی ہے۔ موت کی حسین ترین صُورت شہادت ہے۔ "دوست" کی راہ میں جان دے کر ہمیشہ کے لیے اس کے پاس چلے جانا۔ شہادت "دوست" کے قُرب و وصال کا بہترین ذریعہ ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ عُشّاق جو جان دے کر شہادت کا مقام حاصل کرتے اور ابد تک اپنے اِلٰہ کے قُرب و وصال کے مزے لُوٹتے رہتے ہیں۔

میں سجدے سے اُٹھا تو طواف جاری تھا۔ عُشّاق آہ و فغاں میں مشغول تھے۔ نُور برس رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں اور دُعا و مناجات کی صداؤں سے فضا معمور تھی، اور اللہ اس نظّارے کا یقیناً شاہد تھا۔ یہ نُور اس حریمِ ذات سے برس رہا تھا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ اصحابِ حُسن و سُرور جو جذب و مستی کے عالم میں وہاں ذکر و اذکار اور طواف و سعی میں مشغول رہتے ہیں! میں "دوست" کے گھر کو حسرت بھری نظروں کے ساتھ دیکھتا رہا، کیونکہ یہ رات حرم شریف میں آخری رات تھی۔ قرب و وصال کی آخری رات، جو شبِ وداع بھی ہو، کس قدر صبر آزما اور رُوح فرسا ہوتی ہے۔ اُس کی کیفیّت کا اندازہ وہ اہلِ عشق و وفا ہی کر سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ وقت کی

گردش رُک جائے، لیکن وقت کی گردش کہاں رکتی ہے؟ "دوست" ہر آن ایک نئی شان میں جو رہتا ہے۔ اس کی تخلیقی فعلیت کا سلسلہ کہاں رُکتا ہے؟ وقت کو گزرنا تھا اور وہ گزر گیا، اور ہمیں حُسن و نُور سے معمور دل اور افسردہ رُوح کے ساتھ ہوٹل واپس ہونا پڑا۔

ہم دونوں اداس اور خاموش تھے۔ غالباً بیگم کے بھی وہی احساسات و تاثرات تھے جو میرے تھے۔ ہمارے دل کی عجیب حالت تھی۔ ایک طرف "دوست" کے گھر اور شہر سے بچھڑنے کا ملال و صدمہ تھا، اور دوسری جانب اپنے ہادی و مسیحا اور "حبیبِ دوست"، صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شہر اور روضۂ مبارک میں جانے کی مسرّت تھی۔

"حریمِ دوست" میں آخری نمازِ تہجّد

صبح دو بجے ہم حرم شریف پہنچے تو اُسے کسی اور ہی کیفیّت میں پایا۔ شاید یہ ہمارے دلوں کی اپنی کیفیّت تھی۔ حُسن و نُور کا عالم بھی وہی تھا، ملائکہ کا عروج و نزول بھی وہی تھا، عُشّاق کے جذب و شوق میں بھی کوئی فرق نہ تھا، لیکن آج اس کی جمیل و جلیل اور نورانی فضا میں رنگِ ہجر و فراق کی کیفیّت تھی، جس سے حسرت و اُداسی کا احساس ہوتا تھا۔

ہم تہجّد کی نماز سے فارغ ہوئے تو طواف میں مشغول ہو گئے۔ ذوق و شوق میں اب حسرت بھی شامل ہو گئی تھی۔ رُوح کی بے قراری بڑھتی جاتی تھی۔ شاید اس کے لیے فراقِ دوست کا تصوّر ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ دل بدستور آہ و فغاں کرتا اور آنکھیں روتی رہیں۔ ہم حجرِ اسود کو بوسہ دیتے رہے اور غلافِ کعبہ سے لپٹ کر خوب روئے۔ اس عالم میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں دامنِ اِلٰہ کو پکڑے اس سے چمٹا ہُوں۔ یہ تصوّر ہی نہیں تھا، احساس بھی تھا۔ میں ہمیشہ کے لیے اس سے لپٹ کر رہ جانا چاہتا تھا۔ یہ کتنا سرور انگیز اور سحر انگیز احساس تھا، جس نے اب مشاہدہ کا روپ دھار لیا تھا۔ میں گویا اپنے اِلٰہ سے چمٹا ہوا تھا، غلافِ کعبہ سے خوشبوؤں کے جھونکے

مشامِ جان کو معطّر کر رہے تھے، روح احساسِ وصال سے وجد و حال میں تھی اور دل فرطِ طرب میں رقص کناں تھا کہ اچانک نمازِ فجر کی اذان نے چونکا دیا اور یہ کیفیت جاتی رہی۔

ہم نے نماز پڑھی، دُعا مانگی اور اپنے اِلٰہ و ربّ سے دوبارہ آنے کی استدعا کی، خانۂ کعبہ پر شوق و حسرت کی نگاہِ مکرّر ڈالی اور رُخصت مانگ کر ہوٹل لوٹ آئے۔ یہاں ناشتا کیا اور دیارِ "حبیبؐ" جانے کی تیاری کرنے لگے۔

کڑی : ۱۵

مدینۂ منوّرہ

دیارِ "دوست" سے دیارِ حبیبؐ کی طرف

آنا، جانا، ملنا اور مل کر بچھڑنا، زندگی کا خاصّہ بھی ہے اور مقدّر بھی۔ دیارِ "دوست" میں آنے سے پہلے ہمیں اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن جب "دوست" نے ہمیں اپنے پاس بلا لیا تو ہمارے دل کی کیفیّت ہی کچھ اور تھی۔ مسرت و شادمانی کا یہ عالم تھا کہ شادیٔ مرگ کا اندیشہ دامنگیر رہنے لگا۔ اب "دوست" کی مہمانی اور اس کے قرب و حضور اور دید و وصال کے دن پورے ہوئے اور جدائی کا وقت آیا تو "غمیٔ مرگ" کا کھٹکا لگ گیا۔ مکہ مکرمہ سے رُخصت ہونا میرے لیے ایسا تھا جیسے کوئی برسوں کا مہجور عاشق چند روز "دوست" کا مہمان رہ کر ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہا ہو۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے آخری بار "حریمِ دوست" کو ارمان بھری نظروں سے دیکھا، دل بھر آیا اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔

شہر سے نکلتے ہی ہماری موٹر ہوا میں اُڑنے لگی۔ ہمیں اس اثنا میں ایک عجیب تجربہ ہوا۔ دیارِ "دوست" سے نکلتے ہی دل کی کیفیّت بھی بدل گئی۔ اب حسرتِ دید کی جگہ شوقِ دید نے لے لی، اور ہمارے دل میں دیارِ حبیبؐ میں پہنچنے اور روضۂ اطہر پر حاضری دینے کی آرزو مچلنے لگی۔ میرے خواب کا پہلا حصّہ تو سچّا ثابت ہو چکا تھا۔ اب تمنّا تھی کہ اس کا دوسرا حصّہ بھی سچّا ثابت ہو جائے اور میں روضۂ اطہر پر حاضری دوں تو اپنے ہادی و مسیحا اور محسن و منعم سیّد المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو فردوسِ بریں میں اسی طرح

بزمِ احباب میں جلوہ افروز دیکھوں جس طرح خواب میں دیکھا تھا۔ آپؐ کا جلال اگر نظارہ سوز تھا تو جمال قرۃ العین۔ آپؐ کی بزمِ حُسن نور و رنگ کا ایک مقدّس سحر کدہ اور کیف و سُرور کا حیرت کدہ تھی۔ اگر آپؐ شمعِ محفل تھے تو آپؐ کا اِلٰہ میرِ مجلس تھا، اگرچہ وہ دُور اتنا تھا کہ حدِ نگاہ و خیال سے بھی ماوراء تھا، لیکن نزدیک بھی اتنا تھا کہ عشّاق و اِلٰہ کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہ تھا۔ مجھے یہ منظر دیکھنے کی آرزو تھی۔ جوں جوں سفر کٹتا اور منزل قریب آتی جاتی، بے قراری بڑھتی جاتی۔ موٹر برقِ نمط رفتار سے فراٹے بھرتی جا رہی تھی، لیکن بے قراریِ تمنّا کا یہ عالم تھا کہ اس پر سُست رفتاری کا گمان ہوتا تھا۔

ہم غارِ ثور پر پہنچے تو کچھ دیر کے لیے وہاں رُکے۔ میری نظریں کبھی پناہ گاہِ نبوّت و صدیقیّت کو دیکھتیں اور کبھی آپؐ کے سفرِ ہجرت کی رہ گزر کو ڈھونڈھتیں۔ دل کو کچھ مبہم سے اشارے ہوئے بھی، لیکن نہ دل کو اطمینان ہوا اور نہ دیدۂ شوق کی تسکین ہوئی۔ کاش سنگِ نشانِ رہ گزر ہوتے تو دیدۂ شوق کی تسکین اور نظرِ تحقیق کی رہنمائی ہوتی! میں تشنہ کامِ محبّت ایک موہوم اُمید کے ساتھ کبھی سلسلۂ کوہ کے دامن کو کبھی ساحلِ سمندر کو متجسّسانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا کہ شاید ربِّ جلیل کے اپنے مہاجر سیّد المرسلین صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے نقوشِ حُسن کی کوئی جھلک نظر آجائے، میرا اِذعان و اِیقان ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کے اپنے حسین و برگزیدہ بندوں کے نقوشِ ہستی بھی ان کی طرح لافانی و لازوال ہوتے ہیں۔

نظر کوہ و کمر اور بحر و بر کے نظّاروں کے دیکھنے میں اور فکرِ تاریخ کے واقعات پر غور و فکر کرنے میں منہمک تھی کہ موٹر ایک جگہ رُک گئی۔ یہ ایک ریستوراں اور سرائے تھی، جو مال و دولت سے معمور خزانوں، عالی شان نعمت کدوں، عشرت کدوں، محلّوں، بنگلوں، جدید ترین ہوٹلوں، ریستورانوں اور خرید و فروخت کے مرکزوں کے ملک میں

اس کی اہم ترین تاریخی شاہراہ پر واقع، مفلسی و کور ذوقی کی ایک عبرت ناک جلوہ گاہ تھی۔ یہ صحرانشینوں اور صحرانوردوں کی سرائے اور ریستوراں تھی، اور امیری و فقیری، شہنشاہیت و محکومی، قارونی و بے زری اور شہریت و بدویت کے تفاوت کی منہ بولتی تصویر۔ تاریخ کہتی ہے کہ ایسی جگہوں ہی سے انقلاب و بغاوت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یہ سرائے اور ریستوراں امارت و بادشاہت کی جبین پر ایک داغ تھا۔ ایسے داغ تاریخ کے جامِ تقدیر نما ہوتے ہیں۔ اس میں چند بھدی چارپائیاں، بدنما، بینچ اور ٹوٹی پھوٹی کرسیاں بکھری پڑی تھیں۔ یہاں قہوہ، چائے اور پیپسی کولا بکتا ہے۔ ہم نے ڈرائیور سمیت پیپسی کولا پیا، کچھ دیر سستائے اور سفرِ شوق پر روانہ ہو گئے۔ دل نے کہا: اگر اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے داعی و قائد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت نہ کرتے تو ہمیں اس سفرِ شوق کی سعادت کہاں نصیب ہوتی؟ یہ وہی وادیِ کوہ و بیاباں ہے جس نے آپؐ کو ہجرت کرتے بھی دیکھا تھا اور سپہ سالار و فاتح کی حیثیت سے آتے جاتے بھی دیکھا تھا۔ میں کوہ و دشت کے مناظر دیدۂ شوق سے دیکھتا جا رہا تھا کہ دفعتاً میری نظر دُور سے ایک سطح مرتفع پہ پڑی، جو شاہراہ کے بائیں جانب تھی۔ اس میں عمارتیں بھی دکھائی دیں۔ دل نے کہا کہ وہ پہلا سا ماحول اور نقشہ تو نہیں، لیکن ہو نہ ہو یہ کفر و اسلام کی پہلی رزم گاہ بدر ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی آہستہ کر دی اور کہا: یہ مقامِ بدر ہے۔

بدر، دُنیا کی اہم ترین تاریخی یادگار

بدر کا میدان، دُنیا کی اہم ترین تاریخی یادگار اور کفر و اسلام کی پہلی رزم گاہ

ہے۔ اس جنگ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر (خاکم بدہن) مسلمان شکست کھا جاتے تو اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ شمعِ توحید ہمیشہ کے لیے بجھ جاتی، اولادِ آدم اسلام کی رحمتِ عالمگیر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو کر کفر و شرک کے اندھیروں میں بھٹکتی رہتی، وقت کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے ظلم و استبداد کا شکار رہتی، غلامی و محکومی اور ذلّت و مسکنت اس کی قسمت کا لکھا بن جاتا، اور وہ اپنے اِلٰہ و ربّ سے دُور و مہجور رہ کر اطمینان کو ترستی اور خوف و حزن کی آتشِ خاموش میں جلتی رہتی۔ علاوہ بریں، اسلام کی فتح اگر حُسن و نُور، حق و صداقت، عدل و احسان، خیر و حسنہ، مظلومی و فقر، اخوت و مساوات اور آزادی و سلامتی کی فتحِ عظیم تھی، تو فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و نمرودیت، ظلم و استحصال، جبر و تشدّد، شرک و بُت پرستی، جرم و گناہ، قُبح و شر اور کفر و شیطنت کی شکستِ فاش تھی۔ اس جنگ کے نتائج نہایت دُور رس، عہد آفریں اور تاریخ ساز تھے۔ اس بنا پر یہ کہنا مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہے کہ جنگِ بدر کی اہمیت نہ صرف اسلام بلکہ عالمِ انسانی کے نقطۂ نظر سے بھی اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور پر اُسے دی جاتی ہے، رزم گاہِ بدر دُنیا کی اہم ترین تاریخی یادگار ہے، جس کی حفاظت اور مناسب دیکھ بھال حکومتِ سعودی عرب کی بالخصوص اور کُل عالمِ اسلام کی بالعموم از بس اہم ذمّے داری ہے، نیز ان کی توجّہ اس طرف مبذول کرانا، عالمِ اسلام کے ادیبوں، صحافیوں، خطیبوں، مصنفوں، سفارت کاروں اور سیاسی و دینی رہنماؤں کا ایک اہم مقدّس فریضہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بدر دُنیا کے ان میدانوں میں سے ایک ہے، جہاں تاریخ نے جنم لیا اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کیا۔ ایسے تمام تاریخ ساز میدانوں میں بدر کی حیثیت منفرد و ممتاز ہے کہ اس میں شرک و توحید، کفر و اسلام، جہل و علم، ظلم و انصاف اور

غلامی و آزادی کی فیصلہ کن جنگ ہوئی اور فتح حق کی ہوئی اور تحریکِ اسلام ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو گئی۔ یہ تحریکِ اسلام کی پہلی عسکری کامیابی تھی۔

ہم موٹر سے اُترے اور میدانِ بدر کا جائزہ لیا۔ یہ چودہ سو برس پہلے کا بدر نہ تھا۔ یہاں اُس نخلستان کے کوئی آثار نہ تھے، جس میں سے کفّار کا لشکر گزر کر اسلامی فوج پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس جگہ ایک قصبے کی تعمیر ہو رہی تھی۔ قریب قریب ہر منظر بدل چکا تھا۔ میں ان نظّاروں میں گم تھا کہ چشمِ تصوّر کے سامنے چودہ صدیاں پہلے کا بدر جلوہ نما ہو گیا۔ کُفر و اسلام کی جنگ شروع ہو گئی اور وہ پہاڑی بھی دکھائی دینے لگی، جہاں دُنیا کے عظیم ترین فاتح اور رحمۃ للعالمینؐ اسلامی لشکر کی قیادت کے لیے خیمہ زن تھے۔ دُو بدُو لڑائی کا آغاز ہوا، اور پھر زور کا رن پڑا۔ میں نے کُفّار کو ریت کے طوفان میں سراسیمہ اور خوف و ہراس سے تتّر بتّر ہوتے اور پھر بھاگتے دیکھا۔ میں نے مجاہدینِ بدر کو جشنِ مسرّت مناتے اور اللہ تعالیٰ کا شکریہ بجا لاتے دیکھا۔

مجاہدینِ بدر اپنے اِلٰہ و ربّ کی محبّت میں سرشار تھے۔ وہ اہلِ جذب و شوق تھے۔ انھیں اپنے اِلٰہ کی خاطر شہادت مطلوب تھی۔ شہادت ان کے لیے وصالِ اِلٰہ کا حسین ترین ذریعہ تھا۔ وہ شوقِ شہادت میں سرفروشانہ لڑے اور فتح یاب ہوئے۔ ان کی جنگ کا مقصد کفر و شرک کی شکست اور توحید و انصاف کا بول بالا تھا۔ وہ سچے تھے، سچ کی خاطر لڑ رہے تھے۔ کفّار جھوٹے تھے اور جھوٹ کے لیے حملہ آور ہوئے تھے۔ خُدا جانے میں کب تک ان نظّاروں کو دیکھتا رہا کہ بیگم کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اب ہمیں شہدائے بدر کے قبرستان کی زیارت کرنی چاہیے۔

شُہدائے بدر کا قبرستان یا اہلِ عشق و وفا کی جنّت

ہم جنّتِ اہلِ عشق و وفا کی زیارت کو نکلے تو نہ ہمارے ڈرائیور اور نہ کسی اور ہی کو راہ و منزل کا پتا تھا۔ زائرین کی رہنمائی کے لیے

یہاں بھی کوئی نشانِ راہ و منزل نہیں میدانِ بدر، جو دُنیا کی اس اہم ترین تاریخی یادگار ہے، اُسے محفوظ کرنے کے بجائے یہاں شہر آباد کیا جا رہا ہے اور عمارات بن رہی ہیں۔ نتیجۃً اس کے آثار تیزی سے ناپید ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبوب و برگزیدہ ہستیوں اور زندۂ جاوید شہیدوں کی آخری آرام گاہ کی دیکھ بھال کا کسی کو خیال نہیں۔ شہیدوں کی جنّت تک پہنچنے میں ہمیں خاصی دقّت ہوئی۔ ہم خاصی دیر تک اس نو آباد قصبے کی گلیوں اور سڑکوں میں گھومتے رہے۔ آخرکار ایک جگہ راج مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں پتا بتایا اور ہم منزلِ مقصود پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

بنی نوعِ انسان کی تقدیر بدلنے والے ان زندۂ جاوید شہیدوں اور فردوسِ بریں کے وارثوں کی اس آخری آرام گاہ کو دیکھا تو دل کو زبردست دھکا لگا۔ صدمہ اتنا شدید تھا کہ جگر خون اور آنکھیں خوں نابار ہو گئیں۔ نہ کوئی مزار تھا نہ قبر۔ البتّہ جا بجا سنگریزوں کے بے نام ڈھیر تھے۔

اِس جنّتِ اہلِ عشق و وفا کی دیواریں بوسیدہ و خستہ حال ہیں اور مدّتوں سے سفیدی یا رنگ و روغن کی مرہونِ منّت نہیں ہیں۔ سبزہ و گُل تو کہاں ہوتے، کوئی نخل یا شجرِ مغیلاں تک نہ تھا۔ مدّتوں پرانا ایک چھوٹا سا میلا کچیلا دروازہ تھا، جو مقفّل تھا، تاکہ زائرین اندر نہ جا سکیں۔ جنّتِ شہداء کو ممنوعہ علاقہ بنانے میں کوئی تُک نظر نہ آئی۔ ہم نے اس دروازے کے قریب ایک اونچی سی جگہ پر کھڑے ہو کر شہیدوں کو سلام کیا اور فاتحہ پڑھی۔

جب دُعا مانگنے لگے تو مجھ پر رقّت طاری ہو گئی اور حالت غیر ہو گئی۔ اسی عالم میں کسی نے چُپکے سے میرے دل سے کہا: "جان دینا، بے شک انسان کے لیے بہت بڑی چیز ہے، لیکن جنّت کی حیاتِ ابدی کے عوض "دوست" کی راہ میں جان دینا، بڑا ہی سستا سودا ہے۔ جانتے ہو، شہادت کیا ہے؟ اپنے اِلٰہ کی خاطر دُنیا کی زندگی کو جو حیاتِ بہر

کا ایک لمحہ ہے، قربان کرکے اس کے عوض اس کا ہمیشہ کے مہمان بن جانا۔ ربِّ جمیل وکریم کے مہمان ہونے کا مطلب جانتے ہو کیا ہے؟ اس کی حقیقت تو وہی جانتا ہے، البتہ اپنی زبان میں اس کا مطلب ہے: اُس کے دوستوں کی رفاقت وصحبت کا لُطفِ مدام، جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامانِ بے مثال، فردوسِ بریں اور اس کی بے قیاس ولامتناہی نعمتیں، حیاتِ جاوداں، شبابِ سرمدی، نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ لذّتوں، مسرّتوں اور خواہشوں کی تکمیل کا غیر مختتم سلسلہ، اور سب سے بڑھ کر دیدِ جمالِ "دوست"۔ اس سے ارزاں اور کیا سودا ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ انسان کا ظلم وجہل ہے کہ وہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ اہلِ بدر اس حقیقت سے آشنا تھے۔ انھوں نے "دوست" کی راہ میں جان دینے سے دریغ نہ کیا۔ کچھ شہید ہوئے اور باقی غازی بن کر اسلام کی تحریکِ رحمۃً للعالمینی چلانے کے لیے زندہ رہے، لیکن "دوست" کی مہمانی دونوں کے حصّے میں آئی۔ اہلِ جذب وشوق کا صلہ جنّت ہی ہوا کرتا ہے۔"

اس آواز میں جانے کیا تاثیر تھی کہ دل میں شہادت کی تمنّا مچلنے لگی۔ دل نے کہا: کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں اہلِ عشق ووفا جو "دوست" کے اشارے پر سربکف میدانِ جہاد میں نکلتے اور رحیقِ شہادت کا جام پی کر میخانۂ "دوست" کے رندانِ ابدی بن جاتے ہیں۔ ناگہاں میرے دل میں بہشتِ شہیداں کے اندر جانے کی زبردست خواہش پیدا ہوئی۔ میں ایک جگہ سے دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا۔ اندر کی فضا کچھ اور ہی تھی۔ ایسا محسوس ہوا کہ ایک عجیب سی دُنیا میں آ گیا ہوں۔ بادِ صحرائی یہاں نسیمِ سحر کی طرح خنک وجانفزا اور شمیمِ گلستاں کی طرح عطر بیز تھی۔ ایک بڑی ہی لذّت انگیز ٹھنڈک نے روح کو متکیف کر دیا۔ میں ایک طرف جا رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ سنگریزوں میں سب سے عجیب وغریب سُرخ وچمک دار مٹّی دکھائی دی۔ بے اختیار اس کی طرف بڑھا، اُٹھایا تو اس کی مہک سے مشامِ جاں معطّر اور روح مسحور ہو گئی۔ اس کا نظارہ آنکھوں کی

ٹھنڈک تھا، جس نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اتنے میں کسی نے دل سے کہا: یہ بدر کے شہیدوں کے خون سے رنگین مٹی ہے، اس لیے عنبر فشاں ہے۔ "دوست" کی نظر میں یہ لعل و گوہر سے کہیں زیادہ گراں بہا و محبوب اور اس کی خوشبو شمیم فردوس سے کہیں زیادہ عزیز تر ہے۔ شہید کا ہر قطرۂ خوں فردوس کا لعلِ بے بہا ہوتا ہے۔ یہ راز "اس" کے خاص دوست ہی جانتے ہیں، جو کُشتگانِ خنجرِ تسلیم اور قتیلِ نظرِ "دوست" ہوتے ہیں۔ یہ مٹی اس سرزمینِ مقدّس کی امانت ہے، اسے یہیں رہنے دو کہ اسے باہر لے جانے کی اجازت نہیں۔

میں نے اس پُراسرار آواز کے مطابق خاکِ نعلین و عنبریں کو وہیں ڈال دیا، اور باغیچۂ فردوس کی سیر کرنے لگا۔ میرے گوشِ حق نیوش اور دیدۂ عبرت نگاہ وا تھے۔ مجھے خاموش فضا میں حمد و ثنا اور درود و سلام کی بے صوت صدائیں سنائی دینے لگیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس باغیچۂ فردوس میں نور کی برسات ہو رہی ہے اور زمین سے نورِ نعلین کی شعاعیں اٹھ رہی ہیں۔ وہ نور و رنگ کا مقدس طلسم کدہ بن گیا۔ مسحور کن خوشبوؤں کی موجوں اور حیرت انگیز رنگین و نورانی نظاروں سے معمور فضائے فردوسی میں روح پر وجد و حال اور کیف و مستی کی حالت طاری ہو گئی۔ میں نے اس عالمِ جذب و مستی میں غیر مرئی سے سائے بھی دیکھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مقدّس سرزمین، جو عظیم و جلیل القدر شہیدوں کے وجود و خون کی امین ہے، انسانوں ہی کی نہیں، جنّ و ملائکہ کی بھی زیارت گاہ ہے۔ یہ ربِّ جلیل کی نظرِ کرم کی آماجگاہ بھی ہے۔ یہاں کی خاک مشک و عنبر اور یہاں کے سنگریزے لعل و گوہر سے افضل و گراں قدر ہیں۔ آنکھیں ٹھنڈی بھی تھیں اور پُرنم بھی، اور لبوں پر دُعائیں جاری تھیں۔ معاً مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہو کہ یہ قبولیتِ دُعا کا وقت ہے، یہ دُعا مانگو: "میرے اِلٰہ و ربّ! تجھے تیری رحمتِ بے پایاں کا واسطہ، اپنے ان شہیدوں کے صدقے میرا حشر بھی ان کے ساتھ کرنا۔" میں بے اختیار یہ دعا مانگنے لگا۔ یہ راز، راز ہی رہا کہ وہ کس کی آواز تھی جو "آمین" کہنے میں دل کی ہمنوا ہو گئی۔ اس

کے ساتھ ہی دل میں برقِ حُسن و سُرور لہرائی اور سرمست بنا گئی۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو واپسی کا خیال آیا۔ اس باغیچۂ فردوس سے باہر نکلا تو دُنیا کچھ اور ہی تھی، اور بیگم صاحبہ بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ انھیں میرے حال کی کیا خبر تھی؟ اہلِ حال کی کسے خبر ہوتی ہے؟ ہمدم و ہم نشین کو بھی ان کے مشاہدات و واردات کا علم نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُن کی دُنیا اور، اور اِن کی دُنیا اور ہوتی ہے۔

شبِ قدر کا مُشاہدہ

اس ضمن میں مجھے لیلۃُ القدر کے مشاہدے کا واقعہ یاد آ گیا۔ کئی برسوں کی بات ہے، رمضان المبارک کا مہینا اور تہجّد کا وقت تھا۔ میں اور بیگم ایک چھوٹے سے کمرے میں ساتھ ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے دوسری بار سلام کے لیے رُخ موڑا ہی تھا کہ ناگہاں کمرہ انوار و تجلّیات سے منوّر ہو گیا۔ یہ نظّارہ جس قدر حسین و نظّارہ سوز اور حیرت انگیز و مسحور کُن تھا، اُسی قدر بصیرت افروز و روح پرور بھی تھا۔ میں نے اپنی شریکِ حیات و ہم جلیس کو شبِ قدر کا یہ نظّارہ دکھانے کی خاطر چلّا چلّا کر کہا "لیلۃ القدر۔ لیلۃ القدر!" لیکن انھوں نے نہ میری آواز سُنی اور نہ وہ نظّارہ ہی دیکھا۔

بدر سے دیارِ حبیبؐ کی طرف

ہم نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے آخری بار تاریخ کی اہم ترین یادگار، میدانِ بدر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ نگاہِ واپسیں کے وقت اس پہاڑی پر جہاں امیرِ لشکر پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا عسکری مقام تھا، ایک برقِ حُسن لہرائی اور قلب و نظر کو شہید کر گئی۔ دل سے کسی نے کہا: "قتیلِ "دوست" بھی شہید ہوتا ہے، لیکن یہ راز دانائے راز ہی جانتے ہیں۔"

ہم اس تاریخ ساز مقامِ فتحِ اسلام سے باہر نکلے اور شاہراہ پر آئے تو ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار اتنی تیز کر دی کہ وہ ہوا میں اُڑنے لگی۔ لیکن شوقِ دید کا تقاضا تھا

کہ ہم آناً فاناً اپنے ہادی و مسیحاؐ کے شہرِ مقدّس میں پہنچ جائیں، جو آپؐ کے نقوشِ حُسن و عشق کی جلوہ گاہ ہے اور جہاں آپؐ کا روضۂ اطہر ہے، اور روضۂ اطہر آپؐ کے پیکرِ حُسن و نُور کا امین ہے۔ شریعت یہی کہتی ہے اور درست کہتی ہے، لیکن اہلِ دید و نظر کا مشاہدہ یہ ہے کہ آپؐ کا روضۂ اطہر دیکھنے میں بلاشبہ ایسا ہی ہے، لیکن حقیقت میں وہ روضۂ فردوسِ بریں ہے، جو آپؐ کا حُسن المآب ہے، جہاں آپؐ اپنے اِلٰہ و ربّ کے ساتھ اپنے احبابِ خاص کی معیّت و صحبت میں ایسی حسین و مسرور حیاتِ ابدی گزار رہے ہیں، جس کا جنّ و اِنس تصوّر تک نہیں کر سکتے۔

گاڑی اگرچہ برق رفتار تھی، لیکن شوق کو اس کی سُست رفتاری کی شکایت تھی۔ اللہ اللہ کر کے ہم مدینۂ منوّرہ کی حدود میں داخل ہوئے تو دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہو گئیں، اور آتشِ شوق شعلہ زن ہو گئی۔ دل کی بے قراری بڑھی تو منتظر قلب و نگاہ کے لیے فاصلہ کم ہونے کے بجائے طویل ہونے لگا۔ دل کے لیے ایک ایک لمحہ اس قدر طولانی ہو گیا کہ پہلے صبر آزما پھر شکیب رُبا ہو گیا۔ انتظار اور جذب و شوق دل کے لیے قیامت ہوتا ہے۔

بار بار نظر گھڑی پر پڑتی تھی، بار بار ڈرائیور سے پوچھتے تھے: "دیارِ حبیبؐ کتنی دور ہے؟" بے تابی و بے قراری سے نہ تو رفتارِ زمانہ میں کمی و بیشی ہوتی ہے اور نہ منزلِ مقصود وقت سے پہلے آتی ہے۔ اِدھر فاصلہ کم ہوتا گیا اُدھر جذب و شوق شدّت اختیار کرتا گیا۔ روح الگ تڑپ رہی تھی، اس کی بے قراری عجیب تھی۔ انتظار کے لمحات یوں تو بڑے اذیّت ناک ہوتے ہیں، لیکن اس انتظارِ محبّت کی اذیّتوں میں کیف و سرور کی ٹھنڈک بھی تھی۔ اب ہم مدینۂ منوّرہ کے مضافات میں داخل ہو چکے تھے۔ شوقِ دید کی شدّت انتہا کو پہنچ گئی۔ دیدۂ شوق کو وا کیے، دھڑکتے دلوں کے ساتھ ہم سبز گنبد کو دیکھنے کی طلب و جستجو کرنے لگے۔ کبھی دائیں دیکھتے، کبھی

بائیں اور کبھی سامنے۔

گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی کہ دفعتاً میری نظرِ شوق گنبدِ خضراء پر پڑی۔ وفورِ مسرت سے چیخ نکل گئی۔ بیگم نے بھی گنبدِ خضراء کو دیکھ لیا تھا۔ میری طرح اُن کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں اور ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھے ہوئے تھے۔ رُوح پر جذب و شوق کی کیفیّت طاری ہو گئی۔ دل آہ و فغاں کرنے لگا۔ لبوں پر دعائیں تھیں اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ جلال کا وہ عالم تھا کہ دل کو اس کی تاب لانی مشکل تھی۔ ہم اسی عالمِ کیف و مستی اور آہ و فغاں کی حالت میں تھے کہ گاڑی حرم شریف کے سامنے فندق الحرم کے دروازے پر آ کر رُکی، جو مسجدِ نبویؐ کے بالمقابل مغرب کی طرف جدید قسم کا عالی شان ہوٹل ہے۔

مدینۂ منوّرہ یا دیارِ حُسن و رحمت

اب ہم اپنے پیارے نبیؐ، ہادی اور مسیحا علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے دیارِ حُسن و رحمت میں تھے، جہاں آپؐ نے اسلامی معاشرے اور مملکت کی بنیاد رکھی تھی۔ یہی وہ خوش نصیب شہر تھا، جس میں رہ کر آپؐ نے سارے جزیرۃُ العرب کو فتح اور اس کے باشندوں کے دلوں کو مسخر کیا تھا، اور اس کے ایک ایک گوشے کو آفتابِ توحید کی روشنی سے منوّر کیا تھا۔ یہاں ہی بیٹھ کر آپؐ نے عرب کے متحارب و مخالف قبائل کو متحد کر کے انھیں ایک ناقابلِ تسخیر قوم بنا دیا تھا۔ اس متبرّک شہر ہی میں آپؐ نے اللّٰہ کے بندوں کو ان کے اِلٰہ و ربّ سے ملایا تھا، ان کو ظلم و استحصال اور جبر و غلامی سے نجات دلائی تھی، اور حُسن و طہارت، عدل و احسان، حق و صداقت اور مساوات و اخوّت سے آشنا کیا تھا۔ ہم ان خیالات کے ہجوم میں ہوٹل میں داخل ہوئے اور سامان اپنے کمرے میں رکھا، پھر دوپہر کا کھانا کھایا، اور وضو کر کے مسجد نبویؐ میں جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ اذان کی ایمان افروز آواز سے فضا معمور ہو گئی۔ یہ آواز اس قدر رقّت انگیز اور پُرسوز تھی کہ جسم و جاں پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ہم جذب و شوق سے معمور چشم و قلب کے ساتھ مسجدِ نبویؐ میں پہنچ گئے۔

کڑی : ۱۶

مسجدِ نبوی ؐ میں

مسجدِ نبوی ؐ میں داخل ہوتے ہی قلب و نگاہ کی حالت بدل گئی۔ روضۂ اطہر پر نظر پڑی تو مدتوں کی مشتاق آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ دل پہ ہیبت طاری ہو گئی۔ درود و سلام پڑھتے ہم مسجد کے اندر داخل ہوئے تو حُسنِ اتفاق سے مجھے ریاض الجنہ کے ایک گوشے میں جگہ مل گئی۔ نماز پڑھی اور روضۂ اطہر کے سامنے حاضر ہو گئے۔ میرا دل جلالتِ نبوت کی تاب نہ لا سکا، قلب و جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ روح الحاح و زاری اور دل آہ و فغان کرنے لگا۔ سلام پڑھتے ہوئے میں بے ساختہ اُونچی آواز میں رونے لگا۔ وہاں قریب قریب سب، حاضرین ہی آہ و زاری کر رہے تھے۔ کسی کو کسی کا دھیان نہ تھا۔ جذب و مستی کی ایک کیفیت تھی جو قریب قریب سب اہلِ جذب و شوق پر طاری تھی۔ میری ہچکی بندھ چکی تھی اور میں زور زور سے رو رہا تھا۔ سلام پڑھنے کے بعد میں نے پہلے حضرت ابو بکر صدیق اور پھر حضرت عُمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مزاروں پہ حاضری دی اور سلام پڑھا۔

میں روضۂ مبارک کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جالیوں کے سوراخوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا تو غلافِ مزار کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ یہ میرے پیارے نبی اور مسیحا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا روضۂ اطہر تھا۔ دل نے چاہا کہ اس سے لپٹ جاؤں، جی بھر کر روؤں اور فریاد کروں۔ لیکن یہ پیغمبرِ اعظم و آخر اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا روضہ مبارک تھا۔ یہاں ادب و احترام شرطِ اوّلین تھی۔ فرطِ عقیدت و محبت

میں شرک کے ارتکاب کا بھی خطرہ تھا۔ شرک نہ خدا، اور نہ محبوبِ خدا کو منظور رہے۔ دل و فورِ جذباتِ محبّت و عقیدت سے اپنے ہادی و مسیحا کی قدم بوسی کے لیے سجدہ ریز ہونے کے لیے مچلنے لگا۔ یہ بڑا اخطرناک مرحلہ تھا۔ یہ زندگی کا بڑا ہی کٹھن اور صبر آزما امتحان تھا۔ مجھے ایک نامعلوم خوف نے لرزہ براندام کردیا اور دل ڈوبنے لگا۔ وہاں کھڑے ہونے کی مجھ میں سکت نہ رہی، میں ہجومِ عشّاق میں سے نکل کر روضۂ اطہر کے پہلو میں ریاض الجنّۃ کے ایک گوشے میں آکر بیٹھ گیا۔ اور دیوانہ وار اُسے دیکھتا رہا۔ قلب و چشم روتے رہے اور زبان پر درود شریف جاری رہا۔

ایک خواب، ایک مشاہدہ

تقریبًا چار سال پہلے جب میں رویائے صادقہ میں یہاں حاضر ہوا تھا تو مسجد مبارک کی ہیئت اور تھی۔ وہ چودہ سو برس پہلے کی مسجد تھی۔ روضۂ اطہر کی عمارت بھی اور تھی، وہ نقشہ بالکل مختلف تھا۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ روضۂ اطہر روضۂ جنّت تھا، جہاں حضورِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ آپؐ کے حُسن و نُور سے محفل منوّر و نظر افروز تھی۔ وہ نورانی فضا ملکوتی تھی، اس میں روح پرور ٹھنڈک تھی۔ میں حضورِ رسالت مآبؐ کی اُسی بزم کو دیکھنے کا آرزومند تھا۔ یہ آرزو شدّت اختیار کرگئی اور دل بے قرار ہوگیا۔ میں تڑپ کر اُٹھا اور پھر روضۂ اطہر کے سامنے حاضر ہوگیا۔ نگاہ مزارِ مبارک کے نظّارے کی حریف ہو سکی تھی، نہ ہوئی۔ ہیبت و جلالِ رسالتؐ سے کپکپی طاری ہوگئی، ٹانگیں لرزنے لگیں اور دل جلالتِ پیغمبریؐ کی تاب نہ لاسکا۔ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لیے پَر تولنے لگی۔ درِ جانان کے سامنے جان دینا کتنی بڑی خوش قسمتی تھی۔ محبّت کی دنیا کی یہ شہادت تھی جو صرف اہلِ مہر و وفا ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ جان دینے کو دل تو چاہتا تھا لیکن وہاں کھڑا رہنے کی تاب و تواں نہ تھی، مجھے مجبورًا اور بادل ناخواستہ وہاں سے لوٹ کر ریاض الجنّۃ میں آنا پڑا۔ مغرب کی نماز تک وہیں بیٹھا، درود و شریف پڑھتا اور روضۂ اطہر کو دیکھتا رہا۔

میرا مشاہدہ ہے کہ ریاض الجنّۃ واقعی جنّت کا ایک گوشہ ہے میں نے یہاں اپنے آقا و مسیحا سیّد المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو احباب کے ساتھ جلوہ فگن دیکھا تھا۔ میں اس حسین و مسحور انگیز نظارے کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ مجھے پھر اس نظارے کو دیکھنے کی طلب و آرزو تھی۔ میں دُعا مانگتا رہا اور روضۂ اطہر کو ٹکٹکی لگائے تکتا رہا، لیکن ایک بار دیکھا دوسری بار دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔

دل جلالتِ پیغمبریؐ کا حریف نہ ہوسکا

مغرب کا وقت ہوتے ہی مسجدِ نبویؐ بُقعۂ نور بن گئی اور راہِلِ جذب و شوق سے کھچا کھچ بھر گئی۔ ہر اہلِ شوق کی کوشش یہ تھی کہ اسے ریاض الجنّۃ میں جگہ ملے اور وہ ثوابِ بے حساب حاصل کرے، لہٰذا وہاں تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ مغفرت و رحمت کے طلب گار نمازِ مغرب کے انتظار میں تھے۔ عُشّاق مسلسل روضۂ اطہر پر حاضری دے رہے تھے۔ میں نے بھی کئی بار حاضری دینے کی کوشش کی مگر دل اس قدر جلالِ نبویؐ سے مرعوب تھا کہ اسے ایسا کرنے کی جسارت نہ ہوئی۔ روضۂ اطہر اس قدر جلالت مآب ہے کہ یہاں قلب و رُوح پر خوف طاری رہتا ہے۔ محبت اور خوف لازم و ملزوم ہیں۔

پہلے مغرب پھر عشاء کی نماز با جماعت پڑھنے سے وہ کیف و سُرور حاصل ہوا جو حرمِ کعبہ میں نماز پڑھنے کے سوا کہیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ حرمِ کعبہ میں صرف اِلٰہ و ربّ تھا، لیکن مسجدِ نبویؐ میں اِلٰہ کے ساتھ اس کے حبیبؐ بھی تھے۔ یہاں شرابِ محبت دو آتشہ تھی، اور اس کا کیف و سُرور بھی دُگنا تھا۔ یہاں حُسنِ الٰہی کے ساتھ حُسنِ رسالت مآبؐ کے جلوے بھی تھے۔ یہاں خدا کا گھر بھی تھا جو جنّتِ نگاہ تھا اور اس کے حبیبؐ کا گھر بھی تھا جو فردوسِ نظر تھا۔ نگاہیں دونوں پر فدا ہو رہی تھیں اور دل دونوں کی محبت میں آہ و فغان کر رہا تھا۔

اندھیرے میں روشنی

روضۂ اطہر کے اندر روشنی کا کوئی انتظام نہیں۔ کیوں؟ کئی زائرین نے مجھ سے شکایتاً یہ سوال پُوچھا۔ میرے

پاس اس کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ شاید اس میں کوئی مصلحت ہو، جسے اربابِ حل و عقد ہی جانتے ہوں۔ ایک دن میں مشہور و مقدس اصحابِ صفّہ کے چبوترے پر بیٹھا روضۂ اطہر کے اندر ٹکٹکی لگائے جھانک رہا تھا کہ اچانک ایسا دکھائی دیا جیسے اندر ایک عجیب قسم کی نظر افروز و روح پرور روشنی ہے۔ یہ روشنی کس کی تھی؟ دل سے کسی نے کہا: یہ روشنی اس پیکرِ حسن و نور کی ہے، جن کا یہ روضۂ اطہر ہے۔ روضۂ اطہر کو مصنوعی روشنی کی حاجت نہیں کیونکہ یہ تو باغِ فردوس کا ایک قطعہ ہے، جس میں آپؐ اپنے دوستوں کے ساتھ حسن و سرور کی ابدی زندگی گذار رہے ہیں۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ان اہلِ جنّت کی روشنی ہی سے یہ روضۂ جنّت روشن رہتا ہے، لیکن عام نظریں اس روشنی کا نظارہ نہیں کر سکتیں۔ نمازِ عشاء کے بعد ہم ہوٹل لوٹ آئے۔ چونکہ میں رات کا کھانا نہیں کھایا کرتا، اس لیے بیگم نے تنہا کھانا کھایا، اور ہم سونے کی تیاری کرنے لگے۔

میرے پلنگ کے ساتھ کھڑکی تھی، جو ابھی تک بند تھی۔ ہم نے اُسے کھولا تو فرطِ حیرت و مسرت سے ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہمارے سامنے ہمارا منظورِ نظر گنبدِ خضراء تھا اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے سبز رنگ کے اور بھی گنبد تھے، سب رات کی تاریکی میں روشن اور جگمگ کر رہے تھے۔ ہم بہت دیر تک اس نورانی و نظر افروز نظارے سے کیف و سرور حاصل کرتے رہے۔ صبح تہجد کے لیے اُٹھنا تھا اور پھر سفر کی تکان بھی تھی، لہٰذا نیند سے مغلوب ہو گئے۔

حرمِ نبوی میں پہلی نمازِ تہجد

صبح دو بجے فون کی گھنٹی بجی اور ساتھ ہی آواز آئی کہ جنابِ عالی، تہجد کی اذان ہو رہی ہے۔ ہم نے جلدی سے وضو کیا اور چند لمحوں بعد حرمِ پاک میں حاضر تھے۔

اہلِ جذب و شوق کی یہ آرزو اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ ریاض الجنّۃ میں جگہ حاصل کر سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق وہ اس حصّے کو قطعۂ جنّت سمجھتے ہیں، جہاں

نماز پڑھنے اور عبادت کرنے کا اجر بے حساب ملتا ہے۔ وہاں سجدہ کرنے سے ایک خاص قسم کی کیفیتِ جذب و مستی طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے وہاں ایک عجیب تجربہ ہوا۔ جب میں سربسجود ہوا تو وجد آفریں و روح پرور خوشبو نے مشامِ جان کو معطّر کر دیا۔ وہ خوشبو ان خوشبوؤں سے مختلف تھی جو اس دُنیا میں پائی جاتی ہیں۔ وہ واقعی گُلہائے فردوس کی خوشبو تھی۔ روح مسحور و متکیف ہو گئی اور دل سجدے ہی میں پڑے رہنے کے لیے مچلتا رہا۔ ہر بار سجدے میں یہی خوشبو آتی اور کیف و سُرور دیتی رہی۔ میں نے روضۂ اطہر کے سامنے حاضر ہونے کی کوشش کی، روح حاضری کے لیے بے تاب و بے قرار تھی، دل حضوری کا طلب گار تھا، لیکن میں وہاں حاضر ہوا تو مجھ پر پھر ہیبت طاری ہو گئی۔ دل جلالتِ پیغمبریؐ کا حریف نہ ہو سکا۔ میری چشمِ تصوّر کے سامنے وہ منظر اُبھر آیا، جس کا مجھے مشاہدہ ہو چکا تھا۔ میرے سامنے حضورِ پُرنور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اپنے اصحابؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ حضورِ رسالت مآبؐ کی بزمِ تجلّیاتِ ربّانی اور آپؐ کے جمالِ دلفروز کی نُور پاشیوں سے منوّر تھی۔ روشنی اس قدر حسین و مطہر، سُرور انگیز و کیف پرور اور ایمان افروز و مسحور کُن تھی کہ اس کا اظہار محال ہے۔ یہ نظارہ جتنا جمیل و سُرور انگیز تھا، اس سے بڑھ کر جلیل و مرعوب کُن تھا۔ دِل کو تابِ نظّارہ کہاں تھی، جسم و روح پر لرزہ طاری ہو گیا، آپؐ کی ہیبت و جلالت سے مجھ میں وہاں ٹھہرنے کی سکت نہ رہی اور مجھے مجبوراً اپنی جگہ لوٹ آنا پڑا۔ روضۂ اطہر اب میرے پہلو میں تھا۔ میں پُرنم آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتا رہا، کبھی ظاہری آنکھ سے مزارِ مبارک کے غلاف کو اور کبھی چشمِ تصوّر سے روضۂ اطہر کے اندر فردوسِ بریں میں آپؐ کی بزمِ حُسن و سُرور کے مناظرِ ہوشربا سے میری یہ حالت تھی کہ ؎

گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں　(بالِ جبریلؑ)

نمازِ فجر

میں ان وجد آفریں نظاروں میں محو تھا کہ نمازِ فجر کی اذان ہونے لگی۔ تمام فضا مؤذن کی کیف پرور آواز سے گونج اُٹھی۔ اللہ اکبر کی صدا سے

رُوح پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اذان نے ایسا سوز و ساز بخشا کہ قلب و رُوح زندہ و بیدار اور کیف و سُرور سے معمور ہو گئے۔ سُنّتیں پڑھیں اور فرض پڑھنے کے لیے اہلِ جذب و شوق کھڑے ہو گئے۔ تکبیر کے بعد امام صاحب نے تلاوتِ قرآن مجید شروع کی تو ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی اور عالم میں پہنچ گیا ہوں، جہاں ہمارا اِلٰہ و ربّ شاہد بھی ہے اور مشہود بھی۔ حرم شریف میں ملائکہ اور بزرگ ہستیوں کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا رہا۔ جب ہم سربسجود ہوئے تو فردوسی خوشبو نے پھر مشامِ جان کو معطّر اور رُوح کو مسحور کر دیا۔ موجۂ خوشبو میں وجد آفرین و سحر انگیز تاثیرِ حُسن تھی۔ دوسری بار پھر اسی خوشبو نے مشامِ جاں کا استقبال کیا۔

ایک حیرت انگیز منظر

نماز کے اختتام پر جب بائیں جانب سلام کے لیے منھ پھیرا اور میری نظر روضۂ اطہر پر پڑی تو اس میں ملکوتی روشنی اور غیر مرئی ہستیوں کی پرچھائیاں سی دکھائی دیں۔ یہ بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن واقعیّت کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ نماز اختتام پذیر ہوئی تو میں نے اپنے دائیں بائیں دو پُراسرار بزرگوں کو دیکھا جو بہت معمّر دکھائی دینے کے باوجود تندرست و توانا نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں روشن اور چہرے نُورانی تھے۔ انھوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا۔ آنکھوں نے آپس میں کچھ کہا اور دل کو مسرّت و عقیدت کا ایک عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بزرگ جو بھی تھے، یقیناً اہلِ حُسن و سُرور میں سے تھے۔ جب تک ہم مدینۂ منوّرہ میں رہے، مجھے حرمِ نبویؐ میں ایسے ہی پُراسرار بزرگوں کی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔

اصحابِ صُفّہؓ کا چبوترہ یا اِسلام کی پہلی یُونیورسٹی

آج جمعۃ المبارک کا روزِ سعید تھا۔ ہم وقت سے بہت پہلے حرمِ نبویؐ میں پہنچے لیکن مجھے ریاض الجنّۃ میں جگہ نہ مل سکی۔ معلوم ہوا کہ اہلِ

جذب و شوق صبح ہی سے وہاں بیٹھے یادِ الٰہی اور درُود و سلام میں مشغول ہیں۔ بڑی مشکل سے اصحابِ صفہؓ کے چبوترے پر جگہ ملی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اصحابِ صفہؓ علم و حکمت حاصل کرتے تھے۔ یہ گویا اسلام کی پہلی یونیورسٹی تھی، جہاں سے علم و حکمت کا آفتاب طلوع ہوا، اور اس نے ایک عالم کو روشن کر دیا تھا۔ یہ اسلام کے اوّلین طالب علموں اور علمائے کے درس و تدریس کا مُتبرّک مقام تھا۔ یہ علم و حکمت کے سرچشمے کا مقام تھا۔ اس احساس سے کہ مجھے یہاں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، رُوح پر وجد کی سی کیفیّت طاری ہو گئی۔ دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی اصحابِ صفہؓ میں سے ہوتا! کاش مجھے بھی معلّمِ انسانیّت علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی غلامی و شاگردی کی سعادت نصیب ہوتی! بہرحال اس احساس سے کہ میں اصحابِ صفہؓ کے مقام پر حاضر ہوں، میرا دل جذباتِ تشکّر و ممنونیّت سے معمور ہو گیا اور سجدے میں گر گیا۔ وہ مقام بھی معطّر تھا۔ روح مسحور ہو گئی۔ سجدے سے سر اُٹھایا تو میری نظر روضۂ اطہر پر پڑی۔ دیکھتے دیکھتے منظر بدل گیا۔ چشمِ قلب نے کیا دیکھا اور گوشِ قلب نے کیا سُنا؟ وہ سرّ الاسرار ہے۔ اسرارِ حُسن و عشق کو آشکارا کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے۔ روضۂ اطہر جنّت الفردوس کا ایک قطعہ ہے، جہاں آپؐ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے اِلٰہ اور ربّ کی حمد و ثنا میں مشغول، اور اس کی دید اور جنّت کی ان گنت نعمتوں سے محظوظ و مستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ روضۂ اطہر میں بلا شبہ مصنوعی روشنی نہیں، لیکن اسے اس کی حاجت بھی نہیں، کیونکہ وہاں ہر وقت آپؐ کے جمال و جلال کی روشنی رہتی ہے اور اہلِ نظر اُس سے کیف و سُرور حاصل کرتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے حرمِ نبویؐ کا اندر اور باہر نمازیوں سے معمور ہو گیا۔ اذان ہوئی، خطبہ ہوا، نماز ہوئی، اور اہلِ جذب و شوق فرطِ اشتیاق و عقیدت سے روضۂ اطہر کے سامنے حاضری کے لیے لپکے۔ میں نے بھی وہاں حاضر ہونے کے لیے اُٹھنے کی کوشش کی،

روح کی طلب و آرزو بھی سچی تھی، لیکن اُٹھنے اور حاضری دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اہلِ جذب و شوق عصر تک اپنی اپنی جگہوں پہ بیٹھے رہے، خصوصاً وہ جو ریاض الجنّۃ میں بیٹھے تھے۔

عصر کی نماز سے فارغ ہو کر جب میں چبوترے سے اُترا تو میری نظر ایک بزرگ پر پڑی اور وہیں ٹھہر گئی۔ اہلِ شوق و نظر ان کے پاس آتے، مصافحہ کرتے اور چلے جاتے۔ میں پہلے دیر تک ان بزرگ کو دیکھتا رہا، پھر آگے بڑھا اور مصافحہ کیا۔ وہ بزرگ خاموش تھے۔ انھوں نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ دل نے کہا: "یہ بھی اللہ تعالیٰ کی پُراسرار ہستیوں میں سے ہیں۔" اس کے بعد وہ پھر دکھائی نہیں دیے، اگرچہ میری نظریں انھیں ہر روز ڈھونڈتی رہیں۔

اگلے روز تہجد کی نماز پڑھنے گئے تو مجھے پھر ریاض الجنّۃ میں جگہ نہ ملی۔ میں نے صحنِ حرم میں نماز پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ صبح کی نورانی فضا میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے میں نماز پڑھ رہا تھا تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے نور کی برفباری ہو رہی ہے اور غیر مرئی ملکوتی ہستیاں آسمان سے نیچے اُتر رہی ہیں۔

نور کیا ہوتا ہے؟

نور کیا ہوتا ہے؟ میں نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ بے مثل شے ہے۔ اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، البتہ مثال کے طور پہ اُسے برف کے گالوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ نور برف کی طرح گرتا ہے، لیکن اس کا نظارہ بڑا ہی حسین و مُطہر اور رُوح پرور و سُرور انگیز ہوتا ہے۔ نور بصیرت افروز بھی ہوتا ہے اور ایمان افزا بھی، اور اس میں چشم و رُوح کی ٹھنڈک بھی ہوتی ہے۔ سامنے روضۂ اطہر تھا، جس میں نور برس رہا تھا اور ملائکہ کا نزول ہو رہا تھا۔ اس کے اردگرد اہلِ جذب و شوق حمدِ الٰہی اور درود و سلام میں مشغول تھے۔ کچھ نوافل پڑھ رہے تھے اور کچھ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہے۔

حاضری کی تاب و تواں نہ رہی

میں نے عشاق کو روضۂ اطہر کے سامنے حاضری دیتے جاتے دیکھا تو مجھ میں بھی حاضری دینے کی ہمت پیدا ہوئی۔ میں بصدِ ادب و احترام اور دم بخود درِ مبارکؐ پر پہنچا۔ درود و سلام شروع کرتے ہی مجھ پر پہلے رقت پھر ہیبت طاری ہوگئی، چشم و قلب گریہ و زاری کرنے لگے، روح و بدن پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میرے سامنے اب روضۂ اطہر نہیں، فردوسِ بریں کا ایک وسیع و پُربہار قطعہ تھا، جو حُسن و نور کا مقدس سحر کدہ تھا اور اس میں پیکرِ حُسن و نور، سیّدالمرسلین صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اپنے صحابۂ کرامؓ کے ہمراہ رونق افروز تھے۔ آپؐ کے جمال و جلال کے نظارے کا حریف دل نہ پہلے ہوسکا تھا اور نہ اب ہوا۔ دل میں برقِ حُسن لہرائی اور لرزہ براندام کرگئی۔ دل بیٹھنے اور ٹانگیں کانپنے لگیں، اور میں اس سے زیادہ اس پُرجلال منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکا، میں زار و قطار روتا اور آہیں بھرتا، وہاں سے رُخصت ہوا، اور صحن میں آکر بیٹھ گیا۔ بار بار سوچتا تھا اور اب بھی سوچتا رہتا ہوں کہ میرا دل کیوں جلالتِ نبویؐ کا حریف نہیں ہوسکا؟ یہ راز، رازِ محبت ہے، مخفی ہی رہے تو بہتر ہے۔ اس میں ضرور کوئی حکمت ہوگی، جسے "دوست" ہی بہتر جانتا ہے۔

فجر کی اذان ہوئی، جس سے دل زندہ و بیدار ہوتے ہیں۔ پھر نماز ہوئی، تلاوتِ قرآن مجید سُن کر رُوح کیف و وجد کے عالم میں جھوم جھوم اُٹھی۔ نماز میں بلاشبہ آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ واقعی رُوح کی غذا ہے، مگر اس تجربے سے اہلِ فقر و اصحابِ حُسن و سُرور اور اہلِ جذب و شوق ہی گزرتے ہیں۔

نماز سے فارغ ہوکر ہوٹل آئے، ناشتا کیا اور تاریخی و مقدس مقامات کی زیارت کو نکلے۔

کڑی : ۱۷

مدینۂ منوّرہ کے تاریخی و مقدّس مقامات

وادیِ اُحد: ایک اہم تاریخی یادگار

مجھے چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضلِ فراواں اور اس کے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی نظرِ کرم کے طفیل آپ کا سیرت نگار بننے کا شرف حاصل تھا اور ہے، اسے لیے مجھے تاریخ کی ایک از بس اہم تاریخی یادگار وادیِ اُحد کو دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ اُحد وہ متبرک و مقدّس اور محبوب و تاریخ ساز پہاڑ ہے، جس کو مخاطب کر کے سیّد المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا تھا: "اُحد! میں تجھ سے پیار کرتا ہوں اور تو مجھ سے پیار کرتا ہے"! جو ہستی محبوبیت و عاشقی کے مقام پر فائز ہو، اس کی رفعت و عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ یہ عاشقی و محبوبیت ہی کا مقام تھا، جس کی بدولت انصار کو آپؐ کا قُربِ مدام حاصل ہوا اور آپؐ ہمیشہ کے لیے ان کے ہو رہے۔ جبلِ اُحد، جو حرم شریف سے تقریباً چار میل دُور ہے، ہر وقت آپؐ کے گنبدِ خضراء کا نظّارہ کرتا رہتا ہے اور اسے آپؐ کے قرب و حضور کی سعادت حاصل ہے

میدانِ بدر کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ کفر و اسلام کی پہلی رزم گاہ اور مسلمانوں کا میدانِ فتح ہے۔ لیکن میدانِ اُحد کو یہ دُوہرا شرف حاصل ہے کہ یہ اسلام کے دشمنوں کی دوہار ناکامی و نامرادی کے دُور رس نتائج کا حامل ہے۔ اس اجمال کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ یہاں پہلی مرتبہ قریشِ مکّہ اور اس کے حلیف مشرک قبائل اپنی پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہوئے، لیکن بے نیلِ مرام لوٹے۔ اس ناکامی سے ان کی معیشت پر تباہ کُن اثرات

مرتّب ہوئے۔ دوسری بار قریش اپنے حلیف مُشرک قبائل اور یہود کے لشکر کے ساتھ مدینۂ منوّرہ پر حملہ آور ہوئے۔ وادیِ اُحد میں وہ اُترے اور تین طرف سے شہر کو محاصرے میں لے لیا، لیکن خندق کو عبور نہ کر سکے۔ اسے جنگِ خندق یا غزوۂ احزاب کہتے ہیں۔ اس بار انھیں پھر ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ یہ ناکامی ان کے لیے شکستِ فاش سے زیادہ دُوررس و تباہ کُن عواقب و نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس کی پیش گوئی مُخبرِ صادق، اہلِ نظر و دانائے راز پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اُسی روز کر دی تھی، جب حملہ آور محاصرہ اُٹھا کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے تھے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: "اب کُفّار تم پر نہیں، تم اُن پر حملہ آور ہو گے۔" تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ کی ہر پیش گوئی کی طرح یہ پیش گوئی بھی حرف بحرف دُرست ثابت ہوئی اور ایک قلیل مدّت کے اندر مجاہدینِ اسلام نے دُنیا کے عظیم ترین سپہ سالار و فاتح کی قیادت میں سارے جزیرۃ العرب کو فتح اور ان کے باشندوں کے دلوں کو مسخّر کر لیا۔ عرب جو اسلام کے بدترین دشمن تھے، اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی میں شریک ہو کر اس کے نقیب و علمبردار بن گئے۔

شُہدائے اُحد کا قبرستان جنّتِ اہلِ عشق و وفا

سب سے پہلے ہم نے شہدائے اُحد کے قبرستان کی، جو حقیقت میں جنّتِ اہلِ عشق و وفا ہے، زیارت کی۔ اسے دیکھ کر دل بھر آیا اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

ہم نے شہیدوں کو سلام کیا، فاتحہ پڑھی اور خشوع و خضوع کے ساتھ دُعائیں مانگیں۔ یہ شہیدوں کے مقدّس و مطہّر اور حسین و معطّر خون کا اثر تھا کہ سینے میں ایک موجِ جمال و جلال اُٹھی، جو قلب و رُوح کو حُسن و نُور سے منوّر، طمانیّت و سُرور سے معمور اور کیف و مستی سے مسحور کر گئی، اور ان سے یہ راز بھی کہہ گئی کہ عشق ہی اصلِ ایمان و زندگی ہے، اس سے ہی "دوست" ملتا ہے، اور اہلِ عشق پر موت اور آگ حرام ہے۔ دُعا سے فارغ ہو کر جنّتِ شہداء کا جائزہ لیا تو سخت قلق ہوا۔ جنّت المعلّٰی اور جنّتِ شہدائے بدر کی طرح

اس جنتِ شہدآئے اُحد کی بھی حالت زار تھی۔ اس کی بھی دیواریں بوسیدہ اور مدتوں سے سفیدی اور رنگ روغن سے ناآشنا تھیں۔ ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا دروازہ تھا اور وہ بھی مقفل۔ اندر جانے کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ نہ کوئی مزار تھا نہ قبر، صرف سنگریزوں کے بے نام و نشان ڈھیر تھے۔ ایک گوشے میں سنگریزوں کے ایک ڈھیر کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مزار کہتے ہیں، لیکن یہ بات بھی مشکوک و مشتبہ ہے۔

یہاں بھی یہ سوال بار بار میرے ذہن میں آتا اور دل میں خلش پیدا کرتا رہا کہ حکومت کیوں تاریخ اسلام کی ان اہم یادگاروں کے تحفظ، دیکھ بھال اور تحسین و تزئین کا مناسب و معقول انتظام نہیں کرتی؟ حالانکہ یہ دُنیا بھر کے حجاج و زائرین کی زیارت گاہیں ہیں۔ اہلِ دید و نظر اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ جنت المعلیٰ ہو یا جنت البقیع، جنتِ شہدآئے بدر ہو یا جنتِ شہدآئے اُحد، سب اتنے مقدس و متبرک مقامات ہیں کہ ان پر جن و انس کے علاوہ ملائکہ بھی سلام و دُعا بھیجتے رہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان پر "دوست" کی نظر رہتی اور نور کی برفباری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، جو مقام ربِّ ذوالجلال کے دوستوں کا حُسن المآب ہو اور اس کی نظر میں ہو، اس کی عظمت و فضیلت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

میں نے ایک دن بعض اربابِ حکومت سے ان مقاماتِ مقدسہ کی حالتِ زار کا شکوہ کیا تو جواب ملا: "حکومت نے شرک و بت پرستی کا سدِ باب کرنے کی خاطر یہ سب کچھ روا رکھا ہے۔ یہ راز سب جانتے ہیں، اگرچہ کم مانتے ہیں کہ ابلیس و شیاطین اپنے جمالیاتی فریب کے ذریعے سادہ دل بندوں کو شرک و بت پرستی (جس کی ایک شکل قبر پرستی ہے) کی طرف مائل کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے، اور شرک و قبر پرستی ایک ناقابلِ عفو گناہ ہے، جس سے نیکیاں بدیوں میں بدل جاتی ہیں اور مشرک ہمیشہ کے لیے اہلِ نار بن جاتے ہیں۔"

شہیدانِ عشق و وفا کو سلام کر کے ہم وادیِ اُحد کی سیر کرنے لگے تو میرے ذہن کے

ٹیلی ویژن پر غزوۂ اُحد کی تصویریں متحرک ہو گئیں۔ میں نے سیرۃ النبیؐ پر اپنی تالیف "پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم" میں جنگِ اُحد اور جنگِ احزاب (جنگِ خندق) کا جو نقشہ کھینچا تھا، اس کا ایک ایک منظر اور واقعہ اِس "پردۂ سیمیں" پر آ گیا، اور مجھے حیران و مسرور کر گیا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا، درست تھا۔

سبق آموز سزا

میں نے بیگم کو ایک جگہ بٹھایا اور خود اُس پہاڑی پر گیا جس پر مجاہدین کے سپہ سالار نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے درّے کی حفاظت کے لیے تیر افگنوں کو متعین کیا تھا۔ پھر وہ درّہ بھی دیکھا، جس میں سے گزر کر قریش کے بہادر و نامور سپاہی خالد بن ولید نے اسلامی لشکر پر عقب پر حملہ کر کے اسے تتر بتر کر دیا تھا، اور جنگ کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ اگرچہ قریش جنگ جیت نہ سکے اور نہ اپنے مقاصد ہی میں کامیاب ہو سکے، لیکن اُنھوں نے مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان ضرور پہنچایا۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ مسلم تیر اندازوں نے اپنے سپہ سالار رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے واضح اور تاکیدی حکم کے باوجود مالِ غنیمت کے لالچ میں آ کر اپنا مورچہ چھوڑ دیا تھا۔ عسکری تنظیم و طاعت کی اہمیت کو مجاہدین پر واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں سبق آموز سزا دی، لیکن انھیں شکست سے بچا لیا اور قریش کو اُن کی حربی برتری کے باوجود بے نیلِ مرام لوٹا دیا۔ میں تصوّر میں یہ تمام مناظر دیکھتا رہا۔ مجھے اس احساس سے بے حد مسرت ہوئی کہ میرے مشاہدات سچے تھے۔

میرے ہمراہ کچھ اہلِ علم و تحقیق اور دو سیرت نگار بھی تھے۔ ہم نے درّے کو دیکھا جو اس سے بہت زیادہ عریض و وسیع تھا، جتنا قدیم کتبِ تاریخ و سیرت میں مرقوم ہے۔ اس کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ امتدادِ وقت اور موسم کے تغیّرات نے درّے کو پہلے سے زیادہ عریض و وسیع کر دیا ہے۔ یہاں مٹی اور ریت کے پہاڑ نما تودے (DUNES) ہوں گے

جو طوفانِ باد و باران سے ناپید ہو گئے۔

بعد ازاں ہم نے وہ راستہ دیکھا جس سے خالد بن ولید اپنے سواروں کے ایک دستے کے ساتھ اس درّے تک پہنچے تھے۔ ہم نے اس پہاڑی کو بہت تلاش کیا، جس پر چڑھ کر آپؐ نے مجاہدین کے لشکر کو اکٹھا کیا اور ان کی از سرِ نو صف بندی کی تھی، مگر اس کے صحیح مقام کی تعیین نہ ہو سکی۔ بعد ازاں، ہم نے جنگِ احزاب کی خندق کا سراغ لگانے کی کوشش کی، لیکن اس کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ہم نے اندازے سے اور کتابی معلومات کی بنا پر اس کے مقام کو خود ہی متعیّن کیا۔ سب کو اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ مؤرخین، اہلِ علم و شوق اور محققین کی رہنمائی کے لیے ان اہم تاریخی مقامات کی نشاندہی کر دینا ضروری تھا، لیکن کسی حکومت نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ عرب کی حکومتیں کیوں ان تاریخی مقامات کی اہمیّت سے غافل رہیں اور ان کی حفاظت و نشاندہی کا کوئی مناسب انتظام نہیں کیا؟ یہ ایسا سوال ہے جو مورخین اور زائرین کے دلوں میں تیرِ نیم کش کی طرح ہمیشہ کھٹکتا رہتا ہے اور کھٹکتا رہے گا۔

خدا معلوم میں کتنے عرصے تک وادیِ اُحد کے ماحول کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھتا رہا۔ یہاں کفر و اسلام کی دو زبردست جنگیں ہوئی تھیں۔ دونوں جنگوں میں دشمنوں کو ناکام لوٹنا پڑا تھا۔ اگر دشمنانِ اسلام کسی بھی جنگ میں کامیاب ہو جاتے تو اس کا انجام کیا ہوتا؟ اس تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ مسلم مجاہدین جنھوں نے ان جنگوں میں حصّہ لیا تھا، یقیناً اللہ تعالیٰ کے پُر اسرار بندے اور اہلِ جذب و شوق تھے، جنھیں شہادت مطلوب تھی۔ ایسے ہی اہلِ ایمان مجاہدین سے متعلّق علّامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

دشمنانِ اسلام یہاں شمعِ توحید بجھانے اور انسان کو عدل و احسان، اخوت و مساوات اور علم و حکمت کی نعمتوں سے محروم کرنے کے لیے حملہ آور ہوئے تھے۔ ان کی جارحیت کا مقصد کفر و شرک، ظلم و استحصال، غلامی و محکومی اور جہالت و ناخواندگی کو قائم و دائم رکھنا تھا۔ اگر دشمن اپنے عزائم میں کامیاب ہو جاتے تو بنی نوع انسان نہ اپنے الٰہ و رب کو پا سکتے اور نہ عبدیت کے حقیقی مقام پر فائز ہی ہو سکتے تھے۔ وہ سدا شرک و کفر کے اندھیروں میں بھٹکتے اور خوف و حزن کی آگ میں جلتے رہتے۔ اللہ کے بندے اپنے الٰہ و رب کے قرب و حضور کی سعادت و نعمت اور دولتِ دل سے محروم رہتے۔ سب سے بڑھ کر عذاب النار کی زندگی ان کا مقدر بن جاتا، اور وہ جنت کی ابدی زندگی کی لامتناہی نعمتوں سے محروم رہ جاتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بنی نوع انسان اسلام کی برکات کے لیے انھی غازیوں اور شہیدوں کے مرہونِ منت ہیں۔

زمانہ میرے لیے چودہ صدیاں پیچھے پلٹ گیا تھا۔ میں الگ تھلگ وادیٔ اُحد میں پھر رہا تھا اور جنگ کے واقعات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہ مشاہدہ میں اُس وقت بھی کر چکا تھا جب میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ لکھ رہا تھا۔ خُدا جانے کب تک ان نظاروں کے دیکھنے میں محو رہا۔ میں نے جنگِ اُحد اور جنگِ احزاب (جنگِ خندق) دونوں کی متحرک تصاویر دیکھیں۔ خندق کو میں اب صاف دیکھ رہا تھا۔ دشمن کا کھودا ہوا اور کھجور کی چھال وغیرہ سے ڈھکا ہوا وہ گڑھا بھی میرے سامنے تھا، جس میں آپؐ گر پڑے تھے اور وہ مقامات بھی دکھائی دے رہے تھے جہاں آپؐ دشمنوں کے نرغے میں پھنس گئے تھے، لیکن چٹان کی طرح دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے مجاہدین کی قیادت فرما رہے تھے۔ میں نے اس طوفان کا مشاہدہ بھی کیا، جس میں کفّار کے اِتحادی لشکر جنگِ احزاب میں سراسیمہ ہو کر محاصرہ اُٹھا کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے تھے۔

وادیِ اُحد میں عجیب طرح کا سکوت تھا۔ اس پُراسرار سکوت میں، جس کی معنویت اہلِ جذب و شوق ہی سمجھ سکتے تھے، میں اس تاریخ ساز وادی میں اکیلا ہی بہت دُور نکل گیا۔ کہیں کہیں زمین لعلِ تاباں کی طرح سرخ و روشن نظر آتی تھی۔ دل سے کسی نے کہا: خونِ شُہداء سے مزیّن سرزمین لعل و گوہر کے خزانوں سے بدرجہا گراں بہا ہے۔ یہ ریت کے سُرخ ذرّے، جو اہلِ نظر ہی دیکھ سکتے ہیں، جنت کے لعل و گوہر ہیں: آب و تاب میں بے نظیر و بے مثال اور ہمیشہ پائندہ و تابندہ رہنے والے۔ شہید زندہ ہیں اور اپنے اللہ کے پاس حُسن و سُرور کی ایسی زندگی گزار رہے ہیں، جس کا انسان دُنیا میں تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔ وہاں کی ابدی زندگی کا ایک لمحہ یہاں کی صدیوں سے زیادہ طویل و بیش بہا ہے۔ موت فانی اور زندگی لافانی ہے۔ شہید اور غازی وارثِ جنت، صاحبِ حُسن و سُرور اور زندۂ جاوید ہوتے ہیں۔ یہی اہلِ جذب و شوق مقامِ عبدیّت پہ فائز ہوتے ہیں، جو انسانیّت اور "شاہدیّت" کا بلند ترین مقام ہے۔

زندگی ہر آن تغیّر پذیر رہتی ہے۔ اس وادیِ جذب و شوق میں بھی کئی تبدیلیاں آچکی ہیں، اور وہ تیزی سے بدلتی جارہی ہے۔ مکّہ مکرمہ بدل گیا، مزدلفہ، منیٰ اور عرفات میں تغیّرات کا سلسلہ جاری ہے۔ طائف یکسر بدل چکا ہے۔ مکّہ مکرمہ بدل کر جدید شہروں جیسا ہوگیا ہے اور مدینہ منوّرہ بھی یکسر تبدیل ہوچکا ہے۔ چودہ سو برسوں میں ان مقدّس و تاریخی مقامات کا نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ تاریخ مسلسل بدلتی رہتی ہے کہ یہ سنّتِ الٰہی ہے۔ وہ جو سب کا اِلٰہ و ربّ ہے، ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ فگن ہوتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی بدلتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ جذب و شوق اور صاحبِ حُسن و سُرور ہمیشہ یہ دُعا مانگتے رہتے ہیں "یہاں" بھی اور "وہاں" بھی:

رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا (التحریم ۶۶: ۸)

اے ہمارے ربّ، ہمارے لیے ہمارے نور کی تکمیل کیجیو اور ہمیں لغزشوں سے محفوظ رکھیو۔

وہ پُراسرار بندے

میں اس وادیِ جذب و شوق میں ماضی کی سیر کرتا دُور نکل گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ دامنِ کوہ میں دو بزرگ ایک چٹان پر رونق افروز ہیں۔ وہ مُعمّر ہونے کے باوجود صحت مند و توانا تھے۔ ان کے چہرے نورانی اور آنکھیں روشن تھیں۔ وہ خاموش تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کی نظریں محوِ نظارہ ہیں۔ وہ کیا دیکھ رہے تھے، اور وہاں تنہا کیوں بیٹھے تھے؟ معاً میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوئے۔ شوق و تجسّس کی کشش مجھے ان پُراسرار بند ں کی خدمت میں لے گئی۔ میں نے سلام اور مصافحہ کیا، اور ان کی اجازت سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ خاصی دیر تک خاموش رہے اور ان کی نظریں محوِ نظارہ رہیں۔ شوق و تجسّس ان سے گفتگو کے لیے بے تاب تھا، لیکن ادب مانع تھا۔ آخر کار میری آرزو پوری ہوئی اور ان میں سے ایک بزرگ نے اپنی زبان میں فرمایا "تُم بڑے ہی خوش قسمت ہو کہ تُم نے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرۃِ طیّبہ لکھی ہے۔ مبارک ہو کہ تمھاری تصنیف حضورِ رسالت مآبؐ کی بارگاہ میں مقبول ہوئی ہے۔ تمھیں خلوت میں رکھا گیا ہے، کیونکہ اہلِ جذب و شوق کو جلوت راس نہیں آتی۔ امتحانِ مہر و وفا سے نہ گھبراؤ کہ اس سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ موت کو یاد رکھو، کیونکہ اس کی یاد بندے کو اس کے اِلٰہ و ربّ کے قریب کرتی ہے۔ اپنے قلب کو روشن رکھو، کیونکہ جن کا قلب اندھا ہوتا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھے ہی اُٹھیں گے۔"

میں حیرت و مسرت سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس مردِ خُدا کی آواز میں وجد آفرین تاثیر برقِ حُسن تھی۔ وہ میرے ایک سوال کے جواب میں فرمانے لگے "تُم نے اولیاء اللہ کی محفل میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ تم نے حضور رسالت مآبؐ کی بزم کا مشاہدہ کیا ہے۔ تم نے اپنے اِلٰہ کو اس کی صورت میں دیکھا ہے۔ تم نے حریمِ کبریا کا نظّارہ کیا ہے۔ تمھیں جنّت کے نظّاروں کے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اب تُم اور

کیا چاہتے ہو؟ تمھارے اِلٰہ نے تمھیں اپنے اور اپنے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گھر دکھا کر تمھاری آنکھوں کو ٹھنڈا کیا ہے۔ اس نے تمھیں اور بھی بہت کچھ دکھایا ہے۔ اب تمھیں یہ طلب و آرزو ہے کہ تم ایسے صاحبِ شہود بن جاؤ کہ جب چاہو اپنے اِلٰہ اور اس کے حبیب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا مشاہدہ کر سکو، لیکن ایسا نہیں ہوا کرتا۔ مشاہدہ "دوست" کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے، اور اہلِ محبّت کو ہجر و فراق کی لذّت سے ہمیشہ آشنا ہونا پڑتا ہے۔ دید و مجبوری اور وصال و فراق لازم و ملزوم ہیں۔ زندگی عبارت ہے سوز و ساز سے۔ یہ اس کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے تمھیں اسرارِ حُسن و سُرور سے آگاہ اور لذّتِ جذب و شوق سے آشنا کیا ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے اور میرے لبوں پر بھی مہرِ سکوت لگی رہی۔ پھر وہ گویا ہوئے:
"یہ دُنیا دارالامتحان ہے اور تم امتحان سے ڈرتے ہو۔ شکر کرو کہ تُم اللہ تعالیٰ سے بھی ڈرتے ہو، اس لیے کہ تم اس سے محبّت کرتے ہو۔ یہ بھی اسی کا فضل و کرم ہے۔ تمھیں ایک دفعہ پھر خانۂ کعبہ کا طواف کرنا ہے۔ اَنشاءاللہ وہاں ملاقات ہو گی۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں بُزرگ اُٹھے، مَیں بھی اُٹھا۔ اُنھوں نے مصافحہ کیا، خُدا حافظ کہا اور ایک سمت روانہ ہو گئے۔ مَیں نے بولنے کی ہزار کوشش کی، مگر کوئی کوشش مُہرِ سکوت کو توڑ نہ سکی۔ مَیں حیرت و اشتیاق سے انھیں دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ کون تھے؟ انھیں میرے متعلق یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟ کیا مَیں واقعی اتنا خوش قسمت ہوں؟ کیا میں پھر خانۂ کعبہ کا طواف کرنے مکّہ مکرّمہ جاؤں گا، جس کا بظاہر کوئی امکان نہ تھا؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات تھے، جو میرے دل و دماغ پر یورش کر رہے تھے۔ میرے دل میں حیرت و مسرّت کے جذبات کا طوفان موجزن تھا۔ اس طوفان کو دل میں تھامے میں شہدائے اُحد کے قبرستان کو لوٹا، جہاں میری بیگم اور ساتھی میرا انتظار کر رہے تھے۔

بہشتِ شہدا کے باہر عورتیں اور مرد تسبیحیں، کھجوریں اور دیگر چیزیں بیچ رہے تھے۔ وہ سب چیزیں خریدنے لگے اور میں شہیدوں کو الوداعی سلام کہنے چلا گیا۔ وہاں سکوت تھا، جس میں درد و سوز بھی تھا اور ساز و طمانیت بھی۔ میں فاتحہ پڑھنے اور دعا مانگنے میں مشغول تھا کہ یکبارگی میں نے محسوس کیا کہ اس جنتِ ارضی میں کچھ غیر مرئی ہستیاں موجود ہیں۔ "یہ میرا واہمہ تو نہیں؟" میں نے دل سے کہا۔ میں ابھی اس عالمِ حیرت میں گُم تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہاں نور کی ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے۔ پھر میرے کانوں میں شیریں و دلکش بے صوت صدائیں آنے لگیں۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ان باتوں نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ دفعتاً دل میں ایک پُراسرار سی آواز آئی "یہ زندۂ جاوید ہستیوں کی جنت ہے۔ یہاں فرشتوں کا نزول اور نور کی برفباری ہوتی رہتی ہے۔ یہ راز اہلِ نظر ہی جانتے ہیں، اور اسے راز ہی رہنا چاہیے۔" میں نے کیا دیکھا اور کیا سُنا، اسے راز ہی رہنا چاہیے۔ میں ان مشاہدات میں مستغرق تھا کہ مجھے کسی نے پُکارا "ڈاکٹر صاحب! آئیے! بہت دیر ہو رہی ہے۔" میں چونکا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نیند سے بیدار ہوا ہوں اور ایک حسین اور عجیب و غریب خواب دیکھ رہا تھا۔

عالمِ اسلام کی پہلی مسجد، مسجدِ قُبا

یہاں سے ہم مسجدِ قُبا پہنچے جو مدینۂ منوّرہ سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ احساس بڑا ہی رُوح پرور اور سُرور انگیز تھا کہ یہ ملّتِ اسلامیہ کی پہلی مسجد ہے جس کی بنیاد خود پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی اور محنت کشوں کی طرح اس کی تعمیر میں حصّہ لیا تھا۔ اس مسجد میں نوافل پڑھنا بڑی سعادت کی بات ہے۔ عُمرے کا ثواب ملتا ہے۔ کچھ اہلِ جذب و شوق نوافل پڑھنے میں مشغول تھے اور کچھ ذکرِ الٰہی میں محو۔ اس مسجد کی تعمیر میں حضورِ پُرنور صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے جسمِ اطہر کا پسینۂ مُبارک شامل تھا، جس کی بُوئے جانفزا سے مشامِ جاں آج بھی معطر ہوتی ہے۔ میں جب سجدے

میں گیا تو عجیب سی مہک آئی اور روح کو مسحور کر گئی۔ یہ خوشبو اسی نوع کی تھی جو مسجدِ نبوی میں آتی تھی۔ مسجدِ قُبا بھی حُسن و نُور کی آماجگاہ ہے، اس لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور رُوح کا سُرور ہے۔ اس مسجدِ مبارک کی تعمیر و ہیئت بے شک بدل چکی ہے لیکن فضا تو وہی ہے، جس میں سیّد المرسلین صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سانس لیا تھا۔ ان مبارک سانسوں کی خوشبو سے یہ فضا آج بھی معمور ہے، اور ان کے نقوشِ حُسن و عشق کی جلوہ گاہ بھی ہے۔

آپؐ نے مدینہ منورّہ کے مضافات میں پہنچتے ہی سب سے پہلے مسجدِ قُبا تعمیر کی تھی۔ اس سے اُسے اوّلیت کا شرف اور غیر معمولی اہمیّت حاصل ہے۔ مسجدِ قُبا میں بھی کچھ اہلِ فقر ایسے بھی نظر آئے جو پُر اسرار دکھائی دیتے تھے۔ وہ ذکرِ الٰہی میں مگن تھے۔ اُن کے چہرے نُورانی، معصوم اور آنکھیں روشن تھیں، اور ان کی روشنی میں ایک خاص قسم کی مسحور کُن کشش تھی۔ عُمر رسیدہ ہونے کے باوجود وہ مضبوط و توانا تھے۔ میں ان اہلِ جذب و شوق کو حیرت و عقیدت کی نظروں سے دیکھتا رہا اور دل گفتگو کے لیے مچلتا رہا۔ لیکن ان کی پُرہیبت محویّت کی تاب نہ لا سکا۔ میں نے مُخل ہونا مناسب نہ سمجھا، اور دل میں حسرتِ ملاقات لیے وہاں سے رُخصت ہوا۔

بئرِ خاتم یا چاہِ مُہرِ خلافت

مسجدِ قُبا کے سامنے بئرِ خاتم ہے۔ یہ ایک کنواں ہے جو اب خشک ہو چکا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں مُہرِ خلافت اس میں گر گئی تھی، جو مساعیِ جمیلہ کے باوجود دستیاب نہ ہو سکی، اسی لیے اس کنویں کو عربی میں بئرِ خاتم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

مسجدِ جُمعہ

یہاں سے ہم مسجدِ جمعہ کی زیارت کو گئے۔ مسجدِ جمعہ کو یہ شرف ہے کہ یہاں نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم پر آیتِ جُمعہ نازل ہوئی تھی اور آپؐ نے جمعۃ المبارک کی پہلی نماز یہاں پڑھائی تھی۔ یہ مسجد مدینہ منورّہ

کی طرف مسجدِ قبا سے تقریباً آدھ میل دُور دائیں جانب واقع ہے۔ اِسلام میں جمعۃ المبارک کو جو فضیلت و اہمیّت حاصل ہے، اس کے پیشِ نظر اس مسجد کی تاریخی اہمیّت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور پر اسے دی جاتی ہے۔

دیگر تاریخی مساجد اس کے بعد ہم نے مسجدِ بنی نجار، مسجدِ سیّدنا عُمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مسجد ذو قبلتین کی زیارت کی۔ مسجد قبلتین زبردست تاریخی اہمیّت کی حامل ہے۔ اسے یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم پر تحوّلِ قبلہ کی آیتِ کریمہ نازل ہوئی تھی۔ آپؐ اس وقت امامت فرما رہے تھے اور آپؐ کا رُخ بیت المَقدس کی طرف تھا۔ تبدیلیٔ کعبہ کا حُکم ملتے ہی آپؐ نے کعبہ شریف کی طرف رُخ کر لیا اور سب نمازیوں نے آپؐ کی متابعت کی۔ مؤرخین، مستشرقین اور آپؐ کے سیرت نگاروں نے اس تاریخی واقعے کی غیر معمولی اہمیّت پر بہت زور دیا ہے۔ اس تبدیلیٔ قبلہ سے مِلّتِ اسلامیہ کی انفرادیت اور تشخّص کے قیام میں زبردست مدد ملی تھی، اس لیے مسلمانوں کو اس حُکمِ الٰہی سے بے حد مسرّت ہوئی، لیکن یہود کو اس سے زبردست دھکّا لگا اور وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ پہلے قبلے کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

اب ہم مساجدِ خمسہ کی زیارت کو نکلے۔ یہ پانچ مسجدیں جنگِ خندق کی یادگار کوہِ سلع کے دامن میں واقع ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: مسجدِ فتح، مسجدِ سلمان فارسیؓ، مسجدِ سیّدنا ابوبکر صدّیقؓ، مسجدِ سیّدنا عُمرِ فاروقؓ، مسجدِ سیّدنا علی مرتضیٰؓ۔ اس پہاڑی پر قلعے کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں۔

بئرِ عثمان رضؓ بئرِ عثمان غنیؓ یا چاہِ عثمانؓ مدینۂ منوّرہ سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کنویں کی تاریخی اہمیّت یہ ہے کہ اسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہود سے خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا، اور اس طرح

انھوں نے غریب مسلمانوں کی حاجت روائی کی تھی اور انھیں پانی کی کمیابی کی اذیت ناک تکلیف سے بچایا تھا۔ اب یہاں ایک خوشنما باغ ہے، جس میں کھجور اور انار وغیرہ کے درخت ہیں۔ سارا ماحول شاداب ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچّا بھی ہے کہ انسان وہ ہے جو دُوسروں کے کام آتا ہے۔

مدینہ یونیورسٹی

بعد ازاں ہم مدینہ یونیورسٹی گئے جو شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ دینی علوم کا مرکز ہے۔ اس کی عمارت بڑی وسیع و کشادہ ہے۔ بیرونی ممالک کے سینکڑوں طالب علم یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ اقامتی یونیورسٹی ہے۔ تعلیم و سکونت اور کتب وغیرہ سب کچھ مفت ہے۔ علاوہ ازیں، سعودی حکومت طلبا کو معقول وظیفہ بھی دیتی ہے۔ یونیورسٹی کا ماحول علمی، دینی اور پُرامن ہے۔ اساتذہ اور طلبا کا باہمی ربط مثالی ہے۔ یہاں تعلیم کی ایک امتیازی خصوصیّت یہ ہے کہ توحید پر بجا طور سے، بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ شرک نہ صرف یہاں بلکہ ملک کے کسی حصّے میں بھی دکھائی نہیں دیتا۔ توحید کی شمع جو سعودی حکومت نے پھر سے حجاز میں روشن کی ہے، بڑی ہی ایمان افزا و بصیرت افروز ہے۔

یہ یونیورسٹی بلا شبہ دین کی عظیم خدمت کر رہی ہے۔ اس میں بھارت اور پاکستان کے طلبا کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اسلام چونکہ اُخروی و دُنیوی اور روحانی و مادّی زندگی یا کُل زندگی کو محیط ہے، اس لیے یونیورسٹی میں سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر جدید علوم کی تعلیم کا معقول بندوبست بھی ہونا چاہیے۔ یہ بڑے تعجّب اور افسوس کا مقام ہے کہ یہاں ان علوم کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں اور نہ حکومت کو ان کی اہمیّت کا احساس ہے، حالانکہ یہ زمانے کا تقاضا بھی ہے اور ناگزیر ضرورت بھی۔ اسلامی ممالک کے دفاع اور ترقّی کے لیے مسلمانوں کا جدید علوم اور ٹیکنالوجی میں ترقّی کرنا ازبس ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ کاش سعودی حکومت کو بالخصوص اور دیگر اسلامی مملکتوں کو بالعموم وقت کے اس اہم ترین

تقاضے کا احساس و شعور ہو جائے اور وہ اسے پُورا کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اور مثبت عملی اقدام کریں۔

بیتِ حضرت امام حسین رضؓ مدینہ یونیورسٹی سے ہم بیتِ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زیارت کو گئے۔ سیّد الشہداء رضؓ کا گھر، جو اب لائبریری میں تبدیل کر دیا گیا ہے، مختصر اور سادہ ہے۔ زمانے نے اس کی ہیئت تبدیل کر دی ہے، لیکن اس کی فضا میں اب بھی حُسن و نُور جلوہ جلوہ فگن ہے۔ یہ اہلِ فقر و نظر کا قُرۃُ العین ہے، اور حرمِ نبویؐ کے قریب ہے۔ یہ مکان علامت ہے معصومیّت و فقر اور تقدّس و طہارت کی، نیز آمریّت و قارونیّت کے خلاف جہاد اور اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے احیاء کی۔

کڑی : ۱۸

مکاشفات و مشاہدات کا جہانِ مقدّس

میں اب اکثر و بیشتر اصحابِ صُفّہؓ کے مقام پر بیٹھتا اور نماز پڑھتا تھا۔ میری نظر روضۂ اطہر کے اندر ہوتی اور وہاں کے مسحور کُن نظاروں سے کیف و سرور حاصل کرتی رہتی اور دل درود و سلام پڑھتا اور دُعا و فریاد کرتا رہتا تھا۔ میں نے جب بھی آپؐ کو دیکھا، باغِ فردوس میں محفلِ احباب میں صدر نشین ہی دیکھا اور وہاں اپنے اِلٰہ و ربّ کے حُسن کو جلوہ نما ہی پایا۔ یہ میری خوش قسمتی اور میرے ہادی و مسیحاؒ کا فیضانِ بے حساب تھا۔ میں جب بھی حرم شریف میں گیا مجھے چند چہرے ایسے نظر آئے جو غیر معمولی طور پر نُورانی، شاداب اور پُراسرار تھے۔ ان کی آنکھیں روشن اور شخصیّت میں رُوح پرور جلال تھا۔ مجھے بہتوں سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوا، لیکن میں نے ان کو خاموش ہی پایا۔ وہ کیا سوچتے اور کیا وِرد کرتے تھے، وہ کون تھے اور کہاں کے تھے؟ میرے لیے یہ راز ہی رہا۔

پیکرِ نُور و قدسؒ کی بزمِ حُسن و سُرور میں

ایک دن میں اسی چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بزرگ نے، جو مجھ سے پہلے وہاں تشریف فرما تھے، مجھ سے پُوچھا "کیا آپ نے اصحابِ صفّہؓ کی زیارت کی ہے؟" میں نے حیرت و استعجاب سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی پُرجلال شخصیت اور آنکھوں کی پُراسرار چمک کا دل حریف نہ ہو سکا۔ آواز میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی اور میں نے نفی میں سر ہلایا۔ انھوں نے فرمایا "نماز کے بعد میرے ساتھ چلنا،

انشاء اللہ ان کی زیارت سے فیض یاب ہو گے۔" میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ نماز کے بعد میں سحر زدہ انسان کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ جنت البقیع پہنچے، فاتحہ پڑھی اور پھر مراقبے میں چلے گئے۔ اس وجدانی کیفیت سے نکلے تو فرمایا "یہاں نہیں، اہلِ صُفّہؓ کے مقام پر۔"

ہم واپس حرمِ نبویؐ آئے اور روضۂ اطہر کے بالمقابل صُفّہ پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے مجھے اسمِ اعظم پڑھنے اور مراقبے میں جانے کو کہا۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے اسمِ اعظم کا بھی پتا تھا اور مراقبے کی بھی مزا و لذت تھی۔ اس پُراسرار بزرگ کی توجّہ سے فوراً ہی مجھ پر جذب و بے خودی کی کیفیّت طاری ہو گئی۔ اس عالم میں میں نے ایک جماعت کو دیکھا جو حضورِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بزمِ حُسن و سُرور میں حاضر تھی۔ ان کا لباس حُسن و نُور کا تھا، چہرے پُر نور اور جمیل و جلیل تھے۔ وہ بے حد مسرور و مطمئن تھے۔ ان کی آنکھیں شعلہ بارِ حُسن و نُور تھیں۔ پیکرِ حُسن و نُور محمّد رسول اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ان کو متبسّم نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کسی نے چُپکے سے دل سے کہا "یہ اصحابِ صُفّہؓ ہیں۔ یہ شاہِ دو عالم، سرورِ کونین صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہم جلیس ہیں۔ ان میں بدر اور اُحد کے شُہدا بھی ہیں۔ یہ اہلِ حُسن و سُرور زندہ جاوید ہیں۔ انھیں اپنے الٰہ و ربّ کی دید اور قرب و وصال میسّر ہے۔" میں نے ان کے علاوہ اور بھی مسرور و پُر نور اور جمیل و جلیل چہرے دیکھے، لیکن میری نظر فوراً ہی اپنے آقا و مسیحاؐ کے چہرۂ مبارک پر پڑی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ آپؐ کے چہرے کا نُور ماہتابی اور مسحور کُن تھا۔ میں مسحور ہو گیا۔ مجھے بار بار ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرا الٰہ ابھی وہاں موجود ہے۔ اس کی حُسن پاشیاں صاف اس کی موجودگی کا پتا دیتی تھیں، لیکن وہ مستور اور اُس کا حُسن ظاہر تھا۔ وہ شاہد بھی تھا اور مشہود بھی، مگر خود محجوب تھا۔ اس کی موجودگی کا احساس اور اس کے حُسن کا جلوہ ایسا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک مقدّس سحر اور رُوح پرور سُرور تھا۔ خُدا معلوم میں

اس عالم میں کب تک رہا کہ مؤذن کی صدائے دلنشین نے مجھے بیدار کر دیا۔ چبوترہ نمازیوں سے بھرا ہوا تھا، لیکن وہ پُراسرار بزرگ موجود نہیں تھے۔ میری نظروں نے انھیں بہت تلاش کیا، مگر بے سود۔ کیا اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے ہی پُراسرار ہوتے ہیں؟ بار بار یہ سوال میرے ذہن میں آتا تھا؟ دفعتاً کسی نے دل سے کہا "ہاں! وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" "دوست" کی آواز کو کون نہیں پہچانتا؟

نظّارۂ گنبدِ خضراء کا اعجاز

میرا یہ معمول تھا کہ جب میں ہوٹل میں ہوتا تو گنبدِ خضرا کو دیکھتا رہتا۔ بعض اوقات اس کا نظّارہ بڑا ہی دلکش اور پُراسرار بن جاتا۔ پُراسرار و غیر مرئی ہستیوں کے سائے اس کے چاروں طرف منڈلاتے دکھائی دیتے۔ یہ یقیناً ملکوتی ہستیوں کے سائے تھے، حسین و روح پرور۔ یہ منظر آنکھوں سے اوجھل بھی ہو جاتا اور کبھی نظر بھی آنے لگتا۔ نمازِ عشاء کے بعد رات تاریک ہو جاتی تو ان نظّاروں میں حُسن و نُور کا امتزاج مسحور کُن بن جاتا۔ میں ان سحر انگیز نظّاروں میں گم ہو جاتا اور روضۂ اطہر میں حاضر ہو جاتا۔ مجھے جب بھی وہاں حاضر ہونے کی اجازت ملی، اہلِ جنّت کو اپنے اِلٰہ کی دید اور اس کی حمد و ثنا میں مشغول ہی پایا۔ جنّت اس کے حُسن و نُور سے منوّر و نظر افروز ہوتی۔ بزمِ رسالت مآبؐ میں آپؐ کے حُسن و نُور کے علاوہ ایسے بے مثال حُسن و نُور کی جلوہ افروزیاں بھی ہوتی تھیں، جو ربِّ جلیل و جمیل کا ہی ہو سکتا تھا۔ آپؐ کا حُسن و نُور سحر انگیز رنگ سے ممزوج تھا۔ جنّت گوناگُوں رنگ و نور کی جلوہ گاہ ہوتی۔ اسے کیف و سُرور اور رنگ و نُور کا حُسن المآب ہی کہہ سکتے ہیں۔ وہاں کے زمان و مکان پُراسرار ہیں۔ جہانِ قیاس وسعت و پہنائی ایک نقطے میں سمٹ آتی ہے اور صدیاں ایک لمحے میں سما جاتی ہیں۔ وہاں زندگی ہی زندگی ہے اور زندگی انحطاط و زوال اور موت و فانیت سے ناآشنا و ماوراء ہے۔ زندگی صدائے کُن کا سرمدی سُر، وجد آفرین سُرور اور حُسن کا سِرّالاسرار ہے۔

اعراف و جہنّم کا مشاہدہ

ایک دن سونے کے وقت نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے اعراف اور جہنّم کی ایک جھلک دیکھنے کی دُعا مانگی۔ دُعا مستجاب ہوئی اور میں نے اعراف اور دوزخ کی ایک ایک جھلک دیکھی۔ وہاں میں نے کئی عزیزوں اور آشناؤں کو دیکھا۔ اعراف میں ایک وسیع عمارت تھی، وہاں میں نے کچھ عزیزوں کو دیکھا جو اس کی چھت پر تھے۔ اس عمارت کے ایک طرف جنّت تھی، جہاں سے جانفزا ٹھنڈی ہوا آتی تھی۔ میں نے یہ خنک و سُرور انگیز ہوا محسوس کی۔ دوسری جانب دوزخ تھا۔ وہاں سے آتش بداماں ہوا کے جھونکے آتے تھے، جو بڑے اذیّت ناک، روح فرسا اور جھلسا دینے والے تھے۔ ایک لحظہ کے لیے یہ جھونکا مجھے بھی لگا۔ میں بھی ان کی طرح تڑپ اُٹھا۔ میں نے اپنے اللہ سے پناہ مانگی اور ایک پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی وہاں دوزخ کے آتش ناک ہوا کے جھونکے آنے بند ہو گئے اور جنّت کی رُوح افزا و خنک ہوا آنی شروع ہو گئی۔ کچھ عزیز وہاں آ کر بیٹھ گئے اور ان کی جان میں جان آئی۔ دفعتًا میں نے اپنے آپ کو دوزخ کے کنارے دیکھا۔ کچھ دوزخیوں کو پابجولاں کھینچا جا رہا تھا۔ وہ بڑے ہی کرب و اذیّت اور خوف و حزن کی حالت میں تھے۔ وہ چلتے چلتے بیٹھ جاتے، پھر اُٹھتے اور دو قدم چلتے اور بے اختیار بیٹھنے لگتے تو بیٹھ نہ سکتے اور پھر اُٹھ کر چلنے کی کوشش کرتے۔ ان میں ایک میرا ہمسایہ اور آشنا بھی تھا۔ امیر باپ کا بیٹا تھا، نازو نعم میں پلا تھا، لیکن بُری صحبت نے اسے مجرم و سیاہ کار بنا دیا تھا۔ وہ مجسّم جرم و گناہ بن گیا تھا۔ اس عبرت ناک اور ترحّم انگیز حالت دیکھ کر میں تڑپ اُٹھا اور لرزہ براندام ہو گیا بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "اللہ تیرا شکر ہے کہ تُو نے مجھے دوزخ سے بچا لیا!" یہ نظارہ اس قدر بھیانک اور ہولناک تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر بعد تہجّد کی اذان کے رُوح پرور ربولوں سے فضا معمور ہو گئی۔ ہم نے جلدی سے وضو کیا اور حرم شریف

میں حاضر ہو گئے۔

سیرِ حضوری

آج میں نے پھر روضۂ اطہر کے سامنے حاضری دینے کا فیصلہ کیا۔ اہلِ جذب و شوق کی ایک جماعت وہاں درود و سلام میں مشغول تھی۔ ان کی آنکھیں پُرنم اور اشکبار تھیں۔ آہ و فغاں اور درود و سلام کی صدائیں ایک دلنشین و رُوح پرور ملکوتی نغمے کی صورت میں گونج رہی تھیں۔ نظرافروز روشنیوں سے مسجد کی تمام فضا بُقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ جونہی میں روضۂ اقدس کے سامنے حاضر ہوا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے آقا و مسیحا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے حضور کھڑا ہوں۔ محبّت کا اصرار تھا کہ آپؐ کے مبارک قدموں پر گر پڑوں اور شریعت کا تقاضا تھا کہ توحید کا پاس کروں اور شرک سے بچوں۔ مجھ پر ایک نامعلوم ہیبت طاری ہو گئی اور میرا دل پہلے کی طرح پھر نُور و جلالتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تاب نہ لا سکا۔ میں کانپنے لگا اور قریب تھا کہ میرا کلیجہ پھٹ جاتا اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑتا کہ ایک مردِ خدا نے مجھے سہارا دیا اور ہجومِ عشاق میں سے مجھے باہر نکال لے گئے، ریاض الجنّۃ میں پہنچ کر مجھے اشارے سے وہاں بیٹھنے کو کہا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ میری کیفیّت اُن پر آشکارا ہو چکی تھی۔ ان کی نگاہوں میں حسن و محبّت کا نُور اور چہرے پر طمانیّت و سُرور کی نزہت و شادابی تھی۔ فرمانے لگے:

"صاحبِ دید اور اہلِ جذب و شوق پر لازم ہے کہ وہ بغیر اِذن کے اس طرح حاضری نہ دیں۔ ان کا یہاں آنا اور بیٹھنا ہی حاضری ہے۔"

اعجازِ حرمین شریفین

حرمین شریفین کا ایک اعجاز یہ ہے کہ وہاں جا کر قلب میں ایک ایمان افروز تغیّر رونما ہوتا ہے اور انسان اپنے آپ کو مومن محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس سچّا ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں ہر دم اللہ تعالیٰ کے نُور و حُسن کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ نیز وہاں ملائکہ کا نزول

ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور آپؐ پر درود و سلام بھیجتے رہتے ہیں۔ ایسے مقدّس و اُلوہی ماحول میں اگر قلب پر مُہر نہ لگ چکی ہو تو وہ ایمان و نُور سے منوّر ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ قلب طمانیّت و سکینت محسوس کرتا ہے اور اس میں اپنے اِلٰہ و ربّ کی محبّت بیدار ہو جاتی ہے۔ صرف وہ بدنصیب نورِ ایمان سے سے محروم رہتے ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے اور ان پر مہر لگ چکی ہوتی ہے۔ انھیں اپنی بیماریِ قلب کا علاج کرانا اور اس بیماری کو مہلک سمجھنا چاہیے۔ حُسن و نُور سے محرومِ دل اندھا ہوتا ہے اور اندھے دل والے لوگ آخرت میں بھی اندھے اُٹھیں گے اور دوزخ میں جائیں گے، جہاں وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کے حُسنِ صورت کا دیدار نہیں کر سکیں گے، اور نہ انھیں اس سے ہمکلامی کی سعادت ہی نصیب ہوگی۔ انسان کو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا کہ یہ کتنی اذیّت ناک و روح فرسا، کتنی عبرت ناک و حسرت انگیز محرومی و نامرادی اور کتنا بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

پُراسرار مشاہدات

وادیِ اُحد میرے نزدیک تاریخی اعتبار سے اس سے بہت زیادہ اہم ہے جتنا کہ اسے عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ یہاں دو عظیم اور دُور رس نتائج کی حامل جنگیں لڑی گئیں، جن میں کفّار و یہود اور منافقین کو اپنے مقاصد میں ناکامی ہوئی اور انھیں بے نیلِ مرام لوٹنا پڑا تھا۔ جنگِ احزاب یا جنگِ خندق کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے یہود و کُفّار اور منافقین کے اِتّحاد کا شیرازہ اس طرح منتشر کر دیا کہ وہ پھر نہ تو متّحد ہو سکے اور نہ جارحیّت کے قابل ہی رہے۔ میں اس وادی کو دیکھنے دوبارہ گیا۔ وادی خاموش تھی اور سنگلاخ پہاڑیوں پر پُراسرار سا سکوت طاری تھا۔ میں دُور نکل گیا اور اس گڑھے کو ڈھونڈھنے لگا، جس میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم مجاہدین کی قیادت کرتے گر پڑے تھے اور آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے تھے۔

اس گڑھے میں آپؐ کا خونِ مبارک گرا تھا۔ جہاں سیّدالمرسلین صلّی اللہ وآلہٖ وسلّم کا خونِ مبارک گرا ہو وہ زمین کتنی مقدّس ومطہر اور رشکِ فردوسِ بریں ہو گی، بشر اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ میں اس قابل تو نہ تھا، لیکن عالمِ جذب ومستی میں اِدھر اُدھر گھومتا، اور سُونگھتا رہا کہ دل نے ایک آواز سُنی " بائیں جانب چلو۔ دُور اُس جھاڑی کے نیچے وہ مقدس گڑھا ہے۔"

آواز پُراسرار بھی تھی اور طرب انگیز بھی۔ میں والہانہ شوق کے ساتھ بائیں جانب چلنے لگا اور جھاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے پاؤں سے جُوتا اُتار دیا اور جھاڑی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہاں گڑھا تو نہ تھا، البتّہ وہ جگہ پُراسرار ضرور تھی۔ میں نے جھاڑی کے نیچے ایک بڑے سے سنگریزے سے زمین کھودنی شروع کی اور کھودتا چلا گیا۔ زمین نرم تھی، کچھ دیر بعد مجھے مٹّی میں ہلکی سی سُرخی دکھائی دی۔ میں نے اسے سُونگھا تو وہ مشکبار تھی، جس سے مشامِ جان معطّر ہو گئی۔ دل میں ندا آئی " یہ خونِ مقدّس ومطّہر کی خوشبو ہے اور یہ مقدّس جگہ اس کی امین ہے اور اس کا درجہ فردوسِ بریں سے بھی ارفع ہے۔ یہاں آپؐ کے جاں نثاروں کا پاک لہو بھی ہے۔ یہ وادی شہیدوں کے لہو سے بھی مزیّن ہے، اس لیے یہ رشکِ جناں ہے۔"

دفعتاً میں نے دیکھا کہ وادیِ اُحد کا ایک حصّہ لعل وگوہر سے مزیّن ہے اور ایک جگہ سے سُرخ رنگ کی شعاعیں نکل رہی ہیں، کسی نے دل سے کہا " یہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت گاہ ہے۔" یہ منظر میں چشمِ قلب سے دیکھ رہا تھا۔ اس مقدّس گڑھے اور وادیِ مُقدّس سے عطر بیز ہواؤں کے جھونکے آرہے تھے اور میں عالمِ جذب و مستی میں گڑھے کے کنارے بیٹھا رہا۔ اس عالم میں بڑی ہی پُراسرار چیزیں نظر آئیں۔ یہ مناظر دیکھتے جیسے صدیاں گزر گئی تھیں، لیکن ہوش آیا اور میں گھڑی دیکھی تو وہاں بیٹھے ابھی ایک گھنٹا ہی ہوا تھا۔ میں نے اس خاکِ بہشت بریں کو بار بار سُونگھا، آنکھوں سے

لگایا چہرے پر ملا، بالوں میں ڈالا اور بادل ناخواستہ لوٹنے لگا تو درود و سلام پڑھا، آپؐ سمیت شہیدوں کو سلام کیا اور گاڑی کی طرف لوٹ آیا۔

مجھ پر اب بھی جذب و مستی کی کیفیت طاری تھی۔ میں اسی عالم میں جا رہا تھا کہ میری نظر ایک پہاڑی پر جم گئی۔ غیب سے ایک آوازِ فردوس گوش بن کر دل میں آئی کہ یہی پہاڑی ہے جہاں مجاہدین کے عظیم سپہ سالار سیّد المرسلین اور رحمۃ للعالمینؐ نے پناہ لی تھی اور اپنے منتشر لشکر کو مجتمع کر کے ان کی از سرِ نو صف بندی کی تھی، جسے دیکھ کر کفّار کو نہ تو حملے کی جرأت ہوئی اور نہ وہ میدانِ جنگ ہی میں ٹھہر سکے، بلکہ انھیں مایوس و ناکام لوٹنا پڑا۔ مجھے اس پہاڑی پر چودہ صدیوں پہلے کا وہ منظر دکھائی دیا۔ اس عالم میں زمان و مکان کا احساس نہیں رہتا اور نہ رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے میں سچ مچ وہاں موجود ہوں اور حقیقی مناظر دیکھ رہا ہوں۔ یہ بڑا ہی حیرت انگیز، پُراسرار اور عجیب و غریب تجربہ و مشاہدہ تھا۔ ان تجربات و مشاہدات سے گزر کر ہی اہلِ جذب و شوق ان کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ میں اس عالم سے نکل کر اپنے آپ میں آیا تو زبان سے بے ساختہ نکلا:

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا (التحریم ۶۶ : ۸)

اے ہمارے رب ہمارے نور کی ہمارے لیے تکمیل کر دے اور ہمیں گناہوں سے محفوظ رکھ، اور بخش دے۔

. . . شب جائیکہ من بودم

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیبہ "پیغمبرِ اعظم و آخرؐ" لکھنے کے دوران تقریباً ہر روز مجھے ایسے مشاہدات و تجربات ہوا کرتے تھے، لیکن آج کے مشاہدات و تجربات کی کیفیت کچھ اور ہی تھی، جس نے مجھے مسحور کر دیا۔ میں ایک سحر انگیز و سُرور و کیف کی حالت میں لوٹا، ہوٹل میں آ کر بستر پر دراز ہو گیا اور گزرے ہوئے مشاہدات و تجربات سے

کیف و سُرور حاصل کرنے لگا۔ پھر میں سبز گنبد دیکھنے لگا، جو میرے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان، دل کی ٹھنڈک اور رُوح کا سُرور تھا۔ دیکھتے دیکھتے مجھ پر استغراق و بے خودی کی کیفیّت چھا گئی، لیکن وجدان بیدار ہو گیا اور دل کی آنکھ کُھل گئی۔ میں اب روضۂ اطہر کے اندر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ وہاں زندگی، حُسن اور نُور و سُرور تھا۔ رُوح وہاں رہ جانے کے لیے تڑپنے لگی، دل مچلنے لگا اور نگاہِ قلب مسحور و حیرت زدہ ہو کر فردوسی نظاروں میں گم ہو گئی۔ مجھے ناگہاں شمعِ بزمِ حُسن و نُور حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بائیں جانب ذرا اُوپر کی طرف ایک غیر مرئی ہستی کی موجودگی کا احساس ہوا، جہاں سے بے مثال حُسن و نُور کی ضیا پاشیاں ہو رہی تھیں، معًا میرے اندر سے ایک وجد آفریں صدا آئی:

خُدا خود میرِ مجلس بُود شب جائیکہ من بُودم

مجھ پر زندگی، حُسن و سُرور اور صدق و نُور کے وہ اسرار منکشف ہوئے، جن سے میں پہلے آگاہ نہ تھا۔ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پیکرِ حُسن و نُور اور مجسّم طمانیّت و سُرور ہونے کے باوجود کچھ سنجیدہ سے دکھائی دیے۔ آپؐ کی اس سنجیدگی کا راز معلوم کرنے کی مجھ میں طلب و جستجو پیدا ہوئی۔ ایک بہت ہی دھیمی مگر صاف آواز آئی "مسلمان لذّتِ ایمان و تقویٰ سے کم آشنا اور خوابیدہ ہیں، جبکہ یہود و نصاریٰ اور کفّار و مشرکین چاق و چوبند اور انہیں ہلاک و برباد کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ مسلمانوں میں تشتّت و افتراق ہے اور ان کے دشمن متحد ہیں۔ توحید و ایمان کے مدّعی شرک و بُت پرستی اور ظُلم و جہل کے سبب ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر وہ نہ سنبھلے تو ہلاکت و بربادی کے دوزخ میں گرنا ان کا مقدّر بن جائے گا۔ اگر اُنھوں نے غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ جلّ شانہٗ کو اپنا اِلٰہ و ربّ نہ بنایا اور اس کی رسّی کو مضبوطی سے نہ پکڑا تو وہ عذابِ الٰہی سے بچ نہیں سکیں گے، اس امر کے باوجود کہ وہ بڑا ہی غفور و رحیم ہے۔" میں یہ سُن کر کانپ اُٹھا اور "اللہ اکبر" کی صدائے جلیل و دلنشین سے اس عالمِ ماوراء سے اپنی دُنیا میں لوٹ آیا۔

مردانِ خُدا

آج میں حرم شریف میں داخل ہوا تو اچانک میری نظر داہنی جانب ایک ستون کے قریب بیٹھے ہوئے بزرگوں پر پڑی، اور وہیں اٹک گئی۔ میں بے اختیار ان کی طرف لپکا۔ وہ چاروں جمال و جلال کے پیکر تھے۔ میں سلام کر کے ان کے قریب بیٹھ گیا۔ انھوں نے غور و حیرت کی نظروں سے میری طرف دیکھا اور مصافحہ کیا۔ پھر پُراسرار نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا، مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔ میری نظر نے بھی دل سے کچھ کہا اور پھر دل نے کہا " یہ سب اہلِ دید و سرور اور اللہ تعالیٰ کے پُراسرار بندے ہیں!" نماز کے بعد ان سے گفتگو کرنے کا عزم کیا۔ نماز کا وقت قریب ہوتے ہی اہلِ جذب و شوق کا تانتا بندھ گیا اور دیکھتے دیکھتے اندرونِ مسجد بھر گیا اور نمازی باہر برآمدوں میں جمع ہونے لگے۔ اتنے میں تکبیر ہوئی اور ہر رنگ و نسل کے لوگ ساتھ ساتھ صفوں میں کھڑے ہو گئے۔

نماز سے فارغ ہو کر نمازی مختلف دروازوں سے باہر نکلنے لگے، لیکن وہ بزرگ اس طرح بیٹھے رہے جیسے مراقبے کی حالت میں ہوں۔ وقت گزرتا گیا اور میں گفتگو کے لیے بے تاب کبھی درود شریف اور کبھی اسمِ اعظم پڑھتا، موقع کی تلاش میں رہا۔ اللہ اللہ کر کے سکوت ٹوٹا اور ایک بزرگ نے دوسروں سے ہولے سے کچھ کہا اور دوسروں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس بزرگ نے مجھ سے اپنی زبان میں کہا "پاکستانی ہو؟" میں نے خوش ہو کر کہا " الحمدللہ! میں پاکستانی ہوں، اور آپ؟" انھوں نے فرمایا " ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خُدائے ماست۔" پھر انھوں نے خود ہی فرمایا: "ہم اللہ تعالیٰ کے فقیر ہیں۔ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی زیارت اور حاضری کے لیے آئے ہیں۔" "کیا آپ کو شرفِ زیارت حاصل ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں۔" انھوں نے جواب دیا۔ "کیا آپ کو حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی ہے؟" "الحمدللہ! ہمیں حاضری کی سعادت بھی نصیب ہوئی ہے۔" "کیا آپ روضۂ اطہر کے سامنے حاضری

دیں گے؟" میں نے جسارت کر کے پوچھ لیا۔ "بغیر اذن کے نہیں"۔ انھوں نے فرمایا۔

دوسرے بزرگ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا "شکر کرو کہ تمھاری آرزوئے دید و حضوری تو پوری ہوئی۔ ہم نے تمھیں وادیٔ اُحد میں ان مقامات کو تلاش کرتے دیکھا تھا، جن کی ہمیں بھی طلب و جستجو تھی۔ تم پر حضورِ پُرنور صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی خاص نظرِ التفات ہے، اسی لیے تمھیں "تفسیرِ کبیر" یعنی حضورِ پاکؐ کی سیرتِ طیبّہ لکھنے پر مامور کیا گیا۔ فرشتوں کے ذریعے تمھارا سینہ شق کر کے تمھارے دل کو پاک و صاف کیا گیا۔ تمھاری چشمِ قلب کو روشن اور تمھارے سینے کو علم و حکمت سے معمور کر دیا۔ پھر تمھیں صاحبِ دید بنایا، مشاہدات سے نوازا اور اپنی بزمِ مبارک کی زیارت کرائی۔ تم نے آپؐ کی حیاتِ طیبّہ کے واقعات و غزوات کا مشاہدہ کیا۔ یہ سب کچھ آپؐ ہی کی نظرِ کرم کا صدقہ ہے۔ تم بھی بغیرِ اذن کے روضۂ اطہر کے سامنے حاضری نہیں دے سکتے۔"

پھر تیسرے بزرگ نے فرمایا "اگر تمھیں سیرتِ طیبّہ لکھنے پر مامور اور قلم عطا نہ کیا ہوتا تو تم یا تو مجذوب ہوتے یا ہماری طرح صحرا نورد۔ تمھیں یاد نہیں کہ اولیاء اللّٰہ کی بزمِ خاص میں تم سے کیا امتیازی سلوک ہوا تھا؟ یہ سب فیضانِ حضورِ پُرنور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ہے۔ تمھیں رویائے صادقہ میں موت دے کر پھر اس لیے زندہ کیا گیا تھا کہ تم قلم سے قرآنِ مجید کی خدمت اور اسلام کی تبلیغ کرو اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ لکھو جو سچ مچ قرآنِ مجید کی تفسیرِ کبیر ہے۔" میں بُت بنا ان کی حیرت انگیز باتیں سُنتا رہا۔

آخر میں چوتھے مردِ خُدا نے فرمایا "اللّٰہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر بجالاؤ کہ تمھارے لیے تمھارے اِلٰہ و ربّ اور اس کے حبیبؐ نے خلوت نشینی پسند فرمائی۔ تمھیں عقلِ سلیم تو عطا فرمائی مگر عقلِ عیّارہ نہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ لوگ تمھیں پہچان نہ

سکیں، اور تمھیں خلوت سے جلوت میں نہ لے آئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم قرب و حضور اور دید کی سعادت و نعمت سے محروم ہو جاتے۔ تم "اُن" کے نہیں اہلِ دُنیا کے دوست بن جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تم نہ سیرتِ طیبہ یعنی تفسیر کبیر لکھ سکتے اور نہ وہ تجربات و مشاہدات ہی کر سکتے جو تُم نے حرمین شریفین اور ان مقدس شہروں اور وادیوں میں کیے ہیں۔ لیکن ابھی تمھارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمھیں اپنے سفرِ حجاز کی داستانِ جذب و شوق لکھنی ہے، خاص کر رہ نوردانِ شوق کے لیے۔ اس سے عوام و خواص، اہلِ سلوک و فقر اور اصحابِ حُسن و سُرور سبھی مستفیض و لطف اندوز ہوں گے۔"

وہ سب خاموش ہو گئے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ یہ اشارہ رخصت و جُدائی کا تھا۔ میں بادلِ ناخواستہ اُٹھا، ان پُر اسرار بزرگوں کو سلام کر کے ہوٹل چلا آیا، اور بستر پر دراز ہو کر اللہ کے ان پُر اسرار بندوں کے متعلق سوچنے لگا۔ دل نے کہا " ایسے ہی بزرگ اہلِ دید و نظر، صاحبِ حُسن و سُرور اور اولیاء اللہ ہوتے ہیں۔

وہ گھر، وہ کوچہ و بازار کہاں؟

آج مغرب کی نماز کے بعد ہم نے مدینۂ منورہ کی سیر کی۔ بازار اور دکانیں بجلی کے قمقموں سے بُقعۂ نُور بنی ہوئی تھیں۔ دکانیں خریداروں سے بھری ہوئی تھیں۔ سڑکوں پر موٹر گاڑیاں قطار اندر قطار کھڑی بھی تھیں اور رواں دواں بھی تھیں۔ عالی شان عمارتوں، ہوٹلوں اور دکانوں نے مدینۂ منورہ کو جدید و نظر افروز بنا دیا ہے، لیکن میری نظریں چودہ سو سال پہلے کے مدینۂ منورہ کو ڈھونڈ رہی تھیں، جس کے اب آثار بھی باقی نہیں رہے۔ سب کچھ بدل چکا ہے۔ تغیر و تبدّل ہر چیز کی تقدیر ہے۔ مجھے اس حقیقت کا حق الیقین تھا اور ہے کہ زندگی اور کائنات ہر لحظہ بدل رہی ہے۔ کسی چیز کو ثبات و دوام نہیں، لیکن پھر بھی آرزو یہی تھی کہ میں مدینۃ النبیؐ کو دیکھوں۔ یہ آرزو خیالِ خام تھی، نہ پوری ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔

دل میں اس آرزو کے پیدا ہونے کا ایک سبب یہ تھا کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیبہ لکھتے وقت میں نے مکّہ مکرّمہ اور مدینۂ منوّرہ کا ایک ایک گوشہ بار بار دیکھا تھا، بلکہ کئی برس تک ہر روز دیکھتا رہا تھا۔ میں ان مقدّس شہروں میں آپؐ کی خدمتِ اقدس میں رہا تھا، جتنی مدّت آپؐ وہاں تشریف فرما رہے تھے۔ میں بھلا ان قدیم مقدّس شہروں کو کیسے بھلا سکتا تھا؟

حرم شریف کے باہر کی فضا مختلف تھی۔ اس میں کھو جائے تو آدمی دولتِ دل کھو دیتا ہے۔ جوہریوں کی دکانوں میں لعل و گوہر، الماس و زمرّد اور دیگر نادر قسم کے بیش بہا سچے پتھروں سے مزیّن زیورات دعوتِ نظّارہ دیتے تھے۔ بظاہر وہ جاذبِ نظر اور دلکش بھی تھے، لیکن اہلِ نظر کی نگاہوں میں وہ سنہرے ناگ اور دہکتے انگارے تھے۔ اہلِ دُنیا ان پر مرتے تھے جبکہ اہلِ فقر و نظر ان سے ہراساں و گریزاں تھے۔
مدینۂ منوّرہ اب آپؐ کے عہد کا شہر نہیں رہا تھا، لیکن وہ آپؐ کا شہر ہے اور قیامت تک آپؐ کا شہر رہے گا، اس لیے کہ آپؐ وہاں تشریف فرما ہیں۔ آپؐ ہی کے طفیل حرم شریف اولیاء اللہ اور ملائکہ کی آماجگاہ ہے اور اس میں حُسن و نُور اور طمانیت و سُرور کی بارانِ رحمت ہوتی رہتی ہے۔

شرک سے پاک فضائیں

حرمین شریفین کی فضائیں شرک و بت پرستی سے پاک و منزّہ اور محفوظ و مصئون ہیں۔ اسلام کی رُو سے شرک رُوح کا سرطان ہے جو ناقابلِ علاج مرض ہے۔ اس کے مریض کو دوزخ میں بھی شفا نصیب نہیں ہوتی اور اس میں جلنا، تڑپنا اور مر مر کر جینا اس کا مقدّر ہے۔ شرک تمام نیکیوں اور عبادات کو برباد کر دیتا ہے۔ حرمین شریفین میں توحید کی شمعیں فروزاں رہتی ہیں۔ جو ظالم و جاہل لوگ شرک کی پھونکوں سے شمعِ توحید بجھانے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کرتے ہیں، ان کے دل سیاہ اور اندھے ہو جاتے

ہیں، اور اگر وہ توبہ نہ کریں اور اپنی زندگی میں شمعِ توحید روشن نہ کریں تو وہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے، اسی لیے اسلام نے شرک کو ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہ قرار دیا ہے۔ اہلِ فقر، اہلِ جذب و شوق اور اہلِ حُسن و سُرور جو اولیاء اللہ ہوتے ہیں، شرک سے بے حد خوف زدہ اور گریزاں رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ شرک ناقابلِ علاج بیماری ہے اور اس کی سزا جہنّم کی اذیّت ناک، خوف بداماں اور یاس انگیز زندگی ہے۔ بُخل بھی قلب کی بیماری ہے، جس کا علاج دوزخ میں ہوتا ہے اور دوزخ کے عذاب کے ایک لمحے کے عوض صدیوں کا عیش و نشاط کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اہلِ جذب و شوق ان مقدّس شہروں میں چیزیں خریدنے کے لیے نہیں، دولتِ دل حاصل کرنے کی خاطر آتے ہیں۔ انھیں اپنے اِلٰہ و ربّ اور اس کے حبیب ﷺ کی محبّت کھینچ کر یہاں لاتی ہے۔ ان کا مقصود دید اور قرب و حضور ہوتا ہے۔ اس سے ان کی زندگی میں صِدق و حُسن اور جذب و سُرور پیدا ہوتا ہے۔ یہی غایتِ دین، مقصودِ زندگی اور منشائے الٰہی ہے۔

مٹّی کا حرم، سرچشمۂ توحید و رحمت

رات کے وقت خانۂ کعبہ کی طرح مسجدِ نبویؐ بھی خوشنما فانوسوں اور برقی قمقموں سے بُقعۂ نور بنی ہوتی ہے، اور یہ نظّارہ جنّتِ نگاہ ہوتا ہے۔ اہلِ نظر کے لیے ان روشنیوں میں ملکوتی نور و رنگ بھی ہوتا ہے اور ربِّ جمیل و جلیل کی حُسن پاشیاں بھی ہوتی ہیں، جو ماحول کو مقدّس و مطہّر، حسین و نظر افروز اور تسکین آفرین و سحر انگیز بنا دیتی ہیں۔ دل ان مناظر سے متأثّر تو ہوتا تھا، مگر خدا جانے اسے کیوں آب و گِل کی وہ سادہ و بصیرت افروز مسجدِ نبویؐ دیکھنے کی آرزو و جستجو تھی، جو نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے عہدِ مبارک میں تھی۔

میں نماز سے بہت پہلے وہاں حاضر ہو گیا اور اصحابِ صفّہؓ کے چبوترے

پھر یہ آرزو لیے مراقبے میں چلا گیا۔ مجھے دُنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہا۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ میں کچی مٹی کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ہُوں۔ وہ بظاہر خوبصورت تو اتنی نہ تھی مگر دل کو بے حد پیاری لگی۔ اس میں آنکھوں کی ٹھنڈک تھی اور رُوح اس پر فدا ہوئے جاتی تھی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی مسجدِ نبوی ﷺ ہے، جسے آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے تعمیر کیا تھا۔ اس کی بنیاد سچ اور تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔ اس کے تقدس پر فرشتوں کو بھی ناز تھا اور وہ ہر وقت ربِّ جلیل کی نظر میں رہتی تھی اور اس میں اس کے انوار و تجلیات کا ظہور ہوتا رہتا تھا، جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے۔ یہ مسجد اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم کی یونیورسٹی بھی تھی اور عدلیہ، انتظامیہ، تربیت گاہ کے علاوہ فوجی ہیڈ کوارٹر بھی تھی۔ یہ وہ مسجد تھی جس سے محبّت و رحمت، حُرّیت و اخوّت، علم و حکمت، ایمان و تقویٰ، عدل و احسان اور توحید کے آفتاب طلُوع ہوئے تھے، جن سے بنی نوعِ انسان آج بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ وہاں اہلِ جذب و شوق صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے چہرے نورانی، مطمئن اور شاداب تھے۔ وہ مضبوط و توانا اور جمال و جلال کے پیکر تھے۔ ان کا لباس معمولی کھدّر کا تھا، مگر ان کی شخصیت کی ہیبت و جلالت مرعوب کُن تھی۔ وہ یقیناً اصحابِ حُسن و سُرور اور اولیاء اللہ تھے۔ اہلِ صُفہ رضی اللہ عنہم درس و تدریس میں اور اہلِ فقر ذکرِ الٰہی میں مشغول تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بڑے اشتیاق سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی تشریف آوری کے منتظر تھے اور بار بار ان کی نظریں آپ ﷺ کے حجرۂ مبارک کی طرف اُٹھتی تھیں۔ دفعتاً آپ ﷺ اپنے حُجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے۔ پیکرِ حُسن و نور ﷺ کا چہرۂ مبارک مُتبسّم و شاداب، آنکھیں حُسن بار اور سراپا قیامت تھا۔ میں نے ابھی آپ ﷺ کو سیر ہو کر دیکھا بھی نہ تھا کہ تکبیر کی آواز سے ماضی سے حال میں پہنچ گیا۔

نظرِ کرم کی بات ہے

"وہ" اپنے بندوں کو انعام و اکرام دینے پر آتا ہے تو بے حساب دیتا ہے، وہ خدا اور کُل مخلوقات کا اِلٰہ و ربّ جو ہوا۔ اس کی نظرِ کرم ہو تو وہ دولتِ دل ملتی ہے کہ خود بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ یہ اس کی دین ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے، اس کی چشمِ باطن روشن اور اس کے نور کو زیادہ کرتا رہتا ہے، پھر اس پر حیات و کائنات کے اسرار آشکارا کرتا، حیاتِ اُخروی اور "الحیوان" (جنّت اور دوزخ وغیرہ) کے مشاہدات کراتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے اپنی دید سے نوازتا ہے۔ جب انسان کو اس حقیقت کا پہلے علم الیقین، پھر عین الیقین اور آخر میں حق الیقین ہو جاتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اِلٰہ و ربّ نہیں، اور کوئی ہستی بھی اس کے کاروبارِ خُدائی میں شریک نہیں اور نہ اس راز سے آگاہ ہے تو وہ سچّا موحّد بن جاتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ پھر اُسے مقامِ عبدیّت پر متمکّن کرتا ہے، اُسے صاحبِ حُسن و سُرور اور اپنا دوست بنا لیتا ہے۔ اسے عارف باللّٰہ اور ولی اللّٰہ کہتے ہیں۔

اِذنِ حضوری

اسرار کھلتے اور حجابات اُٹھتے گئے، مشاہدات ہوتے رہے اور روح نئے نئے تجربات سے گزرتی رہی، لیکن دو سعادتیں ابھی تک حاصل نہ ہو سکی تھیں: ایک تو اپنے اِلٰہ کے حُسنِ صورت کی دید نہ ہوئی تھی، اور دوسرے روضۂ اقدس کے سامنے حاضری کا اِذن نہ ملا تھا۔ اس میں کیا حکمت تھی؟ "اُس" کی باتیں وہی جانتا ہے۔ شکر صد شکر ہے کہ مجھے اپنے آقائے نامدار صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے صحابۂ کرام رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہم کی جو آپؐ کی مجالس میں تھے، زیارت کی سعادت نصیب ہوتی رہی۔ ملائکہ کو دیکھا، اپنے اِلٰہ کی حُسن پاشیوں اور انوار و تجلّیات کا نظّارہ کیا، اس کے دوستوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ سب انعام و اکرام ہوتے رہے اور ادھر رُخصت ہونے کا وقت قریب

آ گیا۔ جدائی کا تصور سوہانِ روح تھا۔

"پھر روضۂ اطہر کی زیارت سے آنکھوں کی ٹھنڈک حاصل کرنے کا موقع ملے گا یا نہیں؟ یہ سب کچھ دیکھنے اور دولتِ دل لوٹنے کی اجازت ملے گی یا نہیں؟ زندگی کا کیا بھروسہ؟ پھر وہ خدائے ذوالجلال بے نیاز ہے اور میں بندۂ حقیر و ناچیز ہوں۔" یہ سوچتا تو دل اُداس اور رُوح مضطرب و بے قرار ہو جاتی۔ وقت پر کسے اختیار ہے؟ وہ گزرتا گیا، ہجر و فراق کے تصور سے سوز و مستی میں اضافہ ہوتا گیا، نماز و مراقبہ میں حضور و سُرور کی لذتیں بڑھتی گئیں، لیکن نہ اِذن ملا اور نہ حاضری دینے کی ہمت ہوئی۔ دل کو اس کا رنج و ملال تھا کہ کسی نے اس سے کہا "یہ مقامِ تسلیم و رضا ہے۔ اسی پر قائم رہو۔" روح نے کہا "یہ سچ ہے۔" اس سے دل کو قرار آ گیا۔

روضۂ اطہر کا ایک اندرونی منظر

اسی روز مغرب کے وقت میں روضۂ اطہر کے عقب میں اس کے متصل اصحابِ صفہؓ کے چبوترے پر بیٹھا ذکرِ الٰہی کرنے اور درود و سلام پڑھنے میں مشغول تھا، لیکن میری نظریں اندر مزارِ مبارکﷺ پر مرکوز تھیں۔ گو اندر بظاہر تاریکی تھی، لیکن میں اسے صاف دیکھ رہا تھا۔ معاً میرے دل میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ میں اندر جاؤں، مزارِ مبارک سے لپٹ کر خوب آہ و فغان اور گریہ زاری کروں، اور خاکِ پاک کو آنکھوں سے لگاؤں، اس سے تیمم کروں اور ہمیشہ کے لیے مطہر ہو جاؤں۔ لیکن کسی کو اندر جانے کی نہ اجازت تھی اور نہ ایسی کوئی صورت ہی نظر آتی تھی۔

میں نے سجدے میں گر کر خوب دُعا مانگی اور اسی عالم میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں روضۂ اطہر کے اندر حاضر ہوں۔ میں چودہ سو سال پہلے کے حجرۂ مبارک میں تھا۔ میں سلام کر کے درود شریف پڑھنے لگا، اگرچہ عالمِ جذب و مستی میں تھا، مگر پھر بھی کانپنے لگا، اور اسی حالت میں مرقدِ مبارک سے لپٹ گیا، اسے جی بھر کے چوما اور معطر و مطہر

خاکِ مرقد کو آنکھوں سے لگایا، چہرے پر ملا، سر پر ڈالا اور بدن پر ملا۔ گویا خاکِ پاک سے غسل کیا۔ پھر حجرۂ مبارک کے ایک ایک گوشے کو بوسہ دیا۔ حجرۂ مبارک معطّر و منوّر تھا۔ روشنی اگر سُرور انگیز و مسحور کُن تھی تو خوشبو جانفزا و سحر انگیز۔ مجھے حجرۂ مبارک کی تنگی پر تعجّب ہوا تو دفعتاً میں نے دیکھا کہ حدِّ نگاہ تک وسیع و عریض اور حسین و نظر افروز باغ میں ایک عجوبۂ روزگار محل میں ہوں جو سونے چاندی اور لعل و الماس اور زمرد و عقیق ایسے سچّے پتّھروں سے بنا ہوا تھا۔ وہاں اس اس قسم کے پھول، اشجار، نہریں اور طیور تھے کہ بشر ان کی خوبصورتی اور دلکشی و نظر افروزی کا تصوّر تک نہیں کر سکتا۔ وہ فردوسِ بریں کا ایک قطعہ تھا، جو میرے لیے مجسّم حُسن و سحرِ مقدّس تھا۔ وہ قلب و نگاہ کی ٹھنڈک اور رُوح کا سُرور تھا۔ ذرا دُور ایک درخت کے نیچے حضورِ اکرم صلّی اللّٰہ و آلہٖ وسلّم حسین و نادر تکیے سے ٹیک لگائے ایک تختِ مرصّع پر تشریف فرما تھے۔ چہرۂ مبارک چودھویں کے چاند سے زیادہ روشن و حسین تھا۔ آپؐ کے قریب بڑے ہی حسین اور پیارے بچّے کھیل رہے تھے۔ آپؐ انھیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں فردوسِ بریں اور اس کی حسین و سحر انگیز چیزوں کے بجائے آپؐ ہی کو دیکھتا رہا۔ میری نظریں آپؐ کے حُسنِ صورت و قامت سے اس قدر مسحور ہوئیں کہ وہیں مرتکز ہو کر رہ گئیں۔

دل ابھی سیر نہ ہوا تھا کہ مؤذن کی صدائے اللّٰہ اکبر مجھے اس عالم سے نکال کر حرم شریف میں لے آئی۔ نمازِ عالمِ شاہدیّت میں ہوئی اور ایسا سُرور ملا کہ رُوح پر جذب و مستی کی کیفیّت طاری ہو گئی۔

رقصِ طیور میں جلوۂ ”دوست“

فجر اور عصر کی نماز کے بعد چڑیوں کو دانہ دُنکا ڈالنا میری عادت تھی۔ مجھے اس میں کیف و سُرور ملتا تھا۔ ایک دن میں دانہ ڈال کر چڑیوں کو پھدکتے، چہچہاتے،

دانہ کھاتے اور رقص کرتے دیکھنے لگا۔ مجھے یہ نظّارہ بہت ہی حسین و دلکش لگا۔ میں اسے دیکھنے میں محو تھا کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہاں ایک ماورائی و غیر مرئی ہستی موجود ہے۔ وہ ایک انتہائی حسین و سرور انگیز نظّارہ تھا، جو مرئی بھی تھا اور غیر مرئی بھی۔ وہ ہستی کون تھی؟ رُوح نے کہا "یہ ہمارا اِلٰہ و رب ہے"۔ میں اکثر یہ نظّارہ دیکھا کرتا تھا اور یہ میرا محبوب مشغلہ تھا۔ یہاں بھی مجھے یہ نظّارہ دیکھنے کی طلب و جستجو ہوئی۔ میں نے دانہ لیا، حرم شریف کے کبوتروں کو ڈالا اور تماشا دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہی حسین و نورانی پرچھائیں نظر آئی جو مرئی بھی تھی اور غیر مرئی بھی، اور رُوح وفورِ طرب سے رقص کرنے لگی۔ دل حمد و ثنا کے گیت گانے لگا اور میں ایک عالمِ جذب و مستی میں خُدا جانے کب تک وہ نظّارہ دیکھتا رہا۔ لوگ مجھے اس حالت میں دیکھ کر خُدا جانے کیا سمجھتے ہوں گے! یہی نا کہ میں کبوتروں کو دیکھ رہا ہوں، حالانکہ میں دیدِ "دوست" میں محو تھا۔ اہلِ دنیا نہ اس تجربے سے گزرتے ہیں اور نہ جذب و شوق اور دید و لقائے "دوست" کی کیفیت کو سمجھتے ہیں۔ بڑے ہی مبارک تھے وہ دن۔ ہر دن روزِ عید اور ہر رات شبِ قدر تھی۔ آہ رسا، دعا مستجاب، نظر دیدِ "دوست" سے فیضیاب اور روح لذّتِ قُرب و حضور سے آشنا تھی۔

آغازِ ایّامِ جُدائی

اب ہمارے رُخصت ہونے کا ایک دن باقی تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے جنّت سے نکالا جا رہا ہے۔ حرمین شریفین جنّت نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟ اہلِ جذب و شوق کے نزدیک تو وہ فردوس بریں سے بھی بڑھ کر ہیں، کیونکہ یہاں قُرب و حضور اور دیدِ "دوست"، کی مسحور کُن مسرّتوں اور کیف و سُرور کے علاوہ جذب و مستی، آہ و فغاں اور نالہ و گریہ کا رُوح پرور سوز بھی ملتا ہے۔ یہ سوز، رُوح کے نُور کے ارتقائے مدام کی توانائی ہے۔ دونوں حرم شریف

امن و سلامتی اور حُسن و سُرور کے بہشت ہیں۔ دونوں انوار و تجلّیات کے مرکز اور ملائکہ کی آماجگاہ ہیں۔ یہ اہلِ جذب و شوق، اصحابِ حُسن و سُرور اور اہلِ فقر کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ قلبِ منوّر و بینا ہو تو یہ واقعی فردوسِ بریں ہیں۔

کڑی : ۱۹

آخری دِن کی داستان

مدینۂ منوّرہ میں یہ ہمارا آخری دن تھا۔ کل صبح سے ہجر و فراق کا زمانہ شروع ہونے والا تھا۔ ہم اِس تصوّر سے اداس و رنجیدہ تھے کہ زندگی میں ہمیں یہ مبارک موقع پھر ملے گا یا نہیں۔ بہر حال، ہم تہجّد کے وقت حرم شریف میں پہنچے تو بیگم صاحبہ کو جاتے ہی روضۂ اطہر پر حاضری کا موقع مل گیا، لیکن مجھے بغیر اذن کے حاضری دینے کا یارا نہ تھا۔ میں بے بس تھا، اور دل حاضری کے لیے بے تاب و بے قرار تھا۔ مجھے ریاض الجنّۃ میں جگہ مل گئی۔ تہجّد کی نماز پڑھ کر میں درود شریف پڑھنے اور روضۂ اطہر دیکھنے میں محو ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹنے لگا اور اس میں ملگجی روشنی نمودار ہونے لگی۔ پھر ملکوتی ہستیوں کی پرچھائیں نظر آنے لگیں۔ رنگ و نور کی فضا بتدریج خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی۔ اس میں مقدّس خاموشی تھی۔ ناگہاں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خاموشی میں ملکوتی ترنّم ہے اور یہ ترنّم درود شریف کی روح تھی، جو میری روح سے ہم آہنگ ہو کر اسے مسحور کر گئی۔ یہ بڑا ہی کیف پرور اور مسرّت آگین تجربہ تھا۔ دل چاہتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم جائے اور میں بے صوت ملکوتی نغموں کو سنتا اور ماورائی منظرِ جنّت نگاہ کو دیکھتا رہوں، لیکن گردشِ زمانہ کہاں رُکتی ہے؟ فجر کی اذان ہوئی تو یہ مشاہدہ و تجربہ بھی ختم ہو گیا۔

مسجدِ قُبا میں مشاہدات و واردات

ناشتا کرنے کے بعد میں اکیلا گاڑی میں بیٹھ کر وادیِ اُحد کی

طرف نکل گیا۔ راستے میں ناگہاں میری نظر مسجدِ قُبا پر پڑی۔ عالمِ اسلام کی اس اوّلین مسجد میں دوگانہ پڑھنے کی خواہش ہوئی۔ میرے کہنے پر شوفر گاڑی وہاں لے گیا۔ مسجد کے اندر چند زائرین نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے عین منبر کے سامنے نیّت باندھی اور نماز پڑھنے لگا۔ سجدے میں گیا تو فردوسی خوشبو نے شامّہ کو معطّر و مسحور کر دیا۔ خُدا جانے میں کب تک سجدے میں پڑا رہا۔ دوسرے سجدے میں بھی میرے ساتھ یہی معاملہ ہوا۔ سجدے سے اُٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ دوسری رکعت میں سجدے میں گیا تو پھر مقدّس و مسحور کن فردوسی خوشبو کی لپیٹ آئی اور مشامِ جان کو معطّر کر گئی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی میں پھر سجدہ ریز ہو گیا، اور معطّر و وجد آفرین فضا میں مجھے فوراً ہی حضوری کی سعادت نصیب ہو گئی۔ میں شاہد بھی تھا اور مشہود بھی۔ حریمِ کبریا سے حُسن و نور کی لہریں نکل رہی تھیں اور ماحول میرے لیے حُسن و سُرور اور رنگ و نور کا مقدّس و مطّہر طلسم کدہ تھا۔ لذّتِ حضوری سے آشنا اہلِ حُسن و سُرور ہی جانتے ہیں کہ یہ کیفیت کیا ہوتی ہے؟ میں اپنے اِلٰہ کے حضور خُدا جانے کب تک سجدہ ریز رہا۔ اسی عالم میں اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجدِ قبا تعمیر کرنے میں مشغول ہیں، ملائکہ آپؐ پر درود و سلام پڑھ رہے ہیں، اور آپؐ کا اِلٰہ محوِ نظّارہ ہے۔ آپؐ کا جسمِ اطہر پسینے سے شرابور ہے اور مطہر پسینہ عطر بیز ہے اور اس سے بھینی بھینی روح پرور و مسحور کن خوشبو آ رہی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پسینے سے بھی ایک قسم کی دلآویز مہک آ رہی تھی۔ سرورِ کونین اور سیّد المرسلین صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم ایک مزدور کی طرح کام کر رہے تھے۔ مقصود محنت کی عظمت و اہمیّت اور قیادت کی حقیقت کو واضح کرنا تھا، ورنہ آپؐ کے جاں نثار کب آپؐ کو یہ محنت و مشقّت کرتے دیکھ سکتے تھے۔ دل نے کہا: "قائد ہو تو ایسا ہو"

میں بظاہر سجدے میں تھا، لیکن حقیقت میں چودہ صدیاں پہلے کی دُنیا میں تھا۔ سب کچھ دیکھ رہا اور سُن رہا تھا، لیکن بول نہیں سکتا تھا۔ قوّتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ حضورِ پُر نور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے چہرۂ مبارک پر قطراتِ عرق سچّے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے، اور اس چمک میں سحر انگیز حُسن اور کیف پرور دلکشی و نظر افروزی تھی۔ آپؐ کا چہرۂ مبارک چاند سے زیادہ حسین و دلآویز اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامانِ بے مثال تھا۔ آپؐ کے رُفقائے کار روشن تاروں کی طرح آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ میں نے مسجد کو تعمیر ہوتے اور اس میں اصحابِ حُسن و سُرور کو نماز پڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر میری روح وفورِ طرب و سُرور سے جھُوم جھُوم اُٹھی کہ جہاں میں سربسجود ہوا تھا، وہ حضورِ پُر نور صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی سجدہ گاہ تھی، اسی لیے وہ معطّر جنّتِ ارضی تھی۔ وہ اتنی مقدّس و مطہّر ہے کہ ملائکہ بھی یقیناً وہاں سجدہ ریز ہونے کو اپنی سعادت سمجھتے ہوں گے۔ اللّٰہ جانتے ہیں حضورِ رسالت مآبؐ کے عہدِ مبارک میں کب تک رہا، لیکن جب میں اس عالم سے واپس اپنی دُنیا میں آیا تو خاصا وقت گزر چکا تھا۔

> دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

میں نے سجدے سے سر اُٹھایا ہی تھا کہ ایک صاحب لپک کر میری طرف آئے۔ وہ غالباً اس موقع کے منتظر تھے۔ علیک سلیک اور مصافحہ کر کے میرے پاس بیٹھ گئے۔ اہلِ فقر میں سے لگتے تھے اور بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے۔ وہ پاکستان کے شمالی علاقے کے مردِ کوہستانی تھے۔ میں نے نام اور پتا پوچھا تو وہ بڑی خوبی سے ٹال گئے۔ پھر ان کی باتوں میں ایسا کھویا کہ یہ پوچھنا یاد ہی نہ رہا، لیکن گفتگو کے دوران میں انھوں نے ایک دفعہ اپنے مرشد کی زبان سے اپنے آپ کو صمد گُل کہا تھا۔ وہ اُردو جانتے تھے، لیکن ان کا لب و لہجہ پختون تھا۔ صاحبِ جمال و جلال تھے۔ میرے اصرار پر انھوں نے اپنی رُوداد سُنائی۔

فرمایا :

"میں ایک غریب والدین کا بیٹا تھا۔ ہم کوہستانِ گوبل کے دامن میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ میں تقریباً پچھتّر برس کا ہوں۔ محنت و مشقّت اور جفاکشی کی بدولت جو کوہستانی زندگی کا خاصّہ ہے، میں اس عمر میں بھی مضبوط و توانا ہوں میلوں پیدل چل سکتا ہوں۔ میں حج اور عُمرے کے لیے آیا تھا۔ مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ کے مقدّس و تاریخی مقامات کی زیارت و سیر میں نے پیدل چل کر کی ہے۔"

وہ اچانک خاموش ہو گئے۔ میں نے پُوچھا: "آپ کو مقامِ ولایت کیسے حاصل ہوا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر گویا ہوئے "میری داستان سُن کر کیا کرو گے؟ میں نہیں جانتا کہ میں کس مقام پر ہُوں؟ کسی مقام پر ہُوں بھی یا نہیں؟ اللہ جلّ شانہٗ کی باتیں وہی جانتا ہے۔ وہ کرم کرے تو اور بات ہے، ورنہ بندہ کیا چیز ہے؟ میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا اور بڑھاپے کی اولاد تھا۔ میرے ماں باپ کی کئی اولادیں ہوئیں جو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ آخری عُمر میں میری پیدائش ہوئی۔ میں ماں باپ کا بُہت پیارا تھا، لیکن وہ اب عمر رسیدہ ہو گئے تھے، اس لیے مجھے مجبوراً بچپن ہی میں محنت و مشقّت کرنا پڑی۔ میری والدہ محترمہ بڑی صالحہ عورت تھیں، صوم و صلوٰۃ کی پابند، تہجّد گُذار اور مخیّر تھیں۔ اکثر فارغ وقت میں خود بھی تلاوتِ قرآن پاک کرتیں اور گاؤں کے بچّوں کو بھی قرآنِ مجید پڑھاتیں۔ مجھے اپنی ماں سے بہت پیار تھا، اور میں ان کی بڑی خدمت کرتا تھا۔ جو چیز بھی میں کھانے کے لیے لاتا، پہلے ماں کو کھلاتا اور پھر خود کھاتا۔ میں ہر کام میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا اور وہ بھی مجھ سے خوش تھے۔

انھی دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ہمارے گاؤں میں وارد ہوئے۔ ان کی میزبانی کا شرف ہمیں حاصل ہوا۔ صُبح ناشتے کے وقت انھوں نے مجھ سے فرمایا:

"گُل خان، موت کو کبھی نہ بھولنا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھنا اور جہاد کرنا۔" ان کی یہ نصیحت نقش کالحجر کی طرح میرے دل میں مرتسم ہوگئی۔ میں بھی اپنی ماں کی طرح صوم و صلوٰۃ کا پابند تھا۔ لوگوں کی خدمت کر کے مجھے بڑی راحت ملتی تھی۔ قرآنِ مجید سے مجھے عشق تھا۔ کسی خوش الحان قاری سے قرآنِ مجید اور خاص کر سورہ رحمٰن سُننے کی مجھے ہمیشہ طلب و جستجو رہتی تھی۔

"زندگی کو ثبات نہیں۔ ہر چیز تغیّرِ مدام کی اسیر ہے۔ دفعتاً میری زندگی میں انقلاب آیا۔ ایک دن میری ماں اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ صدمہ میرے لیے تقریباً ناقابلِ برداشت تھا۔ کئی روز خوب روتا اور صبر و طمانیّت کے لیے دُعا مانگتا رہا۔ ایک شام چھت پر اکیلا پڑا ہوا تھا کہ اونگھ آگئی۔ اس حالت میں سینے کے اندر میں نے ایک عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کی، جو جتنی شدید تھی اتنی ہی طمانیت بخش و سُرور انگیز بھی تھی۔ اس کی شدّت سے میری آنکھ کھُل گئی۔ دل اب بڑا ہی مطمئن تھا۔ چند ماہ بعد ناگہاں باپ انتقال کر گئے اور میں صدمے سے نڈھال ہوگیا۔ زندگی سے میرا دل اُچاٹ ہوگیا اور مجھ میں موت و حیات کی حقیقت معلوم کرنے کی طلب و جستجو پیدا ہوگئی۔

"کچھ عرصے بعد میں ڈیرہ غازی خان پہنچ گیا۔ ان دنوں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ مجھے اس بزرگ کی نصیحت یاد تھی کہ مجھے جہاد میں حصّہ لینا ہے۔ چنانچہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ دو تین مرتبہ قید بھی کاٹی۔ جیل میں مجھے اُردو سیکھنے کا موقع مل گیا اور میں اب ترجمے کے ساتھ قرآنِ کریم پڑھنے لگا۔ چند ماہ بعد میں نے تفسیر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ان مشاغل کے ساتھ میں محنت مزدوری کر کے گزر اوقات کرتا رہا۔ وقت گزرتا گیا۔ ایک دن میں کسی کام سے شہر سے دُور ایک گاؤں میں گیا۔ واپسی میں رات ہوگئی۔ میں گھوڑے پر سوار تھا اور پوری طرح مسلّح۔ راستہ تنگ اور رات تاریک تھی، لیکن ملگجی چاندنی کی وجہ سے راستہ ڈھونڈھنا

زیادہ دشوار نہ تھا۔ اچانک میں نے ایک خطرناک موڑ کاٹا تو میری مڈبھیڑ چار قبائلیوں سے ہو گئی، جو ایک نوجوان خوبرو دوشیزہ کو اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لڑکی کی منھ سے چیخ نکل گئی اور وہ "بچاؤ بچاؤ" پکارنے لگی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا اور میں نے بے اختیار اسے بچانے کا عزم کر لیا۔

"میں نے قبائلیوں کی بہت منّت سماجت کی کہ وہ لڑکی کو چھوڑ دیں، مگر وہ نہ مانے، بلکہ انھوں نے مجھے ہلاک کرنے کی بھی دھمکی دی۔ میں مصلحتاً خاموش ہو گیا اور انھیں راستہ دے دیا۔ ابھی وہ مڑے ہی تھے کہ میں نے ان پہ فائر کھول دیا۔ سب سے پہلے میں نے ان کے سردار کو گولی کا نشانہ بنایا، جو لڑکی کو گھوڑے پہ لیے جا رہا تھا۔ اس ناگہانی حملے کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ وہ سراسیمہ ہو گئے۔ میں اوٹ میں اور وہ کھلی سڑک پر تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ کا ان کا دل حریف نہ ہو سکا۔ وہ اپنے سردار کی نعش اور لڑکی کو چھوڑ کر بھاگ اٹھے۔ میں نے جلدی سے لڑکی کو اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور اسے سرپٹ دوڑاتا ہوا شہر آ گیا۔ رات اسے اپنی کوٹھڑی میں رکھا۔ ہم دونوں جوان اور اکیلے تھے۔ وہ میری ممنونِ احسان بھی تھی اور مجھے اپنا نجات دہندہ بھی سمجھتی تھی۔ میں نے اسے اپنی چارپائی پر سلایا اور خود ایک طرف کمبل بچھا کر فرش پہ لیٹ گیا۔ آدھی سے زیادہ رات گذر چکی تھی کہ شیطانی وسوسوں سے میں جاگ اُٹھا۔ وہ لڑکی بڑی ہی خوبصورت اور دل کش تھی۔ میں چارپائی کے قریب اس کے حسن و شباب سے کھیلنے کی سوچ رہا تھا کہ اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس طرح دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی۔ میری نظروں کی شیطنت دیکھ کر وہ اس قدر سہم گئی کہ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ میرا دل بھی اس کی معصومیت کا حریف نہ ہو سکا۔ چونکہ میرے اندر کا شیطان مجھ پہ غالب آ چکا تھا اس لیے مجھ میں دست درازی کرنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔ وہ میرے ارادے کو بھانپ چکی تھی،

جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی اور سکڑ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی، اور بڑی عاجزی و بیکسی سے بولی: "تم میرے بھائی ہو۔ تم نے میری عزّت بچائی ہے۔ خُدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔"

جمالیاتی لمحہ: جس نے میری کایا پلٹ کر دی

"خُدا اور بھائی کا نام سُن کر شیطان کافور ہو گیا، اور احساسِ ندامت سے میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ میں آپ اپنی نظروں میں ذلیل و حقیر ہو گیا۔ مجھ میں وہاں کھڑا رہنے کی طاقت نہ رہی۔ بڑی مشکل سے میری زبان سے یہ فقرہ نکل سکا: "بہن، مجھے معاف کر دو۔" یہ وہ جمالیاتی لمحہ تھا، جس نے میری زندگی کی کایا پلٹ کر دی۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمبل پر آ کر لیٹ گیا۔ بقیہ رات نہ وہ سو سکی اور نہ مجھے ہی نیند آئی۔ صبح کی اذان ہوئی تو میں مسجد میں گیا اور سچے دل سے توبہ کی۔ رات کو بھی توبہ کرتا اور روتا رہا تھا۔ میرے دل کو تسکین ہوئی۔ گھر آتے ہی میں نے تانگہ لیا اور اسے اس کے گھر چھوڑ آیا۔ لڑکی کو نہ میری کوٹھڑی کا پتا تھا اور نہ میرا نام ہی جانتی تھی۔ دن بھر میں اپنے دھندے میں لگا رہا۔ عشاء کی نماز پڑھتے ہی مجھے نیند نے آ لیا۔ اس رات میں نے ایک خواب دیکھا، جس نے میری زندگی کو ایمان، سچ اور تقویٰ سے معمور کر دیا، اور مجھے وہ بنا دیا جو میں اب ہوں۔

زیارتِ سیّد المرسلینؐ

وہ رات مجھے کبھی نہیں بھول سکتی، جس میں میرے مقدّر کا تارا چمک اُٹھا۔ حسبِ معمول ذکرِ الٰہی کرتے کرتے مجھے نیند آ گئی تھی۔ میں عالمِ خواب میں تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک بڑے ہی خوبصورت اور سرسبز شاداب باغ میں ہوں۔ نایاب و حسین اور رنگین و نظر افروز سچے پتھروں سے بنی ہوئی نہریں رواں دواں ہیں۔ باغ گلہائے رنگ رنگ، اشجارِ ثمردار اور سبزۂ سحر انگیز سے مزیّن ہے۔ رنگا رنگ اور خوشنما طیور کے سُریلے

نغمے مسحور کن ہیں۔ میں رنگ و نور اور جمال و جلال کے ان سحر انگیز نظاروں کو حیرت و مسرت سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً حضورِ پُرنور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم پر میری نظر پڑی۔ آپؐ مجسّم حُسن و نُور اور خوبصورتی و رعنائی، خوبی و دلربائی، دلکشی و جاذبیّت اور نوجوانی و نظر افروزی کی مثالی و سحر انگیز تصویر تھے۔ دل آپؐ کے جمال و جلال کی تاب نہ لاسکا۔ لیکن نظریں مسحور ہو کر آپؐ کے حُسنِ بے مثال پر فدا ہوتی رہیں۔ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر حُسنِ تبسّم جلوہ افروز تھا۔ آپؐ نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: "صمد گل! اپنے اِلٰہ و ربّ کا شکریہ ادا کر کہ اسے تیرا وہ فعل پسند آیا۔ اس نے تیرے سارے گناہ معاف کر دیے اور تجھے اپنے بندوں میں شامل کر لیا ہے۔"

مردِ خُدا آگاہ کی خدمت میں

"آپؐ کی آواز فردوسِ گوش اور رُوح پرور تھی۔ مجھ پر جذب و مستی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑتا کہ میری آنکھ کُھل گئی۔ دل میں وہ ٹھنڈک تھی، جس کی سُرور انگیز و وجد آفریں لذّت سے میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ میں نے گھر بار چھوڑ دیا اور جذب و مستی کے عالم میں خدا معلوم کہاں کہاں جہاں گردی کرتا رہا۔ ایک دن ایک مردِ خود آگاہ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ اہلِ فقر و نظر میں سے تھے۔ انھوں نے پیار سے مجھے گلے لگایا اور فرمایا: "جوان! ہوش میں آ۔" میں حالتِ سُکر سے حالتِ صحو میں آ گیا۔ پھر میں ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ وہ صاحبِ کشف و کرامت اور عالم و حکیم تھے۔ انھوں نے مجھے قرآنِ مجید کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا، احادیثِ طیّبہ کے حکیمانہ نکات سکھائے، میری تربیت کی اور مجھے صاحبِ نظر بنا دیا۔

تم کون ہو؟ تُم خود نہیں جانتے

"پندرہ برس بعد ان کا وصال ہوا تو میں حج اور عُمرے کے ارادے سے نکل پڑا۔ میں کس طرح مکّہ مکرّمہ پہنچا؟ راستے میں میرے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آئے؟

یہ ایک طویل داستان ہے، جسے سُن کر کیا کرو گے؟ بہر حال، حج کر کے مدینہ منورہ پہنچا تو یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ حج اور عُمرے کے علاوہ یہاں سے کہیں نہیں جاتا۔ میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں؟"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انھوں نے فرمایا: "لیکن تم نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا؟" "میں کیا ہوں؟ مجھے خود پتا نہیں۔" میں نے عرض کیا۔ "سچ ہے، تمھیں خود پتا نہیں کہ تم کون ہو اور کس مقام پر فائز ہو۔ زبان بند رکھو اور قلم چلاتے جاؤ۔ اللہ جلّ شانہ، بہتر کرے گا۔ لیکن یہاں سے جا کب رہے ہو؟" "کل صبح، انشاء اللہ العزیز۔" میں نے کہا۔ "مکہ مکرمہ پھر جانے کا ارادہ ہے؟" انھوں نے پوچھا۔ "ارادہ تو ہے، دُعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ایک بار پھر اپنا گھر دکھائے اور طواف کرنے کی ہمّت و توفیق عطا فرمائے۔" "تم بھی میرے لیے دُعا کرنا۔" انھوں نے فرمایا، اور خُدا حافظ کہہ کر اُٹھے۔ رخصت ہونے سے پہلے ہم نے معانقہ و مصافحہ کیا، محبّت بھری نظروں سے انھوں نے اور احترام و عقیدت بھری نگاہوں سے میں نے انھیں دیکھا، سلام کیا اور وہ رُخصت ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی مسجد سے نکلا۔ میں انھیں سواری کے لیے اپنی گاڑی کی پیش کش کرنا چاہتا تھا، مگر وہ پھر دکھائی نہ دیے۔ اللہ تعالیٰ کے اس پُر اسرار بندے سے مل کر مجھے بہت سے مابعد الطبیعی حقائق و اسرار اور معارف و رموزِ حیات و ممات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ لیکن میں کیا ہوں؟ یہ راز آج تک مجھ پر آشکارا نہ ہوا۔ ایک بزرگ نے بھی عرصہ ہوا مجھ سے کہا تھا "تم خود نہیں جانتے کہ تم کون ہو اور کیا کام سرانجام دے رہے ہو۔" میں نے سوچا اگر "دوست" کی یہی رضا ہے کہ میں نہ صرف دوسروں کی بلکہ اپنی نظروں سے بھی پوشیدہ رہوں، تو سرِ تسلیم خم کرنا ہی اولیٰ ہے۔

صلۂ جہاد و شہادت

میں نے ڈرائیور کو شہیدانِ اُحد کے قبرستان جانے کو کہا اور اس بزرگ کے متعلق سوچنے لگا۔ دُنیا کبھی اہلِ جذب و شوق، اہلِ دید و نظر اور اصحابِ حُسن و سُرور سے خالی نہیں رہتی۔ ان پُراسرار بندوں کے دم ہی سے زندگی کی رونق اور گلستانِ ہستی شاداب ہے۔ اُحد کے شہید بھی ایسے ہی پُراسرار بندے تھے۔ وہ سچ کی خاطر جان دے کر زندۂ جاوید بن گئے۔ وہ اہلِ مہر و وفا تھے، امتحانِ زندگی میں کامیاب نکلے اور اصحابِ حُسن و سُرور بن گئے۔ میں نے شہیدوں کو سلام کیا، فاتحہ پڑھی، اور پھر دیوار پھلانگ کر قبرستان کے اندر چلا گیا۔ اندر ہُو کا عالم تھا۔ شہیدوں کے جسم یہاں تھے، لیکن وہ خود اپنے الٰہ و ربّ کے پاس حُسن المآب میں کیف و سُرور اور لذّت و راحت کی زندگی گزار رہے تھے۔ جہاد، در اصل امتحانِ مہر و وفا ہے جس میں شہادت پانا، کامیابی کی علامت ہے، اور اس کا صلہ جنّت کی حیاتِ جاودانی کی صورت میں ملتا ہے۔ ان مجاہدوں نے اپنے خون سے گُلستانِ اسلام و انسانیت کو شاداب کیا تھا اور ان کا گلستانِ زندگی سرسبز و شاداب اور جنّتِ نگاہ ہے۔ کاش انسان یہ راز جانتا اور اس پر عمل کرتا۔

آنی و فانی زندگی دے کر فردوسِ بریں کی حیاتِ ابدی حاصل کرنا ہی غایتِ دین، مقصودِ زندگی اور مشیّتِ ایزدی ہے۔ یہ سودا اہلِ مہر و وفا ہی کرتے ہیں، جنھیں مجاہد کہتے ہیں۔ مجاہد کا مقصود شہادت ہوتا ہے۔ شہادت کا صلہ کیا ہے؟ دیدِ "دوست" ہی تو ہے، جو سب سے اعلیٰ، بے مثل اور غیر مترقبہ نعمت ہے۔ دیدِ "دوست" اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، رحمت اور محبت کی علامت ہے۔ یہ نعمتِ لازوال شہید کو فوراً ہی حاصل ہو جاتی ہے۔ میں شہیدوں کے درمیان گھوم رہا تھا کہ شاید کسی شاہدے کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اس توقّع کے ساتھ شہیدوں میں خاصا عرصہ ٹھہرا رہا، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ مشاہدہ "اُس" کی مرضی سے ہوتا ہے۔ بندے کا شیوہ

تسلیم و رضا ہونا چاہیے۔

خندق کی تلاش

جنّتِ شہداء سے نکل کر میں غزوۂ احزاب کی خندق تلاش کرتا دُور تک چلا گیا۔ اس کے کہیں کوئی آثار نہ تھے؛ لیکن ایک جگہ وجدانی طور سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہاں خندق ہے، میں ایک غیر مرئی خط کے ساتھ ساتھ دُور تک چلتا گیا، یہاں تک کہ ایک جگہ ایک پُراسرار بندۂ خدا نظر آیا۔ وہ بدوی سا لگتا تھا، لیکن اس کی آنکھیں روشن اور چہرے پر نُور کا ہالہ تھا۔ اس نے متجسّسانہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ میں کیا ڈھونڈھ رہا ہوں؟ میں نے کہا "خندق"۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا: "یہ خندق ہی کا خط ہے"۔ اس نے پھر ہاتھ کے اشارے سے اس کا محلِ وقوع بتایا، اور کہا "ریت کے طوفانوں، ہوا کے بگولوں اور سیلابوں نے خندق کو اس طرح پُر کر دیا ہے کہ اس کے آثار تک باقی نہیں رہے۔ کسی چیز کو قیام و دوام نہیں۔ کائنات، زندگی اور زمانہ سب بدل رہے ہیں۔ خود موت کو ثبات نہیں۔ وہ بھی فانی ہے۔ ایک روحِ انسانی ہے جو موت کا ذائقہ تو چکھتی ہے، مگر معدوم نہیں ہوتی۔ اسے موت کے بعد ہمیشہ رہنا ہے، چاہے اس کا مقام جنّت ہو یا جہنّم۔ آخرت میں موت نہیں ہوگی، لیکن زندگی درحقیقت صرف ان کی ہوگی جو اہلِ جنّت ہوں گے۔ زندگی کیا ہے؟ وہ حُسن و سُرور و نُور کا ایک حسین امتزاج اور شعور و احساس کا ایسا ہیولیٰ ہے، جس کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ اہلِ جہنّم کو نہ موت آئے گی اور نہ انھیں خالص زندگی ہی نصیب ہوگی۔ زندگی حُسن و صداقت سے معمور و منوّر ہو تو وہ جنّت کے قابل ہوتی ہے۔ اللہ اور اس کی مخلوق سے محبّت کرو، صرف اسی کے بندے، فقیر اور پرستار بن جاؤ۔ کسی پر ظلم نہ کرو، کسی کا استحصال نہ کرو، کسی کو زبان، آنکھ، ہاتھ وغیرہ سے نہ ستاؤ اور نہ نقصان ہی پہنچاؤ۔ اپنی خواہش کو

اپنا اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہ بناؤ۔ عدل و احسان تمہارا آئینِ زندگی ہونا چاہیے۔ مال و زر، منصب و اقتدار اور شہرت و زن کی ہوس انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ تکبّر انسان کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ شرک و بُت پرستی ناقابلِ معافی جُرم ہے۔ اس سے اس طرح ڈرو جس طرح لوگ سرطان کی بیماری سے ڈرتے ہیں۔ حُسن و محبّت اور صدق و اخلاص سے اپنی زندگی کو گوہرِ آبدار بناؤ اور اپنے اِلٰہ و ربّ کے منظورِ نظر بن جاؤ۔" میں حیرت و شوق سے اس کی باتیں سُن رہا تھا کہ اُس نے سلام کیا اور رُخصت ہو گیا۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے کوہِ اُحد اور اس کی وادی کو دیکھا، اور آہستہ آہستہ واپس اس جگہ پہنچ گیا، جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

شاید دل اُداس تھا، اس لیے فضا بھی اُداس محسوس ہو رہی تھی۔ شُہدآء کے قبرستان کے باہر کچھ عورتیں اور مرد تسبیحاں، کھجوریں وغیرہ بیچ رہے تھے، اور اس کے اندر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زائرین میں سے کچھ فاتحہ پڑھ رہے تھے اور کچھ خرید و فروخت میں مشغول تھے۔ دیارِ حبیب ؐ چھوڑنے کا غم تھا۔ پھر اس بات کا غم بھی مستزاد تھا کہ آنکھیں دیارِ حبیبؐ کو پھر دیکھ سکیں گی یا نہیں؟ یہ مناظر بارِ دگر فردوسِ نظر بن سکیں گے یا نہیں؟ اس غم کی کیفیّت وہی اہلِ عشق و وفا محسوس کر سکتے ہیں جو اس صبر آزما تجربے سے گزرے ہوں۔ میں نے شہیدوں کو ایک بار پھر سلام کہا اور ہوٹل لوٹ آیا۔

پھر فردوسِ قلب و نظر میں

چونکہ آج ہمارا مدینہؐ منوّرہ میں آخری دن تھا، اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے قراری بڑھتی جاتی تھی۔ ہم زیادہ سے زیادہ وقت حرمِ نبویؐ میں گزارنا چاہتے تھے۔ ظہر کی نماز سے پہلے ہی ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر ہمیشہ یہ محسوس ہوا جیسے

ہم حسن المآب میں آ گئے ہوں۔ فردوسی و نورانی منظر، روح پرور فضا، آقائے نامدار، ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت کا احساس، دل اس حسین و سرور انگیز ماحول میں مسحور ہو جاتا تھا۔ میں الوداعی سلام کہنے اور اذنِ رخصت مانگنے کی خاطر روضۂ اطہر پر حاضری دینے کے لیے بے قرار تھا، لیکن ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ "اہلِ جذب و شوق بغیر اذن کے حاضری نہیں دے سکتے۔ اس میں راز ہے!" یہ بات ان اہلِ حسن و سرور نے کہی تھی، جو مجھے یہاں ملے تھے، جن سے ملنا، ملاقاتِ مسیحا و خضر کے مترادف تھا۔ مجھے اصحابِ صفہ رض کے چبوترے پر جگہ مل گئی تھی، جو روضۂ اقدس سے ملحق ہے۔ وہاں کچھ اصحاب قرآنِ مجید کا مطالعہ اس انہماک اور ذوق و شوق سے کر رہے تھے کہ ان پر اصحابِ صفہ رض کا گمان ہوتا تھا، جو سچے طالبِ علم تھے، اور جنھیں قرآنِ مجید کے علوم و رموز سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں اہلِ علم و دانش تھے۔ وہ معلمِ انسانیت کے تلامذہ تھے اور انھیں قرآنِ حکیم سے عشق تھا، جو علم و حکمت کا زندۂ جاوید سرچشمہ ہے۔ قرآنِ حکیم ہی نے مسلمانوں کو بینا و بصیر اور عالم و حکیم بنایا اور زمانے کی قیادت انھیں تفویض کر دی تھی۔ میں دیر تک ان عاشقانِ قرآن کو اشتیاق و تجسس سے دیکھتا رہا، کیونکہ وہ مجھے بڑے ہی پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن نماز کے بعد انھوں نے بڑے تپاک سے مجھ سے مصافحہ کیا اور معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ بعض اوقات آنکھیں کتابِ دل کو بھی پڑھ لیتی ہیں اور آنکھوں آنکھوں میں دل کی باتیں جان لیتی ہیں۔ وہ یقیناً اصحابِ حسن و سرور، خود آگاہ و خدامست اور اہلِ جذب و شوق تھے۔

عصر کے وقت بھی وہ یہیں موجود تھے۔ مجھے پھر ان میں جگہ مل گئی۔ میں روضۂ پُرنور کے اندر تکتا رہا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا اُجالے میں بدلنے لگا۔ رنگ و نور کی ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی، جس کا نظارہ فردوسِ نظر اور روح کی ٹھنڈک تھا، اور

ٹھنڈک طمانیت نیز، سرور انگیز اور سحور کن تھی۔ ایک پُر کیف حُسن سے وہاں کی فضا مزین تھی۔ میں ان ملکوتی و فردوسی نظاروں میں محو تھا کہ اذان ہونے لگی اور میں اپنی دُنیا میں واپس آ گیا۔ نماز کے بعد نمازیوں کا ہجوم کم ہوا تو میں ان بزرگوں سے مخاطب ہوا: "مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔"

صاحبِ نظر نے کہا

انہوں نے متبسّم و پُراسرار نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر ایک بزرگ نے فرمایا: "اللہ اور موت کو یاد رکھنے والا زندۂ جاوید ہوتا ہے۔ علم و حکمت کی طلب و جستجو ہمیشہ رہنی چاہیے، تبلیغ کرتے رہنا چاہیے اور نتائج کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ایک اللہ کو اپنا اِلٰہ و ربّ بناؤ اور دُنیا سے بے نیاز ہو جاؤ۔ قلم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس کی حفاظت کرو اور اس کے لیے خامہ فرسائی کرتے رہو۔" وہ خاموش ہو گیا۔ ایک بزرگ نے دُوسروں سے میرے متعلّق آہستہ سے کچھ کہا، جسے میں سُن نہ سکا۔ ان میں سے ایک بزرگ نے مجھ سے پوچھا: "کب رُخصت ہونے کا ارادہ ہے؟"

"انشاء اللہ، کل صبح کے جہاز سے دمام جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"کیوں"؟ انھوں نے فرمایا۔

"اپنی بیٹی کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مکّہ مکرمہ جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں وہاں سے ہو تو آیا ہوں، لیکن وہاں پھر جانے اور طواف کرنے کی آرزو ہے۔"

"ہم مکّہ مکرّمہ جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ وہاں ہماری ملاقات ہوگی۔"

"قُرب و حضور، اور ہجر و فراق کا راز کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سِرّ الاسرار ہے۔ تم یہ راز نہیں جانتے، حالانکہ تم اس تجربے سے گزر رہے ہو۔

میں جانتا ہوں جو تم پوچھنا چاہتے ہو۔ مشاہدہ اپنی مرضی سے نہیں ہوتا۔ جب وہ چاہے تو کشف و شہود اور مشاہدہ و تجربہ ہوتا ہے۔ قرب و حضور کی سعادت کا انحصار بھی اس کی رضا پر ہوتا ہے۔ ہجر و فراق محبت کے لوازمات ہیں۔ ان سے سوزِ زندگی ملتا ہے، جس سے خودی میں محکمی و توانائی اور قوتِ پرواز پیدا ہوتی ہے۔ زندگی عبارت ہے حُسن و محبت اور سوز و ساز سے۔"

"ہمارا معاشرہ بُرائیوں سے بھرپور ہے۔ اس کی علتِ غائی کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"مسلمانوں نے کتاب و حکمت سے مُنھ موڑ لیا ہے۔ وہ قرآنِ مجید اور اُسوۂ حسنہ پر عمل نہیں کرتے، اس لیے وہ محسن اور سچے نہیں رہے۔ انھوں نے اللّٰہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا ہے۔ ان میں سے اکثر مال و دولت، منصب و اقتدار، شہرت و قوت اور اولاد و زن کی پرستش کرتے ہیں اور یہی ان کے الٰہ ہیں، لیکن انھیں اس امر کا شعور نہیں۔ وہ اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔ شرک کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں اور اسے عبادت سمجھتے ہیں۔ ایمان و توحید، عدل و احسان اور محبت و رحمت کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔"

دُوسرا بزرگ: "لوگوں نے خُدا اور موت کو فراموش کر دیا ہے۔ یادِ الٰہی سے سکینت و طمانیت ملتی اور دل میں محبت کا چشمہ پھُوٹتا ہے، جبکہ موت کی یاد سے دل میں خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح انسان متقی و محسن بنتا ہے۔"

تیسرا بزرگ: "مگر یہ باتیں کون سُنتا ہے؟ بہروں کو کون سُنا سکتا ہے؟ جو سُنتے بھی ہیں وہ بھی سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ دُنیا کو عذابِ الٰہی محیط ہے۔ مسلمانوں کے لیے صیہونیت عذابِ الٰہی کی ایک خوفناک شکل ہے، لیکن یہ آپس میں دست و گریبان ہیں، اور اس عذاب کا شعور بہت کم رکھتے ہیں۔"

پہلا بزرگ : "ظلم و شرک، کذب و منافقت، سود خوری و جذبۂ تکاثر، استحصال و کسبِ حرام، اکتنازِ و احتکار اور بخل و خود پرستی، جو معاشرے کی مہلک سرطانی بیماریاں ہیں، مسلمان ان میں مبتلا ہیں، اس لیے ذلت و مسکنت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن بہت کم اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں۔ انھیں زندہ خدا کی زندہ کتاب ہی زندہ کرسکتی اور انھیں پھر قیادتِ عالم تفویض کرسکتی ہے۔ قرآنِ پاک علم و حکمت، قوت و توانائی، حسن و نور اور حیات و رحمت کا سرچشمہ ہے۔ یہ سرچشمہ خود مسلمانوں نے بند کر رکھا ہے، اس لیے ان کی کشتِ زندگی ویران اور مردہ ہے۔ اسے صرف اسی سرچشمے سے دوبارہ زندہ کیا جاسکتا ہے۔ مسلمان یہ حقیقت اس وقت سمجھیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے جب ان پہ عذاب نازل ہوگا، لیکن اس وقت تک توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔"

تیسرا بزرگ : "ابلیس ہر جگہ انسان کی گھات میں رہتا ہے، اس کے جمالیاتی فریب سے ہر دم اور ہر جگہ بچنا چاہیے۔ انسان کو اپنی عبادت پہ ناز نہیں کرنا چاہیے اور نہ شیطان سے غافل ہی رہنا چاہیے۔ وہ انسان کو شرک و گناہ کی ترغیب دیتا رہتا ہے اور اس کی زندگی میں کھوٹ ملاتا رہتا ہے۔ اس کھوٹ کو دور کرنا ہی اصل میں تزکیۂ نفس ہے۔ تزکیہ سے زندگی سچی، نورانی اور حسین بنتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کو پیاری ہے۔ سو نہ محبت سے اپنا تزکیہ کرو اور زندگی کو سچی اور حسین بنالو۔ یہی غایتِ دین، یہی مقصودِ زندگی اور یہی مشیّتِ ایزدی ہے۔"

دوسرا بزرگ : "انسان کی محرومی و نامرادی کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔"

پہلا بزرگ: "عشقِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا حال پُلِ صراط کے مانند ہے۔ حدودِ عشق سے ایک قدم ادھر پڑا، اور انسان شرک کے جہنم میں گرا۔"

دوسرا بزرگ: "انسان خود نمائی کا جبلّی تقاضا رکھتا ہے، لیکن وہ اپنے بعض بندوں

کو خلوت میں رکھنا پسند کرتا ہے۔ اس میں کئی حکمتیں ہیں۔ محبت کو خلوت گزینی مستلزم ہے۔ قرب و دید کی لذتیں تنہائی میں سوا ملتی ہیں۔ اہلِ فقر جو اصحابِ حُسن و سُرور ہوتے ہیں، خلوت گزین ہوں تو بہتر ہے، اسی لیے وہ پُراسرار ہوتے ہیں۔"

"دُنیا، خصوصاً اپنے معاشرے کا کیا بنے گا؟" میں نے پُوچھا۔

تیسرا بزرگ: "یہ بات تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ عذابِ الٰہی شُدنی ہے۔ قرآنِ مجید بھی اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر رحم و کرم کرتا رہتا ہے، لیکن بندے خود اپنے آپ پر ظلم کرتے اور اس کی سزا بھگتتے رہتے ہیں۔ ربّ العزت کے قانونِ مکافاتِ عمل سے اقوام ہوں یا افراد، ہرگز بچ نہیں سکتے، لیکن اس حقیقت پر کم لوگ ہی ایمان رکھتے ہیں۔ قیامتِ صغریٰ قریب ہے۔ خوش نصیب و کامران ہیں وہ لوگ جو مومن اور سچے ہیں۔"

گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ایک اور بزرگ تشریف لے آئے، اور مجلس برخاست ہو گئی۔

جنّت البقیع

میں وہاں سے اُٹھ کر جنّت البقیع چلا گیا۔ دربان اور دو چار آدمیوں کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا۔ وہ بھی دروازے پر کھڑے اور بیٹھے تھے۔ میں آگے نکل گیا۔ پتھروں کے ڈھیر جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ اس جنّت صفت قبرستان میں صحابۂ کرامؓ، صحابیاتؓ، اُمّہات المومنینؓ اور بھی بزرگ ہستیاں مدفون ہیں۔ خاتونِ جنّت حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کی آخری آرامگاہ بھی یہیں ہے۔ چودہ سو برس سے یہاں تدفین کا سلسلہ جاری ہے۔ یہاں بھی قبریں بے نام سنگریزوں کے ڈھیر ہیں۔ یہ صدیقوں، شہیدوں اور صُلحا کے اجسامِ مطہر کی امین جگہ ہے، اسی لیے یہ یہ جنّت البقیع کہلاتی ہے۔ جنّت خود اہلِ جنّت کے نُور سے روشن ہوتی ہے، غالباً یہی وجہ ہے کہ یہاں چراغ نہیں جلائے جاتے، اور کسی کو شرک و قبر پرستی کی اجازت

نہیں۔ یہاں عورتوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔

میں مغرب کے قریب تک وہاں رہا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ اور فلسفۂ موت و حیات پر غور و فکر کرتا رہا۔ موت ہی اگر ہر انسان کا انجام ہے تو پھر وہ نشاط و تغافل میں مست اور مال و دولت جمع کرنے میں کیوں لگا رہتا ہے؟ اگر اسے سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے تو وہ جُرم و گُناہ اور ظلم و استحصال کیوں کرتا ہے؟ موت اسے کیوں یاد نہیں آتی؟ وہ محاسبے سے کیوں نہیں ڈرتا؟ میرے ذہن میں ایسے سوال پیدا ہوتے رہے اور میں ان کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

ان خیالات میں مستغرق تھا کہ کسی نے دل سے کہا: "اس کی وجۂ حقیقی یہ ہے کہ انسان جب اللہ کا بندہ نہیں رہتا تو شیطان کا بندہ بن جاتا ہے، اور جب وہ شیطان کا بندہ بن جاتا ہے تو تین چیزیں بُھلا دیتا ہے: خُدا، خودی اور موت۔ خُدا فراموشی، خود فراموشی اور موت فراموشی ایسی شراب تند و تیز ہے کہ اس کا نشّہ انسان کو ظالم و جاہل، سرکش و متکبر، مُجرم و گناہگار اور زیاں کار و عاقبت نااندیش بنا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بہرا، گونگا اور اندھا بن کر انسانیت کے ارفع و اکرم مقام سے پھسل کر حیوانیت کے تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے۔

"یاد رکھو! انسان کا شیطان جب تک مسلمان نہ ہو، وہ مسلمان نہیں بن سکتا۔ انسان کا کام اپنے شیطان کو مارنا نہیں، اُسے مسلمان بنانا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شیطان مرتا نہیں۔ انسان جب تک زندہ رہتا ہے، اس کا شیطان بھی زندہ رہتا ہے۔ نفسِ امّارہ بن کر خواہشیں پیدا کرنا اور خواہشوں کو چاہے وہ قبیح کیوں نہ ہوں، حسین بنا کر دکھانا اور ان کی تکمیل کرنے پر انسان کو اُکساتے رہنا شیطان کا کام ہے۔ شیطان کو عشق کے ذریعے مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔ عشق سے مراد عشقِ الٰہی اور اس کی مخلوقات خصوصاً بنی النوع انسان سے محبّت و احسان کرنا ہے۔

"سنو! سوزِ عشق سے انسان کے دل میں سعادت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے رحمت کے چشمے پھوٹتے ہیں، جو کِشتِ حیات کو سرسبز و شاداب اور بار آور بناتے ہیں۔ اسی طرح نورِ عشق سے اس کی باطنی آنکھ کھلتی اور روشن ہوتی ہے اور وہ اہلِ دیدِ نظر اور صاحبِ حُسن و سُرور بنتا ہے۔ عشق ہی سے انسان کے نورِ چشمِ باطن کی تکمیل ہوتی رہتی ہے، "یہاں" بھی اور "وہاں" بھی۔ زندگی کا مقصود اور دین کی غایت دیدِ "دوست" ہے۔ عشق ہو تو انسان کو یہ نعمتِ عظمیٰ میسّر آتی ہے اور "دوست" اسے مقامِ شاہدیّت پر فائز کرتا ہے، جو عبدیّت کا بلند ترین مقام ہے۔"

میں خدا جانے کس برگزیدہ و اہلِ جنّت ہستی کے مرقدِ بے نام پر بیٹھا، یہ ایمان افروز و حکمت آموز باتیں سُننے میں منہمک تھا کہ دربان نے قریب آ کر کہا: "نمازِ مغرب کا وقت قریب ہے۔ چلیے کہ قبرستان کا دروازہ بند کرنا ہے۔" اُس کی آواز سے میں چونک کر اُٹھا اور متبرک و برگزیدہ ہستیوں کی جنّت کو حسرت بھری نظروں اور نمناک آنکھوں سے دیکھتا ہوا باہر نکلنے لگا تو انھیں سلام کہا، آخری بار فاتحہ پڑھی، دُعا مانگی اور باہر نکل آیا۔

حرمِ شریف اور اجازتِ رُخصت و وداع

یہاں سے سیدھا حرمِ شریف پہنچا، جو ہر شام کی طرح انتہائی دیدہ زیب و بیش بہا فانوسوں اور برقی قمقموں کی دلکش روشنی اور انوار و تجلّیات سے منوّر تھا۔ حرمِ شریف کا اندرونی حصّہ اہلِ جذب و شوق سے بھر چکا تھا۔ مجھے باہر صحن کے داہنی جانب جگہ ملی۔ چونکہ آپؐ کے حرمِ شریف میں یہ میری آخری نمازِ مغرب تھی، شاید اس لیے آپؐ کی نظرِ کرم سے نماز میں لذّتِ حضوری سے بے حد سُرور آیا۔ نماز کے بعد رخصت لینے اور الوداعی سلام کہنے کے لیے روضۂ اطہر کے سامنے حاضری کے لیے گیا، سلام و درود پڑھا اور رُخصت و وداع کی اجازت مانگی۔

ہیبت و جلال سے میں آج بھی لرزہ براندام ہو گیا اور میرا دم گھٹنے لگا، لیکن دفعتاً دل نُورانی و سُرور انگیز ٹھنڈک سے معمور ہو گیا۔ ایک ناقابلِ بیان قلبی واردات کی بنا پر مجھے ایک تو اذنِ رخصت ملنے کا اور دوسرے حاضری کی قبولیت کا یقین ہو گیا۔ میں نے رخصت ہوتے ہی پہلے روضۂ اطہر کے اندر جھانکا تو ایسا منظر دیکھا کہ نگاہ و دل تابِ نظّارہ نہ لا سکے اور میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔

جُدائی کا اِحساس و غم

وقت بڑی سُرعت سے گزر گیا اور دیکھتے دیکھتے نمازِ عشاء کا وقت ہو گیا۔ حُسن و نُور اور کیف و سُرور کی فضا میں دل اُداس، رُوح غم زدہ اور آنکھیں پُرنم تھیں۔ اذان ہوئی، تکبیر ہوئی، پھر نماز ہوئی اور اس جنّتِ ارضی سے ہمیں رُخصت ہونا پڑا۔ میری بیگم بھی مغموم و افسردہ خاطر تھیں اور بار بار یہ جُملہ دہراتی تھیں: "خُدا معلوم ہمیں دوبارہ یہاں حاضری دینے کی سعادت نصیب ہو گی یا نہیں؟" وہ ہر روز کئی کئی بار روضۂ اطہر کے سامنے حاضری دیتی رہی تھیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھ کیا ماجرا ہُوا ہے؟ بہر حال، ہم دونوں حسرت بھری نظروں سے روضۂ اقدس اور حرم شریف کی حسین و پُر نور فضا کو دیکھتے رُخصت ہوئے۔ زندگی کے ایک حسین و ایمان افروز اور یادگار دَور کے گزرنے میں ایک رات باقی تھی۔ ہم ہوٹل پہنچے۔ بیگم نے کھانا منگوایا۔ وہ کھانا کھاتی رہیں اور میں گنبدِ خضراء کو تکتا رہا۔ وہی ملکوتی سائے حرم شریف پر منڈلاتے دکھائی دیے۔ میں یہ حیرت انگیز و روح پرور نظّارہ دیکھتا رہا، یہاں تک کہ نیند سے مغلوب ہو کر سو گیا۔

سیرتُ النبیؐ لکھنے کا حُکم

۱۹۸۳ء کا ذکر ہے۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب مجھے آقائے نامدار، ختمیِ مرتبت، سیّد المرسلین حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی رویائے صادقہ میں دو مرتبہ زیارت ہوئی تھی اور مجھے آپؐ نے "تفسیرِ کبیر" یا آپؐ کی سیرتِ طیبہ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ خواب

یہ تھا کہ میں ایک نہایت وسیع و عریض اور عظیم الشان مسجد کی ڈیوڑھی میں ایک بہت بڑے حوض کے قریب کھڑا ہوں اور میرا رُخ قبلے کی طرف ہے۔ یہ مسجد قریب قریب لاہور کی بادشاہی مسجد کے نمونے کی تھی۔ دفعتاً میری آنکھوں کے سامنے مسجد کے دالان کے آخری بائیں دروازے سے ایک پیکرِ حُسن و نُور جلوہ افگن ہوا۔ یہ محسنِ انسانیت، رحمۃ للعالمین پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم تھے۔ آپؐ کا چہرۂ مبارک مجھ بندۂ ناچیز کی طرف تھا۔ ناگہاں آپؐ نے اپنے گریبان کے اندر سے اپنا دستِ مبارک نکالا اور مجھے دکھایا، جو آفتابِ جہاں تاب سے زیادہ روشن و تابناک تھا۔ میں اس نُور کی کیفیت بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے قلب و نگاہ اس نظارے کی تاب نہ لا سکے۔ میں غش کھا کر فرش پر گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اسی عالم میں ایک شیریں و جاں آفریں آواز آئی: "اُٹھ ناصر! تفسیرِ کبیر پڑھ! اُٹھ ناصر! تفسیرِ کبیر لکھ!" میں زندہ و بیدار ہو گیا۔ دیکھا تو اپنے آقا و مسیحا صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مبارک قدموں میں پڑا ہوں۔ اِدھر میں اُٹھا، اُدھر میری آنکھ کھل گئی۔ دوسرے دن بعینہٖ یہی خواب آیا اور میں نے اپنی زندگی "تفسیرِ کبیر" لکھنے کی تیاری کے لیے وقف کر دی۔ اس مشاہدہ و تجربے سے مجھے اس حقیقت کا حق الیقین ہو گیا کہ

حُسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپؐ کے اعجازِ مسیحائیؐ کے اثرات

اس خواب کے بعد میری کایا پلٹ ہو گئی۔ عبادت میں قرب و حضور کی لذّت محسوس ہونے لگی اور میں قرآنِ مجید کے مطالب و مفاہیم اور اسرار و رموز معلوم کرنے میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔ ساتھ ساتھ احادیثِ طیّبہ اور آپؐ کی سیرتِ مقدّسہ کا مطالعہ بھی کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مجھے مشاہدات

ہونے لگے، جن کا ذکر یہاں بے محل ہوگا۔ صرف ایک مشاہدے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو امرتسر میں اکثر کرتا رہتا تھا۔ وہاں سے ہجرت کے بعد پھر یہ مشاہدہ نہ ہوا۔ برسوں کے بعد یہ مشاہدہ ایک بار پھر مدینۂ منوّرہ میں ہوا۔ موسم گرما میں ہم چھت پر کھلے آسمان کے نیچے سویا کرتے تھے۔ صبح کی اذان سے پہلے میری آنکھ کھل جاتی اور میں اس سہانے اور ملگجے سماں میں کیا دیکھتا کہ جنوب کی طرف سے ایک پرندنما وجود اڑتا ہوا آتا اور ہمارے اوپر سے گزر کر شمال کی جانب چلا جاتا۔ مجھے اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ صاف سنائی دیتی اور اس دیوہیکل وجود کی پرچھائیں بھی نظر آتی تھی۔ میں ایک عرصے تک یہ نظارہ دیکھتا رہا، لیکن کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ یہ مشاہدہ بڑا ہی حیرت انگیز تھا۔ مجھے اسے بار بار دیکھنے کی آرزو رہتی تھی اور میں تقریباً ہر روز یہ نظارہ دیکھتا تھا۔ میرا وجدان ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ اتنے زیادہ اور بڑے پروں والا یہ پُراسرار وجود کوئی پرندہ نہیں، فرشتہ ہے جو ہر صبح وقتِ مقرّرہ پر ہمارے اوپر سے گزرتا ہے۔

آزادیِ پاکستان کے بعد اب ۱۹۷۹ء میں، مجھے پھر برسوں پہلے کا یہ مشاہدہ ہوا۔ وہی صبح کی اذان سے پہلے کا وقت تھا۔ میں کھڑکی سے روضۂ اطہر کو دیکھ رہا تھا کہ وہ فرشتہ اسی طرح جنوب سے شمال کی طرف اُڑتا ہوا دکھائی دیا اور اس کے پروں کی آواز اسی طرح فردوسِ گوش تھی، اور اس کی پرچھائیں بھی اسی طرح جنتِ نگاہ تھی۔ یہ وہاں میرا آخری مشاہدہ تھا۔ نمازِ فجر پڑھ کر ہم نے حسرت بھری نظروں سے حرم شریف کو دیکھا، سلام کیا اور ہوائی مستقر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں

دل نے کئی بار خصوصاً آخری دن یہ چاہا کہ روضۂ اطہر سے لپٹ کر خوب روؤں۔ یہ آرزو بڑی شدید اور صبر آزما تھی۔ عالمِ جذب و مستی میں ایسا کر گزرنا کچھ بعید نہ تھا، لیکن میرے اِلٰہ و ربّ نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ عشقِ رسول صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں،

ہر حال میں، چاہے عالمِ جذب و مستی کیوں نہ ہو، مؤدب و خاکسار اور ہوشمند و نفس گم کردہ رہنا لازمی ہے۔ اس اعتبار سے مکّہ مکرمہ اور مدینہ منوّرہ کی فضاؤں میں بڑا فرق ہے۔ حرمِ کعبہ میں عالمِ جذب و مستی میں رہنے کی اجازت ہے، لیکن حرمِ نبویؐ میں ہر حال میں با ادب، با ملاحظہ ہوشیار رہنا لازمی ہے۔ اس لحاظ سے اہلِ جذب و شوق کے لیے حرمِ نبویؐ میں جلال زیادہ اور حرمِ کعبہ میں جمال کی فراوانی ہے؛ لیکن یہ یاد رہے کہ جمال و جلال دونوں ہی حُسن کی دو صفات یا مظاہر ہیں۔ چنانچہ یہ شعر جتنا معروف ہے اُس سے زیادہ سچّا ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں زعرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

کڑی : ۲۰

دیارِ حبیبؐ سے دیارِ غیر کی جانب

دارُالحکومت ریاض

مدینۂ منوّرہ کے ہوائی مستقر پر پہنچ کر ہم نے سامان بُک کرایا اور انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔ جہاز نے پندرہ منٹ کی تاخیر سے تقریباً سات بجے پرواز کی۔ ایئر ہوسٹس ایک نوجوان مصری لڑکی تھی، جس کا رویہ مسافروں کے ساتھ ایسا نہ تھا جیسا ہونا چاہیے۔ مسافر اسے بد دماغ کہتے تھے۔ ناشتا انتہائی ناقص تھا، جو ایک کیک کے ٹکڑے اور شربت کے گلاس پر مشتمل تھا۔ کیک کا ٹکڑا پلیٹ پر رکھ کر نہیں، ویسے ہی ہاتھوں میں تھما دیا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہم ریاض پہنچے، جو سعودی حکومت کا دارُالحکومت ہے۔ یہ جدید طرز کا شہر ہے۔ سعودی عرب کے دیگر شہروں کی طرح یہ بھی تجارتی شہر ہے اور بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ اس میں شاہی محلّات، سرکاری ایوان و عمارات، تجارتی مراکز، بڑے بڑے ہوٹل اور عمارات ہیں، جو مغربی فنِ تعمیر کا نمونہ ہیں۔ یہاں تجارت کا بازار تو گرم رہتا ہے، لیکن صنعت و حرفت کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ عربوں کی زندگی بڑی تیزی سے مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ موٹر گاڑیوں کی اس قدر بہتات ہے کہ انھیں پارک کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ مساجد کے علاوہ اسلامی فنِ تعمیر و روایات کے کہیں کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔

آدھ گھنٹے بعد ہمارے طیارے نے دوبارہ پرواز کی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم طہران کے ہوائی مستقر پر پہنچے، جہاں ہمارے استقبال کے لیے ہماری بیٹی،

داماد اور ان کے احباب موجود تھے۔ ہم حرمین شریفین کی پاک سرزمین سے دمام یعنی ایک نئی دُنیا میں آ گئے تھے۔ سعودی عرب کا یہ شہر ساحلِ سمندر پر واقع ہے، جہاں تیل کے کنوئیں ہیں۔ اس کے قریب ایک نیا شہر اُبھر رہا ہے، جسے خُبر کہتے ہیں، اور جو امریکا کی ایک نو آبادی معلوم ہوتا ہے۔

دمام

دمام جدید قسم کا ایک تجارتی و خوش حال شہر ہے۔ اس کی فضا مدینۂ منوّرہ اور مکّۂ مکرّمہ کی فضاؤں سے مختلف ہے۔ ہمیں یہاں پہلی بار پاکستانی کھانے میسّر آئے۔ ہمارے داماد ڈاکٹر عبدالرؤف کے پاکستانی و ہندوستانی احباب نے ہماری خوب ضیافتیں کیں۔ ہم نے سیر و تفریح بھی خوب کی، لیکن ظاہر ہے ہمیں وہ سوز و ساز نہ مل سکتا تھا اور نہ ملا، جو حرمین شریفین میں ملا تھا۔ وہاں ایک ہی جذبہ و شوق تھا، اور وہ تھا عبادت و ذکرِ الٰہی کا۔ وہاں قرب و حضور کی سعادتیں حاصل تھیں، جذب و شوق کی فراوانی اور مشاہدات کی لذّت تھی، لیکن یہاں کام و دہن کی لذّتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں مال و دولت کے نظّارے تھے اور خرید و فروخت کا بازار گرم تھا۔ لوگوں کی شامیں سیر و تفریح اور راتیں ٹیلی ویژن یا وی سی آر پر فلمیں دیکھنے میں گزرتی ہیں۔

سیاسی و ثقافتی سرگرمیوں کا فقدان

سارے سعودی عرب میں ایک چیز خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، اور وہ ہے سیاسی و ثقافتی سرگرمیوں کا فقدان۔ وہاں نہ جلسہ ہوتا ہے، نہ جلوس نکلتے ہیں، اور نہ ثقافتی سرگرمیاں ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایک خاموش فضا میں لوگ مال مست ہیں، یا حال مست۔ زندگی ہنگاموں سے نا آشنا ہے۔ لوگ اظہار و بیان کی آزادی سے ناواقف اور حریّتِ فکر و نظر اور جمہوریت کے مفہوم سے نابلد ہیں۔ فضا رنگِ خوف سے مُزیّن نظر آتی ہے۔ تیل کی آمدن لوگوں کو مادّہ پرست بناتی ہیں

نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔ روحانیت کا بازار گرم ہے تو صرف حرمین شریفین کے اندر، جہاں تحریکِ اسلام اُبھری، پھیلی اور اس نے نشوو ارتقاء کیا تھا۔ یہاں دمام میں وہ بات نہ تھی جو مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ میں تھی۔

ہجر و فراق کے ایّام شروع ہو چکے تھے۔ دل اسیرِ رنج و الم ہو چکا تھا۔ عبادت میں وہ حضور و سرور نہ تھا۔ ایک دفعہ پھر عُمرہ کرنے کی حسرت تھی اور یہ حسرت بتدریج جذب و شوق میں بدلتی گئی۔ اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت نے اس کی شرم رکھنی تھی اور رکھ لی۔ میری بیٹی اور داماد نے، جو سالانہ رخصت پر اس بار ہماری بیٹی نگہت یونس کے پاس کینیڈا جا رہے تھے، پہلے عُمرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ہماری دُعا کی قبولیّت کی علامت تھی۔ اس فیصلے سے رُوح کو سُرور انگیز ٹھنڈک پہنچی اور دل مطمئن ہو گیا۔

کینیڈا میں تحریکِ اسلام

ہماری بیٹی نگہت اور اس کا شوہر حافظ محمّد یونس بٹ اللّٰہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بڑے ہی صالح، صاحبِ دل، خُدا ترس، مخیّر، زکوٰۃ ادا کرنے والے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ قرآنِ مجید سے انھیں والہانہ عشق ہے اور اہلِ احتیاج کی حاجت روائی کرنا، اپنے بیگانوں کی خدمت کرنا اور ان کا غم کھانا، ان کا شیوہ ہے۔ وہ قول و فعل کے سچّے اور اہلِ جذب و شوق میں سے ہیں۔ ان کے دلوں میں اپنے الٰہ و ربّ اور رسولِ مقبول صلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی محبّت کی شمع روشن ہے۔ ان کے دو بچّے ہیں: ایک لڑکا، جس کا نام کاشف ہے اور دوسری لڑکی، جس کا نام ثمین ہے۔ دونوں بچّے باقاعدہ قرآنِ مجید پڑھ رہے ہیں، انھیں دین کی تعلیم دی جا رہی ہے اور اسلام کے اصولوں کے مطابق اُن کی تربیت کی جا رہی ہے۔

حافظ یونس کینیڈا میں تحریکِ اسلام کے سرگرم رکن ہیں؛ رمضان المبارک میں ہر سال اپنے گھر میں نمازِ تراویح کا اہتمام کرتے اور قرآنِ مجید سُناتے ہیں۔

جن لوگوں کو اہلِ جذب وشوق کے اس اجتماع میں شامل ہونے اور قرآنِ مجید سُننے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، ان کا بیان ہے کہ اس اجتماع کا منظر بڑا ہی ایمان افروز اور قابلِ دید ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے حسین، سچّے، ایمان افروز اور دل میں اُتر جانے والے شیریں بولوں سے کفر و شرک اور فسق و فجور کی فضا معمور ہو جاتی ہے۔ اس ایمان افروز منظر کو دیکھنے اور اپنے بیٹے سے قرآنِ مجید سُننے کی آرزو ہمیں کینیڈا لے جا رہی ہے۔ ہماری دُعا ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ ان دونوں صالح میاں بیوی کو اسلام کی خدمت کرنے اور اُس سرزمینِ شرک و فجور میں شمعِ توحید روشن کرنے کی توفیق و مہلت عطا فرمائے، آمین!

النسائم آرزدست دمام بے نام محلّوں اور کوچوں کا شہر ہے۔ مکانوں کے نہ نام ہیں نہ نشان۔ گھروں کے نمبر اور گلی کوچوں کے نام و نشان نہ ہونے کی وجہ سے کسی گھر کا پتا لگانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سارے سعودی عرب میں ڈاک، پارسل، منی آرڈر وغیرہ گھروں میں پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں۔ امیر و کبیر لوگوں، کمپنیوں، تجارتی اداروں، سرکاری محکموں وغیرہ نے اپنے اپنے پوسٹ بکس لے رکھے ہیں؛ بقیہ لوگ خود ڈاک خانے میں جا کر ڈاک کے ڈھیروں میں سے اپنی ڈاک تلاش کر کے نکال لیتے ہیں۔ یہ بڑا ہی صبر آزما اور کٹھن کام ہے۔ آدمی اپنی منزل سے بھٹک جائے تو پھر اپنی منزل کو پانا بڑا ہی دشوار اور ہمّت طلب کام ہوتا ہے۔ اجنبیوں کی رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں۔ بعض ملکوں کے اجنبیوں کو جن میں پاکستان بھی شامل ہے، مسکین و حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے خواہ کوئی بھی اسباب ہوں، لیکن یہ بڑی ہی تکلیف دہ ہے، خصوصاً اس لیے بھی کہ ہم پاکستانی خصوصاً سعودی عرب کے لوگوں سے بڑی عقیدت و محبّت رکھتے اور ان کو معزّز و مکرّم سمجھتے ہیں۔

دمام ساحلِ سمندر پر ہے اور تعمیرات میں روز افزوں ترقّی کر رہا ہے، لیکن پینے کا پانی کمیاب ہے۔ لوگ عموماً یورپ کے ممالک سے درآمد شدہ پانی پیتے ہیں، جو پٹرول سے کئی گنا زیادہ مہنگا ہے، لہٰذا زیادہ تر پیپسی کولا استعمال کیا جاتا ہے۔ قریب قریب سارے سعودی عرب میں پانی کی ایسی ہی قلّت ہے۔ تیل کے چشموں کی وجہ سے بجلی سے گھر بار اور کوچہ و بازار روشن رہتے ہیں، لیکن دل روشن نظر نہیں آتے، وہاں اندھیرا ہی دکھائی دیتا ہے۔ مال و دولت کی فراوانی ہے، مگر دولتِ دل کی قلّت ہے۔ اہلِ حرص و ہوا کی بہتات ہے، لیکن اہل فقر و نظر کا قحط ہے۔ ملک بھر میں سینما، تھیٹر، کلب، تفریح گاہوں وغیرہ کا فقدان ہے، لیکن گھروں کے اندر ٹیلی وژن، ریڈیو، وی سی آر، عیش و عشرت اور کام و دہن کی لذّتوں کے سب سامان مہیا ہیں۔ عورت مردوں کے اعصاب پر سوار ہے۔ چار چار بیویاں رکھنے کے علاوہ کنیزیں رکھنے کا بھی عام رواج ہے۔ علاوہ بریں، طلاق دینا اور خُلع لینا معمولاتِ زندگی میں سے ہے۔ بار بار نکاح کرنا، عورتوں اور مردوں کا محبوب مشغلہ ہے۔ قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ مولائے رومؒ کا یہ مصرع بار بار دل کی گہرائیوں سے اُٹھتا اور زبان پہ آجاتا:

از دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

> **تیل فضلِ ربّانی بھی ہے اور ابتلا بھی**

تیل سعودی عرب کے لیے فضلِ ربّانی بھی ہے اور ان کے لیے کڑی آزمائش بھی۔ تیل کے کنویں انھیں زر و مال تو دے رہے ہیں، لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ وہ ہلاکت و بربادی کے عمیق غار ہیں جن میں گرنا اُن لوگوں کا مقدّر ہوتا ہے، جو مال و دولت کے نشّے میں خُدا اور اپنے آپ کو بھول جائیں، جو تن آسان و متکبّر ہوں، جن میں جذبۂ جہاد و شہادت کا فقدان ہو؛ جو بے علم و بے ہنر ہوں؛ جو زر پرست، تعیّش پسند اور ظالم و جاہل ہوں، نیز جنھوں نے اپنی

خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنالیا ہو۔ شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو عذاب کی صورت میں عرب ممالک پر مسلّط کر دیا ہے۔ صیہونیت ان کی گھات میں لگی بیٹھی ہے، لیکن وہ نشۂ تغافل میں سرمست ہیں۔ ان میں تشتّت و افتراق ہے۔ تیل کے کنوئیں کوہِ آتش فشاں کی طرح قیامتِ صغریٰ برپا کرنے کے لیے قدرت کے قانونِ مکافات کے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے" اُن کے کان ہیں، مگر وہ سُنتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں، لیکن وہ دیکھتے نہیں، ان کے قلوب ہیں، مگر وہ سمجھتے بوجھتے نہیں، ان کے دل اندھے ہو چکے ہیں اور وہ حیوانوں سے بھی زیادہ گمراہ و ذلیل ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ سعودی عرب کے لوگ نہ قبر پرست ہیں نہ پیر پرست، اور بظاہر وہ شرک بھی نہیں کرتے، لیکن وہ موحّد ہوتے ہوئے بھی اپنی خواہشوں کے پجاری ہیں۔ قرآنِ مجید کی اصطلاح میں انھوں نے اپنی خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنا لیا ہے۔ یہ بڑی ہی تشویش ناک و عبرت ناک صورتِ حال ہے، جس کے انجام کے تصوّر سے اہلِ ایمان و نظر کے دل کانپ اُٹھتے ہیں۔ اہلِ نظر کو جس بات پر سب سے زیادہ حیرت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عرب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی چہیتی، نجات یافتہ اور سب سے افضل و اعلیٰ قوم سمجھتے اور اس پر برملا فخر کرتے ہیں، حالانکہ وہ علم و ہُنر، صنعت و حرفت، جدید ٹیکنالوجی، حربی و عسکری قوّت، شجاعت و مردانگی، الغرض زندگی کے ہر شعبے میں پس ماندہ ہیں۔ اغیار انھیں جذبۂ جہاد سے عاری سمجھتے ہیں اور غلط نہیں سمجھتے۔ سعودی عرب میں بالخصوص تیل کے سوا عیش و عشرت، آرام و راحت اور ضروریاتِ زندگی کی جملہ اشیا، حتّٰی کہ پینے کا پانی بھی دساور سے درآمد کیا جاتا ہے۔

پُراسرار مجاہد | یہ احساس، احساسِ حقیقت تھا کہ حُسن و نُور اور کیف و سُرور کی کشادہ و وسیع جنّت سے نکل کر ہم ایک بے کیف و بے سُرور

اور تنگ و تاریک دنیا میں آگئے ہیں۔ مشاہدات و واردات کا سلسلہ منقطع اور ہجر و فراق کا صبر آزما زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ اس عالم میں جمعۃ المبارک آگیا۔ میں اپنے داماد ڈاکٹر عبدالرؤف کے ساتھ نماز پڑھنے جامع مسجد گیا۔ وہاں ہمیں بالائی منزل پر جگہ ملی۔ یہ دراصل مسجد کا غیر مسقف کوٹھا تھا۔ دھوپ کی حدّت، گرمی کی شدّت اور فرش کی تپش میرے لیے قریب قریب ناقابلِ برداشت تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا، اور افسوس بھی کہ تیل کے چشموں کے اس متموّل شہر کی جامع مسجد میں سائے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ امام صاحب نے مختصر خطبہ دیا اور نماز میں سورتیں بھی مختصر تلاوت کیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سعودی عرب میں، ہمارے ملک کی مساجد کی طرح، خطبے سے پہلے لمبی چوڑی تقریریں کرنے کا رواج نہیں، اور نمازی عموماً فرض ہی پڑھتے ہیں۔

نماز سے فارغ ہو کر ہم نیچے اُتر رہے تھے کہ دروازے پر ایک شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو ایک وجیہہ نوجوان نظر آیا۔ اُس نے سلام و مصافحہ کرنے میں پہل کی۔ ہم دونوں اجنبی ہونے کے باوجود بڑے تپاک سے ملے۔ اُس پُراسرار نوجوان نے مجھے قریبی ریستوران میں چلنے کی دعوت دی، جو میں نے قبول کر لی۔ پیاس سے بُرا حال تھا، ہم نے پیپسی کولا منگوایا اور پینے لگے۔ وہ نوجوان عرب تھا، لیکن انگریزی اور اُردو میں بات چیت کر سکتا تھا۔ اُس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا، اس لیے کہ آپ سیّد المرسلین علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے سیرت نگار ہیں۔ میرا اشتیاقِ ملاقات اور بڑھ گیا۔ جب میں نے آپ کو ٹیلی وژن پر دیکھا، جب آپ سیرۃ النبیؐ کی تقریبِ انعامات میں اپنا انعام لینے اسٹیج پر آئے تھے۔ ویسے میں نے آپ کو پہلی صف میں بیٹھے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اخبارات میں آپ کی تصویر بھی دیکھی تھی اور تقسیمِ انعامات کی تقریب کی رُوداد بھی پڑھی تھی۔

خُدا جانے کیوں مجھے آپ سے ملنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں آپ کی تالیف "پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم" کا مطالعہ کر چکا تھا، اور آپ نے جس جذب و شوق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس نے میری لوحِ دل پر انمٹ نقوش مرتسم کیے ہیں۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے میری یہ آرزو پوری کر دی۔

میں: میں اس قابل کہاں ہوں کہ کوئی مجھ سے ملنے کی تمنّا کرے؟ لیکن یہ بتائیے کہ آپ کو میری تالیف پڑھنے کا کیسے موقع ملا؟

وہ: میں انگریزی کے علاوہ اُردو، فارسی، فرانسیسی بھی جانتا ہوں۔ کچھ عرصہ ہوا مجھے ایک کام کے سلسلے میں مکّہ مکرّمہ میں رابطۂ عالمِ اسلامی کے دفتر جانے کا اتّفاق ہوا۔ میں نے آپ کی تصنیف "پیغمبرِ اعظم و آخرؐ" کا چرچا سُنا تو اسے پڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ یہ مبالغہ نہیں، حقیقت ہے کہ میں اس کتاب سے بے حد متأثر ہوا ہوں۔ یہ واقعی قرآنِ مجید کی تفسیرِ کبیر ہے۔ مجھے اس کے پڑھنے کے دوران ایسا محسوس ہوتا رہا کہ یہ کسی صاحبِ حال و شہود، عاشقِ قرآن و رسولؐ اور اہلِ جذب و شوق کی تصنیف ہے۔

میں: آپ نے میرے متعلق جو رائے قائم کی ہے، میں اس کے لیے آپ کا بے حد ممنون و متشکّر ہوں، لیکن من آنم کہ من دانم۔

وہ: میں جہاں گرد ہوں۔ میں نے ایک دُنیا دیکھی ہے۔ کتاب سے مجھے عشق ہے۔ اہلِ جذب و شوق کی صحبت میرے نصیب میں بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے محسوس کیا اور سمجھا، وہ انشاء اللہ درست ہے۔

بات کا رُخ بدلنے کی خاطر میں نے پُوچھا: آپ نے اپنا تعارُف نہیں کرایا؟ مجھے تو آپ مجاہد اور اہلِ جذب و شوق دکھائی دیتے ہیں۔

وہ: میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ میں صیہونیّت کے خلاف جہاد میں حصّہ لیتا ہوں۔ ویسے میں فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت کا بھی سخت دشمن ہوں،

خواہ کسی شکل و صورت میں آئیں اور سادہ دل بندوں کو دین، قوم اور وطنیت کے نام پر کتنے ہی نظر فریب دھوکے کیوں نہ دیں۔

میں : تحریکِ صیہونیت اور اسرائیلیوں سے متعلق آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

وہ : میں انھیں عذابِ الٰہی سمجھتا ہوں۔ یہ دُنیا کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنیں گے اور خود بھی ہلاک و برباد ہو جائیں گے ... تیسری عالمگیر جنگ ناگزیر ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ عالمِ اسلام فسق و فجور اور جُرم و گناہ کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ شرک کی گرم بازاری ہے۔ لوگوں نے اپنی خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنا لیا ہے۔ دولت کی پرستش زمانے کا دستور بن گئی ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ سبھی اپنے آپ کو دانشور سمجھتے اور اپنے ہی مذہب کو سچا مانتے ہیں۔ ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں اور دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں۔ وہ ظالم و جاہل ہیں، لیکن اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتے۔ اہلِ جذب و شوق، اصحابِ حُسن و سُرور اور اہلِ فقر و نظر خلوت گزیں ہو گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال، عذابِ الٰہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

میں : آپ کی باتیں سچّی، عبرت انگیز اور ایمان افروز ہیں۔ پاکستان میں تو میں کسی مردِ کامل اور صاحبِ حُسن و سُرور سے ملنے کو ترس گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ میں اور آج یہاں دمام میں ایک مردِ خُدا سے ملاقات ہو گئی۔

وہ : آپ کا یہ حُسنِ ظن ہے۔ ویسے کسی مردِ خُدا کا ملنا آج کل دشوار ہو گیا ہے۔ ریاکاری اور دکانداری عام ہے۔ سُود خوری، بُخل، اِکتناز اور احتکار کی بیماریاں مسلمانوں کے معاشرے کو مفلوج کر چکی ہیں۔ چور بازاری، اسمگلنگ، رشوت، جھوٹ اور فریب و عیّاری کا بازار گرم ہے۔ خود نمائی نے عورت کو حیا سے محروم کر دیا ہے۔ تن کی دولت کے سب پجاری ہیں، لیکن من کی دولت سے بے نیاز ہیں۔ موت فراموش کر دی گئی ہے اور قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رہا۔ آخرت کی ابدی زندگی کا کسی کو

خیال نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو کون اپنا الٰہ و رب سمجھتا ہے؟ کسے جہاد کا شوق اور شہادت کی آرزو ہے؟ کون دیدِ "دوست" کا طلب گار ہے؟ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کس کا شیوۂ زندگی ہے؟ "دوست" کو کون یاد کرتا اور اس سے محبت کرتا اور ڈرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو کون اپنا رب مانتا اور اس پر قائم رہتا ہے؟ ہم نام کے مسلمان ہیں۔ بہت کم ہیں جو مومن ہیں۔ بہت ہی کم ہیں جو اصحابِ حُسن و سُرور ہیں۔ اس کی نظرِ کرم اور رحمتِ بے پایاں ہے کہ ہم زندہ و سلامت ہیں، اگرچہ ہلاکت و بربادی کی بلائیں گھات میں لگی بیٹھی ہیں۔ اگر ہم نے اپنی اصلاح نہیں کی تو عذاب شُدنی ہے۔ عذابِ الٰہی ناگزیر ہے۔ صیہونیت عذابِ الٰہی ہے، جو ہماری بدعملیوں کے سبب ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جب تک عالمِ اسلام میں فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا معاشرہ صالح یا اسلامی نہیں بن سکتا اور نہ ہم ترقی ہی کر سکتے ہیں۔

میں: آپ نے جو کچھ کہا، سچ ہے، میرے دل کی آواز ہے۔ لیکن ہم دُعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟

وہ: اگر فرقہ بازی چھوڑ دیں، قومی، لسانی اور نسلی عصبیتوں کو بھول جائیں اور سب مسلمان بھائی بھائی بن جائیں، متحد ہو جائیں، مجاہدین بن جائیں۔ شہادت ہمارا مقصود بن جائے، تو ہم اپنی تقدیر بدل سکتے اور عذابِ الٰہی سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ ہم سچے مؤمن و موحّد بن جائیں۔ شرک و بُت پرستی سے تائب ہو جائیں اور کتاب و اُسوۂ حسنہ کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔

میں: آپ کی بصیرت افروز باتیں سن کر میرے دل میں آپ سے دوبارہ ملنے کی آرزو مچلنے لگی ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

وہ: ممکن تو ہے، لیکن میرے لیے ازبس دشوار ہے۔ میری زندگی کی ڈور دوسروں کے ہاتھوں میں ہے۔ زندگی جہاد و شہادت کی خاطر بیچ چکا ہوں۔ میرا سب کچھ دوسروں

کی امانت ہے، جو خود بھی مجاہد و جانفروش ہیں .... قدرے توقف کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا "آپ کا پروگرام کیا ہے؟"

میں: ہم انشاء اللہ العزیز ہفتے کے اندر اندر جدّے روانہ ہو جائیں گے، اور وہاں سے ایک دو بار پھر عمرے کے لیے مکّہ مکرّمہ جائیں گے۔

وہ: خوب! اغلباً مجھے بھی کسی مشن پر مکّہ مکرّمہ جانا پڑے۔ مجھے وہاں اپنے احباب سے ملنا ہے جو عنقریب وہاں پہنچنے والے ہیں، لیکن مجھے احکام کا انتظار ہے۔

میں: آپ اللہ تعالیٰ کے پُراسرار بندوں میں سے ہیں، اہلِ جذب و شوق بھی ہیں اور مجاہد بھی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ لیکن یہ بتائیے کہ اس ملک میں کامل سکوت ہے۔ زندگی جمود و تعطّل کا شکار ہے۔ دولت کی ریل پیل تو ہے، لیکن جہاد و شہادت کے ذوق و شوق کا فقدان ہے۔ آپ کے نزدیک اس کی وجہ کیا ہے؟

وہ: دولت کی فراوانی اور اس کی محبّت نے لوگوں کو دُنیوی زندگی کا دالہ و پرستار بنا دیا ہے۔ انسان دولت اور جاہ و حشم کا پرستار بن جائے تو موت سے ڈرنے لگتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا دل جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت سے خالی ہو جاتا ہے۔ ایسے خالی دلوں میں شیاطین بسیرا کرتے ہیں، اور انسانوں کو بہرا، اندھا اور ظالم و جاہل بنا دیتے ہیں۔ جذبۂ جہاد کے بغیر کسی قوم کا آزاد و زندہ رہنا محال ہے۔ ہمیں مل کر یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ حرمین شریفین کو دشمنانِ اسلام سے محفوظ رکھے اور بیت المقدس کو آزاد کرائے اور ہمیں صیہونیت کے اِستیصال کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔ آمین! لیکن میرا ایقان و اذعان ہے کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم عالمِ اسلام میں فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت

کا خاتمہ نہ کر دیں اور مسلمانوں کو ان سے آزاد نہ کرا لیں۔

ہم دو تین بار مشروبات منگوا چکے تھے، گفتگو کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ دو اشخاص داخل ہوئے۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ ان کی نظروں میں تجسّس تھا۔ وہ ایک میز پر بیٹھ گئے، لیکن ان کی متجسّسانہ نگاہیں ہم پر مرتکز ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر وہ مردِ مجاہد جلدی سے اُٹھا، پیسے دیے اور مصافحہ و سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں پُراسرار اشخاص بھی جلدی سے ریستوران سے نکل کر اس کے تعاقب میں لپکے۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وہ مردِ مجاہد اور یہ دونوں اشخاص کون تھے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر اُن دو پُراسرار شخصوں پر پڑی جو تیزی سے ایک گلی کی طرف لپکے جا رہے تھے۔ میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا، جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا اور تیزی سے گھر لوٹ آیا۔ دمام میں یہ میرا بڑا ہی پُراسرار و معنی خیز تجربہ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سرزمین انقلاب پسندوں کی سرگرمیوں کی آماجگاہ بننے والی ہے۔

تاریخ آئینۂ سُنّتِ الٰہی ہے

میں تاریخ کا طالب علم اور تاریخِ ہسپانیہ و ترکیہ کا مؤلف ہوں۔ میرا ایقان ہے کہ جب کسی قوم میں جہاد کا جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ اپنی آزادی و وطن کی بازیابی کا مصمّم ارادہ کر لے تو وہ ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ دل نے کہا، اگر فلسطینی مجاہدین بھی اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ بازیابیِ وطن کی تحریک چلاتے اور قربانیاں دیتے رہے تو وہ یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

جب تک میں اس پُراسرار مجاہد کو دوبارہ دیکھ نہ لیا اور اس سے کچھ حالات معلوم نہ کر لیے، مجھے اس کے متعلّق تجسّس ہی رہا۔ جو اہلِ جذب و شوق کبھی اس راہِ پُرخار سے گزرے ہوں، وہی ایسی پُراسرار و پُرخطر زندگی کی لذّت سے آشنا ہوتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ارشاد ہے کہ "اگر کسی انسان کو شہادت کی لذّت

اور اس کے مرتبے کی عظمت و رفعت سے آگاہی ہو جائے تو وہ ان گنت مرتبہ شہید ہونے کی تمنّا میں جان دینے لگے۔" شہید کے خون کا ہر قطرہ لعل و گوہر سے لاکھ گنا گراں بہا و نظر افروز اور اس کی خوشبو ایسی جان بخش و روح پرور اور سُرور بخش و سحر انگیز ہوتی ہے کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شہادت سے زندگی کو حُسن و نور، صدق و سُرور، بقائے دوام اور دیدِ "دوست" حاصل ہوتی ہے۔ گو ہر زندگی جھوٹا کیوں نہ ہو شہادت اسے سچّا اور انمول بنا دیتی ہے۔ شہید جان دیتے ہی زندہ ہو جاتا ہے اور اسے اپنے اِلٰہ کی دید و حضوری اور بے قیاس نعمتیں میسّر آجاتی ہیں۔

ثقافتی زندگی

سعودی عرب میں وہاں کی کوئی عورت مجھے بے پردہ نظر نہیں آئی اور نہ انھیں بازاروں میں اکیلے گھومتے پھرتے ہی دیکھا۔ بیرونی ممالک کی عورتیں البتّہ بے پردہ نظر آتی ہیں۔ دوسری بات جس سے میں بہت متأثّر ہوا، یہ ہے کہ وہاں نہ کوئی مزار ہے، نہ درگاہ، نہ خانقاہ اور نہ پیر و مرید ہیں۔ شرک و بُت پرستی کا کوئی منظر کسی شہر یا بستی میں دکھائی نہیں دیا۔ سعودی عرب کے لوگوں کی سب سے نمایاں اور بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ موّحّد ہیں، اور شرک و بُت پرستی سے انھیں سخت نفرت ہے۔ وہ تاجر ہیں، لیکن صنعت و حرفت سے نابلد ہیں۔ اگر وہ اس طرف توجّہ دیں تو دُنیا کی عظیم قوموں میں ان کا شمار ہو سکتا ہے۔ وہ ذہین و فطین ہیں، لیکن محنت و مشقّت کے خوگر نہیں۔ اگر وہ جفاکش و مجاہدین بن جائیں اور سائنس اور جدید ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کر لیں تو مجھے یقین ہے کہ قدرت ایک بار پھر اقوامِ عالم کی قیادت انھیں تفویض کر دے گی۔

قومی برتری کا عقیدہ

عرب کی اندرونی ثقافتی زندگی پر بالخصوص بڑی تیزی سے مغربیت یا جدیدیت کا رنگ چڑھ رہا ہے، اور اس کے آثار ان کی بیرونی زندگی میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ فیشن پرستی عام ہے، گو ابھی تک

پردے میں ہے۔ لوگوں میں نسلی عصبیت اور احساسِ برتری پایا جاتا ہے، لیکن تعلیم وتربیت اور ہنرمندی کا تناسب بہت کم ہے۔ نوجوان محنت سے جی چراتے اور تن آسان ہیں۔ ان میں جذب وشوق کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ زندگی کے ہنگامے دوسرے ممالک کے ہنرمندوں کی محنت ومشقّت اور ذہنی کاوشوں کے مرہونِ منّت ہیں۔ حرمین شریفین میں بھی اہلِ جذب وشوق کثرت سے غیر ملکی مسلمان ہی نظر آتے ہیں۔ جملہ ضروریاتِ زندگی حتیٰ کہ سادہ پانی بھی درساور سے درآمد کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی عبرت ناک صورتِ حال ہے، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں، اور اس پر بھی وہ اپنے آپ کو تمام قوموں سے افضل واعلیٰ سمجھتے ہیں۔ کیوں؟ یہ معمّا آج تک حل نہ ہوسکا۔ اس موضوع پر ایک سعودی عرب نوجوان سے بحث ہوگئی۔ وہ ڈاکٹر تھا اور اس نے پاکستان سے ایم۔بی۔بی۔ ایس کی ڈگری لی تھی۔ میں نے پوچھا: تم کس بات میں دوسری قوموں پر فوقیت رکھتے ہو، جبکہ زندگی کے ہر شعبے میں تم ان سے صدیوں پیچھے ہو؟ وہ شرمندہ اور لاجواب ہوگیا۔ پھر اپنی خفّت مٹانے کے لیے کہنے لگا: "قرآن ہماری زبان میں اُترا ہے، اس لیے ہم دین کے اعتبار سے اپنے آپ کو سب مسلم وغیر مسلم قوموں سے بہتر سمجھتے ہیں"۔ میں نے جواب دیا: "آؤ، ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ ہم دونوں میں کون قرآن مجید کے مطالب ومفاہیم اور اسرار ورموز کو بہتر جانتا ہے۔ میں عجمی ہوں اور تم عربی۔ میں ایک آیتِ قرآنی پڑھتا ہوں، یا تم کوئی آیت پڑھو، پھر دیکھتے ہیں کہ کون قرآن حکیم کو بہتر جانتا ہے اور سمجھتا ہے؟"

ندامت سے اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ کہنے لگا: "میں قرآن نہیں پڑھا ہوا"۔ میں نے کہا: تم عرب تو ہو اور عربی تمھاری مادری زبان ہے، اور یہ قرآن مجید بھی عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ تم قرآنِ مجید کی ایک آیت تک نہ پڑھ سکتے ہو نہ سمجھ ہی سکتے ہو؟" وہ خاموش تو ہوگیا، لیکن پھر بھی اس بات پر اصرار کرتا رہا

کہ "عرب دُنیا بھر میں افضل قوم ہیں۔" کاش وہ واقعی ایسا ہوتے! میں نے دل میں کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ غریب ہوں یا امیر، اَن پڑھ ہوں یا تعلیم یافتہ، بوڑھے ہوں یا جوان، سب اسی قومی عصبیّت کے شکار ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تیل کی دولت نے انھیں مال مست بنا دیا اور اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ افضل ترین قوم ہیں۔ کاش انھیں اس تاریخی حقیقت کا احساس و شعور ہو جائے کہ اس غلط فہمی نے اقوامِ عالم کی ذلّت و مسکنت، غلامی و محکومی اور ہلاکت و بربادی میں از بس اہم کردار ادا کیا ہے۔

جذبۂ ایمان و جذبۂ جہاد لازم و ملزوم ہیں

ایک دن ایک مجلس میں چند حضرات سے ملنے کا موقع ملا۔ ان میں ایک صاحب عالم و فاضل بھی تھے اور صاحب دل بھی۔ میں نے ان سے مخاطب ہو کر سوال کیا: "حضرت! میرے لیے یہ معمّا حل کیجیے کہ سعودی عرب کے باشندے بظاہر توحید پرست ہیں۔ اگر وہ واقعی موحِّد ہیں تو پھر ان میں جذبۂ جہاد و شہادت کا فقدان کیوں ہے؟" انھوں نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا، کچھ سوچا اور پھر فرمانے لگے: "ٹھیک ہے کہ یہاں کے باشندے بظاہر شرک و بُت پرستی نہیں کرتے، کسی قبر یا بزرگ کو نہیں پوجتے، غیراللہ کے سامنے سر نہیں جُھکاتے، دین میں بدعت کو روا نہیں رکھتے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنا لیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسان کے سینے میں دو نہیں، صرف ایک دل ہی ہوتا ہے، اور ایک دل میں دو اِلٰہ نہیں سما سکتے۔ ان کا دل چونکہ اپنے حقیقی اِلٰہ و ربّ سے خالی ہے، اس لیے ان میں نہ جذبۂ جہاد ہے، نہ آرزوئے شہادت۔ ان کے پاس مال و دولت تو ہے، لیکن دولتِ دل نہیں۔ انھیں دُنیا کی نعمتیں تو میسّر ہیں، لیکن ان میں مجاہدین، اہلِ جذب و شوق اور اصحابِ حُسن و سُرور کا قحط ہے۔ ستم یہ ہے کہ انھیں اس حقیقت کا شعور بھی نہیں۔ اگر ہے تو بہت کم، اور جو لوگ یہ حقیقت جانتے بھی ہیں وہ اسے مانتے نہیں۔

مال و دولت کی پرستش انسان کو اندھا، بہرا اور ظالم و جاہل بنا دیتی ہے۔"

وہ خاموش ہوئے تو دوسرے صاحب

کفرانِ نعمت اور زوالِ نعمت لازم و ملزوم ہیں

کہنے لگے: "آزادیِ تقریر و تحریر سلب کر لی جائے تو قوم گونگی اور بہری بن جاتی ہے۔ انسان دیکھ کر کچھ نہ کہہ سکے تو اس کی بصارت بھی سلب ہو جاتی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حسّی و قلبی جو قوّتیں ودیعت کی ہیں، اگر انھیں استعمال نہ کیا جائے تو یہ کفرانِ نعمت ہے، جس کا نتیجہ زوالِ نعمت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس قانون کا اطلاق سب نعمتوں پر ہوتا ہے۔ نعمتوں کے غلط استعمال سے بھی ان کو زوال آتا ہے۔ قوم بہری، گونگی اور اندھی ہو جائے تو ذلّت و مسکنت اور ہلاکت و بربادی اس کا مقدّر بن جاتا ہے۔ یہ قدرت کا قانونِ مکافات ہے، جس سے کسی فرد یا قوم کو مفر نہیں۔"

اس مجلس میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو یقیناً اہلِ فقر و دید اور صاحبِ حُسن و سُرور تھے۔ فرمانے لگے: "اللہ جلّ شانہ، اس قوم یا فرد سے محبّت کرتا ہے جو اس سے محبّت کرے۔ بنو اسرائیل، جیسا کہ کُتبِ سماوی شاہد ہیں، اللہ تعالیٰ کی چہیتی قوم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اقوامِ عالم پر فضیلت دی اور اپنے انعام و اکرام سے نوازا۔ انھوں نے بار بار نافرمانی کی اور اس نے بھی انھیں بار بار معاف کیا۔ انجامِ کار جب ان کے دلوں میں محبّت کے چشمے خشک ہو گئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے بجائے اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان سے منھ موڑ لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ذلّت و مسکنت ان کا مقدّر بن گئی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے اور اس کی سنّت کبھی بدلا نہیں کرتی، لیکن بہت کم لوگ اس کا شعور رکھتے ہیں۔ ہر قوم اس فریب میں مبتلا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی اور انعام یافتہ قوم ہے۔ سنو! مسلمان وہ ہے

جو اللہ کا اطاعت گزار و پرستار بندہ ہے۔ ایسے ہی صالح بندوں پر وہ اپنا انعام و اکرام کرتا اور انھیں اپنی زمین کا وارث بناتا ہے۔

تفہیمِ قرآن کا اُصول

دین کا سِرّ الاسرار یہ ہے کہ فقط ایک اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ بنا لو اور اس کا دامن مضبوطی سے تھام لو۔ اس کی محبّت سے اپنی زندگی کو حسین اور سچّا بنا لو اور اللہ تعالیٰ کے دوست بن جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے دوست ہی کامیاب و کامران ہوتے ہیں "یہاں" بھی اور "وہاں" بھی۔ اللہ تعالیٰ کا دامن اُس کا آخری زندہ کلام قرآنِ مجید ہے، جو ناطق ہے۔ یہ سچّی کتاب ہے۔ اُسے سچّی نیّت اور سچّے دل سے پڑھنا اور خالی الذہن ہو کر اس پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ تفہیمِ قرآن کی راہ میں دشوار ترین مرحلہ خلوصِ دل یا خالی الذہن ہو کر قرآنِ مجید پر غور و فکر کرنے کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم پر غور و فکر کرنے سے پہلے اپنے دل و دماغ سے ہر قسم کے عقائد و افکار اور نظریات و تعصّبات کو کلیتاً نکال کر قلب کو پاک و صاف کر لیا جائے اور قاری اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کر لے کہ قرآنِ حکیم جو کچھ کہے گا میں اُسے بغیر حیل و حجّت یا تذبذب و تشکیک کے قبول کر لوں گا اور سچّے دل سے اس پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔" انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

سِرّ الاسرار

"دولت و شہرت اور قوّت و اقتدار کی ہوس چھوڑ دو۔ یہ ہوس اِلٰہ بن جائے تو انسان کی زندگی جنسِ کاسد بن جاتی ہے جس سے "دوست" نفرت کرتا ہے۔ محبّت کرو اور اس کے سوز سے اپنی خودی کو زندہ و محکم اور سچّا بناؤ۔ "دوست" کو سچ ہی پسند ہے۔ قلب و نگاہ سچّے ہوں تو وہ "سچ" کو دیکھ سکتے ہیں۔ سچ ہی حُسن ہے۔ سچ سے حُسنِ قلب و نظر پیدا ہوتا ہے، جس سے "دیدِ دوست" میسّر آتی ہے۔ اس کے حُسن کا ایک نظارہ ہی انسان کو صاحبِ حُسن و سُرور بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے اِلٰہ کا اور اِلٰہ اس کا ہو جاتا ہے۔ وہ شاہد و مشہود

بن جاتے ہیں اور شہود ہی حاصلِ زندگانی ہے۔ یہ سرّ الاسرار ہے۔ شہود تو سحرِ حُسن و سُرور، روحِ جذب و مستی اور جانِ آرزو و محبّت ہے۔

غایتِ دین و زندگی "علم و حکمت اور عرفان و معرفت کا لُبّ لباب یہ ہے کہ دُنیا کی آنی و فانی زندگی سے زیادہ آخرت کی ابدی و لافانی زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ آخرت کا گھر "الحیوان" ہے، یعنی زندگی کا گھر، جہاں موت نہیں ہوتی اور جس کی ہر آن ابدی ہے۔ تمھاری منزلِ آخر حُسن المآب ہے، جسے جنّت، فردوس، خُلدِ بریں، بہشت وغیرہ کئی ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ وہاں تم اپنے نور کے ذریعے پہنچ سکو گے، اور اس کے لیے زندگی کا حسین اور سچّا ہونا، ناگزیر ہے۔ جھوٹ انسان کو شرّ المآب میں پہنچاتا ہے، جسے تم دوزخ، جہنّم، النّار، سقر، ہادیہ وغیرہ کئی ناموں سے تعبیر کرتے ہو۔ وہاں انسان نہ زندوں میں ہوگا نہ مُردوں میں، بلکہ ایک کربِ مسلسل میں گرفتار ہوگا۔ وہ عالمِ سُکرات میں جیے گا اور یہ جینا اذیّتیں سہنے کے لیے ہوگا۔ دُنیا کی زندگی اُخروی زندگی کے مقابلے میں رقصِ شرر سے بھی کم مدّت و حیثیت رکھتی ہے۔ غضب ہے کہ تم اس کے لیے جنّت کی ابدی زندگی کو قربان کرتے ہو۔ جنّت جانتے ہو کیا ہے؟ یہ تمھارے الٰہ کے حُسن کی جلوہ گاہ ہے، یہ کیف و سُرور اور لذّت و طمانیت کا جہانِ بے مثال ہے۔ یہ تازہ بتازہ اور نو بہ نو نظّاروں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں اہلِ حُسن و سُرور ہی زندگی کریں گے۔ اہلِ حُسن و سُرور بننے کی کوشش کرو کہ یہی تمھاری فطرت کا تقاضا، یہی غایتِ دین اور یہی مشیّتِ "دوست" ہے۔"

تقریر سچّی تھی، لہٰذا اس کی لذّت کیف پرور تھی، اور وہ دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی گئی۔ اہلِ جذب و شوق کی صُحبت سے رُوح لذّتِ سوز و ساز اور عقل اسرارِ حیات و ممات سے آشنا ہو جاتی ہے۔ رات گئے تک علم و حکمت اور عرفان و معرفت

کی باتیں ہوتی رہیں، دولتِ دل نچھاور ہوتی رہی اور اہلِ شوق اسے لوٹتے رہے۔ روح فرطِ حیرت و مستی سے وجد کرتی رہی۔ وقت گزرتا گیا، یہاں تک کہ نصف شب گزر گئی۔ دل نے لاکھ چاہا مگر وقت کی رفتار نہ تھمی، نہ رُکی۔ مجبوراً مجلس کو برخاست ہونا پڑا۔

وہ کلامِ الٰہی کے سوا کوئی بات نہ کرتے تھے

"دوست" کی نظرِ التفات ہو تو اس کے بندوں کی صحبت میسّر آتی ہے۔ دمام میں اہلِ حسن و سُرور کی کئی بار صحبتیں میسّر آئیں۔ ایک روز مسجد میں ایک ایسے بزرگ سے ملاقات ہوئی جو کئی برسوں سے اس مسجد میں مقیم تھے اور قرآنِ مجید کے سوا منھ سے کچھ اور نہیں بولتے تھے۔ ہر بات کا جواب قرآنِ مجید کی آیات ہی کے ذریعے دیتے اور جو بات کہنا چاہتے، آیاتِ قرآنی ہی کے ذریعے کہتے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے دوست بن گئے۔ مجھے متبسّم نگاہوں سے دیکھتے اور متبسّم چہرے کے ساتھ باتیں کرتے۔ مجھے بھی ان سے محبّت و عقیدت ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ وہ معزّز و متموّل خاندان سے تعلّق رکھتے تھے اور ان کے بیٹے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کو گھر لے جانے کے لیے بہت جتن کیے، مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ بزرگ اہلِ جذب و شوق، صاحبِ حسن و سُرور اور عاشقِ قرآن مجید تھے۔ وہ نذرانہ، تحفہ، ہدیہ وغیرہ ہرگز قبول نہ کرتے تھے، بلکہ ایسا کرنے کی کوشش سے خفا ہوتے تھے۔ البتّہ دوستوں کے ساتھ کھانا وغیرہ کھا لیتے تھے، وہ بھی صرف مسجد میں۔ مجھے بھی ایک دن ان کے ساتھ کھانا تناول کرنے کا شرف حاصل ہُوا۔

ان سے قرآنِ حکیم کے بہت سے حقائق و اسرار معلوم ہوئے۔ میرے سوالوں کے جواب میں وہ ایسی آیات پڑھتے کہ مطالب و اسرار مجھ پر خود بخود آشکارا ہو جاتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پُراسرار بندوں میں سے تھے۔ وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے

ان سے الوداعی ملاقات کی۔ اگرچہ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے مجھے رخصت کیا، لیکن ان کی نورانی آنکھیں اُداس و نمناک تھیں۔ میری بھی یہی کیفیتِ دل تھی۔ فراق بہرحال محبّت کی تقدیر ہے۔

اس واقعے کے تقریباً چار ماہ بعد دمام کے ایک ملنے والے سے، جو ان بزرگ سے بخوبی واقف اور ان کے عقیدت مند تھے، سرِراہے ملاقات ہو گئی۔ علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا کہ وہ بزرگ کیسے ہیں؟ انھوں نے کربناک لہجے میں کہا: "وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔" مجھے یہ سُن کر سکتہ سا ہو گیا۔ دل ڈوبنے لگا۔ میں نے حسرت سے پوچھا: "کیسے اور کب؟" وہ بولے: "آپ کے رخصت ہونے کے چند دن بعد۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ حسبِ معمول نوافل پڑھنے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ وہ سجدے میں ایسے گئے کہ دوبارہ نہ اُٹھے۔ نمازیوں کو ان سے عقیدت تھی، سمجھے کہ حضوری کے مزے لے رہے ہیں۔ وہ چُپ چاپ انھیں دیکھتے رہے۔ لیکن جب وقت زیادہ گزر گیا تو انھیں تشویش ہوئی۔ ایک نے جرأت کرکے ان کا کندھا پکڑ کر ہلایا تو وہ ان کے ہاتھوں میں آ پڑے۔ فرش پہ لٹایا تو وہ اپنے اِلٰہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

دمام میں خرید و فروخت کا بازار تو گرم رہتا ہے، لیکن اس کے علاوہ زندگی جمود و تعطّل کا شکار رہتی ہے۔ سفرِ حجاز میں مجھ پر مرزا غالب کے اس شعر کی حقیقت آشکارا ہوئی ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

ہنگاموں سے ناآشنا بے کیف زندگی گزارنا آسان نہیں۔ وہاں اجتماعی زندگی کے تقاضوں کی تشفّی کا کوئی سامان ہے اور نہ ان کی تشفّی کی اجازت ہی ہے۔ گھر ہی

لوگوں کی تفریح گاہ ہے۔ جمعۃ المبارک کے دن ساحل پر سیر و تفریح کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ میرے لیے ان کا یہ سکوتِ زندگی بڑا ہی عبرتناک و معنی خیز تھا۔ یہ سکوت مجھے سکوتِ سمندر کی طرح کسی طوفان کا پیش خیمہ لگا۔ کوہِ آتش فشاں بظاہر خاموش بھی ہو تو اس کے اندر لاوا اُبلتا اور باہر نکلنے کے لیے مچلتا رہتا ہے۔ آنکھ نے کیا دیکھا، عقل نے کیا سمجھا اور دل نے کیا محسوس کیا، اُسے بیان کروں تو کیسے؟ بقول علامہ اقبال ؒ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

میرا ننّھا دوست عدیل

جمال و جلال اور رفعت و وسعت سے میں بہت متأثر و محظوظ ہوتا ہوں۔ پہاڑوں کی بلندی، صحراؤں اور سبزہ زاروں کی وسعت و پہنائی اور سمندر کی ناپیداکناری سب میرے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ ساحلِ سمندر کی سیر کی، خنک ہواؤں کے جھونکوں اور سمندر کی وسعتوں کے نظّاروں سے خوب لطف اُٹھایا۔ لیکن جن دو چیزوں نے میرے دل کو سب سے زیادہ متأثر کیا اور اس پر انمٹ نقش چھوڑے وہ یہ ہیں: ایک اللّٰہ تعالیٰ کے پُراسرار بندوں کی ملاقات، اور دوسری میرے ننّھے سے نواسے عدیل کی محبّت۔ ایک سے رُوح کیف و سُرور سے معمور ہوئی اور عقل پر علم و حکمت کے حقائق منکشف ہوئے، دوسری سے دل معصوم محبّت کی سچّی لذّتوں سے آشنا ہوا۔ عدیل دو ہی دنوں میں میرا دوست بن گیا۔ وہ میرے ساتھ کھیلتا، میرے ساتھ سیر کرنے جاتا اور میرے ہی کمرے میں میرے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ ہر وقت ہنستا، کھیلتا اور باتیں کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ ابھی تین برس کا نہیں ہوا تھا، لیکن بڑا ہی شرارتی اور سمجھدار تھا۔ ہر وقت نانا نانا کی رٹ لگائے رکھتا، اور اس کی معصوم و شیریں آواز میرے

کانوں میں رس گھولتی رہتی۔ اس کی ہنسی فردوسِ گوش اور اس کی شرارتیں جنت نگاہ تھیں۔ محبت کے نقوش واقعی انمٹ ہوتے ہیں۔ اُس کی یاد آتی ہے تو دل گرفتہ ہو جاتا ہوں۔ دل بے قراری سے پاکستان میں اُس کی آمد کا منتظر ہے۔ کبھی کبھی یہ اندیشہ بھی وجۂ پریشانی بن جاتا ہے کہ ڈھائی تین سال کا یہ بچہ کہیں اپنے بوڑھے دوست کو بھول نہ جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ معصوم اور سچی محبت خوشیوں کا لازوال سرچشمہ ہے۔ شاید اسی لیے میرا دل بچوں سے محبت کرتا ہے اور یہ محبت میری بیش بہا متاعِ حیات ہے۔ مجھے کائنات کی ہر حسین چیز سے محبت ہے اور ان سے جمالیاتی حظ اُٹھاتا ہوں۔ آب و صحرا، سبزہ و گل، دشت و کوہ، ماہ و انجم اور اشجار و گلشن سب میرے معروضاتِ محبت اور جمالیاتی ذوق کی تسکین کے سامان ہیں۔

یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچا بھی ہے کہ محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ محبت سے انسان کو جو انمول چیزیں حاصل ہوتی ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں: (۱) مسرت و طمانیت: محبت بلاشبہ طمانیت و مسرت کا سرچشمہ ہے، اور یہ دونوں چیزیں انمول اور حاصلِ زندگانی ہیں۔ (۲) وسعت و آفاقیت: محبت کا دائرہ جتنا وسیع ہو جاتا ہے، انسان کی شخصیت میں اسی قدر وسعت و پہنائی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ (۳) حوصلہ و توانائی: محبت انسان کے دل میں حوصلہ و توانائی پیدا کرتی ہے۔ اس سے خودی محکم بنتی اور انسان کو شجاع بناتی ہے۔ انسان جب تمام عوالم (انسانی، حیوانی، نباتاتی اور جماداتی) سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کی ذات میں آفاقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان جب اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اس کی شخصیت نہ صرف آفاقی بلکہ ماورائی بن جاتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ماورائی معروضِ محبت ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام

اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات سے محبّت کرنے پر زور دیتا ہے۔

محبّت ہی دین کی اساس ہے

اصل یہ ہے کہ محبّت ہی دین کی اساس ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اس امر پر زور دیتا اور اس کی اہمیّت کو بار بار واضح کرتا ہے کہ صرف وہ تنہا ہی انسان بلکہ تمام مخلوقات کا اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے اور صرف اسی کو اِلٰہ بناؤ تو اس کا مطلب صاف یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا معروضِ محبّت ہے اور اسے اس سے محبّت کرنی چاہیے۔ محبّت کے ساتھ اس کی پرستش و طاعت بھی کرنا لازمی ہے، لیکن جہاں تک اس کی مخلوقات کا تعلّق ہے، ان سے صرف محبّت کرنی چاہیے۔ انھیں معروضِ محبّت تو بنانا چاہیے، مگر معروضِ معبودیت نہیں، کیونکہ یہ شرک و بُت پرستی ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس فرق کا شعور نہیں رکھتے، اور وہ غیر شعوری طور پر شرک ایسے گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

عشق و جنُوں کی حقیقت

دمام میں میری بیوی اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ خرید و فروخت میں مصروف رہی اور میں کاروبارِ محبّت میں مشغول رہا۔ وہ اشیائے صرف خریدتی اور دھن دولت خرچ کرتی رہی، اور میں دولتِ دل حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بچپن سے میرا یہی رویّہٗ زندگی رہا ہے، اور احباب و آشنا اسی بنا پر مجھے سادہ لوح بلکہ دیوانہ سا سمجھتے رہے ہیں۔ دولتِ دل کا سودا کرنے والوں کو دُنیا ہمیشہ ہی سے دیوانہ و سادہ لوح کہتی چلی آئی ہے، حالانکہ اہلِ عقل و خرد اور دانا ہمیشہ یہی دعا مانگتے رہے ہیں ؏

یارب مجھے صاحبِ جنُوں کر

جنُوں دراصل جذب و شوق سے عبارت ہے۔ جذب و شوق ہی زندگی کی وہ جوہری توانائی ہے جس کے ذریعے وہ حالتِ ارتقاء، یعنی ہر لحظہ ایک نئی تخلیقی

غلبیت کی حالت میں رہتی ہے، اور اس کے ہنگامے اسی جذب و شوق کی رہینِ منت ہیں۔ اہلِ جنون ہی مجاہد، غازی اور شہید ہو کر زندۂ جاوید بنتے ہیں۔ اس اعتبار سے جنون بھی دولتِ دل ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے لوگ مجاہدے کرتے اور حج و عمرہ کرنے آتے ہیں اور اس کوشش میں طرح طرح کے مصائب برداشت کرتے اور آزمائشوں سے گزرتے ہیں۔ محبت کا نقطۂ آخر جنون ہے، جو انسان کو صاحبِ دل، اہلِ فقر اور صاحبِ حسن و سرور بناتا ہے۔ جنون بھی صدق، شہادت اور صالحیت کا سرچشمہ ہے، جس سے مزرعِ زندگی نشو و ارتقا کرتی اور نت نئی شان میں جلوہ افروز ہوتی رہتی ہے۔

مقصودِ عمرہ و حج حج اور عمرے کا مقصودِ حقیقی بھی یہی ہے کہ انسان اپنے الٰہ و رب کے گھر آ کر اس کی محبت میں دیوانہ ہو جائے اور اس کا دامنِ زندگی دولتِ دل سے معمور ہو جائے۔ مختصر یہ کہ حج اور عمرے کا مقصد اپنی محبتِ الٰہی کو رنگِ جنون سے مزین کرنا، اس کے ذریعے اپنا تزکیہ کرنا اور اپنی زندگی کو سچا، حسین اور انمول بنانا ہے۔

زمانہ ہر دم رواں دواں رہتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی بھی تیزی سے گزرتی رہتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے دمام میں ہمارے قیام کا زمانہ گزر گیا اور رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ ہمارے ساتھ ہماری بیٹی، داماد اور نواسے کے جانے کا بھی پروگرام تھا۔ ہم ایک بار پھر "دوست" کے گھر جا رہے تھے۔ وقت کے ساتھ شوقِ زیارت فزوں تر ہوتا جاتا تھا۔ ہماری پہلی منزل جدہ تھی، جہاں ہمیں اپنے ماموں زاد بھائی شیخ مدثر محمود کے ہاں قیام کرنا تھا، جو نیشنل الجزیرہ بینک جدہ میں آفیسر ہیں۔

زندگی منظرِ گزراں ہے یہ ہمارے قیام کا وہاں آخری دن تھا۔ اس روز ہم خوب گھومے پھرے اور ہر منظر کو میں

دیدۂ شوق سے دیکھتا رہا، کہ شاید اس شہر میں پھر آنا ہو یا نہ ہو۔ زندگی ایک منظرِ گذراں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے۔ کئی برسوں کی بات ہے کہ مجھے زمان و مکان پر ایک مقالہ لکھنا تھا۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے اپنے الٰہ و ربّ کے حضور دعا مانگی کہ مجھ پر یہ حقیقت آشکارا کر دے۔ رات کو سویا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حریمِ کبریا سے حُسن و نُور کا ایک دھارا نکل رہا ہے، اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ زمان و مکان بیک وقت تخلیق ہوتے جا رہے ہیں، اور زندگی کے ہنگامے پرورش پا رہے ہیں۔ یہ منظر بڑا ہی عجیب و غریب، حیرت انگیز اور بصیرت افروز تھا۔ قلم و زبان اسے صحیح طور پر بیان کرنے سے عاجز ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس مشاہدے نے مجھ پر زمان و مکان اور زندگی کے بہت سے حقائق منکشف کر دیے۔ حریمِ کبریا کی حقیقت تو صرف "وہی" جانتا ہے، لیکن میرے دیدۂ قلب نے یہ دیکھا کہ وہ حُسن و نُور کا سرچشمہ ہے، حیرت انگیز و ناقابلِ بیان، مگر حقیقت افروز و حکمت آموز۔

حُسنِ حقیقی صورتِ مجاز میں

اسی زمانے کی بات ہے کہ میں وحدت الوجود پر مقالہ لکھنے لگا۔ میں نے اس موضوع پر کثرت سے لٹریچر پڑھا تھا اور غور و فکر بھی کرتا رہا تھا، لیکن دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز میں نے بارگاہِ "دوست" میں سربسجود ہو کر اس کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنے کی خاطر دعا مانگی۔ رات کو اس مسئلے پر غور و فکر کرتے کرتے سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ "دوست" ایک ایسی صورت میں جلوہ افروز ہے، جس کے بے مثال جمال و جلال، نظر افروزی و سحر انگیزی، جاذبیت و دلکشی اور حیرت انگیزی و روح پروری کو بیان کرنا بشر کے بس کی بات نہیں۔ وہ حُسنِ مجسّم اپنی بے مثال و قیامت خیز صورت و قامت کے ساتھ کل کائنات کو محیط ہے، اور میں اس کے غیر مرئی قدموں میں

ذرّے جتنا ہوں اور اسے دیکھ رہا ہوں۔ "وہ" تھا اور "میں"۔ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ زمان تھا نہ مکان، نہ ابعاد تھے نہ آفاق، کچھ بھی تو نہ تھا۔ "وہ" ایک طرف میرے اتنا نزدیک تھا کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی نقطۂ فاصلہ نہ تھا، اور دوسری جانب وہ مجھ سے اتنا دُور اور ماوراء اور ارفع تھا کہ نظر و تصوّر کی رسائی سے بھی ماوراء تھا۔ مجھے اپنی ہستی کا شعور تھا اور میری نظر صاف اسے دیکھ رہی تھی اور دِل اُس کے نظارۂ حُسنِ صورت سے رُوح پرور و حیرت انگیز کیف و سُرور حاصل کر رہا تھا۔ وہ مشہود بھی تھا، شاہد بھی اور شہود بھی۔ دل کو ایک ایسی تیز سُرور انگیز ٹھنڈک پہنچی کہ میری آنکھ کُھل گئی، لیکن دل ابھی تک وہ سُرور انگیز ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ اس مشاہدے کے ختم ہو جانے سے رُوح کو سخت صدمہ پہنچا، لیکن ہاتفِ غیبی کی آواز آئی: "اپنے اِلٰہ کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے تمھیں اپنا شاہد بنا لیا، اور تم پر اسرارِ معرفت منکشف کر دیے۔" اصل یہ ہے کہ "وہ" "سچّا سحر و سُرور، حقیقی جمال و جلال اور صدق و نُور ہے۔ یہ اس کے حُسن کی ناقص تعریف ہے، لیکن وہ سب کچھ ہے، جس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ جب انسان کا اِلٰہ ایسا ہو اس سے زیادہ خوش نصیب اور کون سکتا ہے، لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں۔

زندگی بیداری بھی ہے اور خواب بھی۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے ؏

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

ماضی کی زندگی یوں لگتی ہے جیسے ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا

ٹیکسی ڈرائیوروں کی لوٹ کھسوٹ

دمام میں زندگی کے ایّام چشم زدن میں گزر گئے۔

عمر ساری اسی طرح گزر جاتی ہے، اور انسان کو اس وقت ہوش آتا ہے جب موت کا ذائقہ چکھتا ہے۔ سعودی عرب میں ایک عجیب چیز دیکھی کہ اس امر کے باوجود کہ یہ ملک تیل کا گھر ہے اور پیٹرول پانی سے زیادہ سستا ہے، ٹیکسیوں کے کرائے اتنے ہی زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔ ٹیکسی کو دورانِ راہ کسی ضرورت کے لیے چند منٹوں بلکہ لمحات کے لیے بھی ٹھہرایا جائے تو وہیں پورے سفر کا کرایہ وصول کر لیا جاتا ہے اور آگے جانے کے لیے پھر پورا کرایہ دینا پڑتا ہے۔ ڈرائیور شاید ساری دُنیا کے ایک جیسے ہی ہیں جو مسافروں کی اجنبیّت و ناواقفیّت سے زیادہ سے زیادہ ناجائز فائدہ اُٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہاں استحصال بالجبر وغیرہ کے واقعات بھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ دمام میں عورتیں اپنے مردوں کے بغیر ٹیکسی میں سفر کرنے سے سخت خوف زدہ ہیں۔ بعض اوقات اجنبی مردوں کے لیے بھی مضافات وغیرہ میں جانے کے لیے ٹیکسی میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

دمام تو کیا مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ ایسے مقدّس شہروں میں بھی ٹیکسی ڈرائیور زائرین اور حجّاج کا کوئی لحاظ نہیں کرتے، بلکہ ان کا بڑے دھڑلے سے استحصال کرتے ہیں۔ سکونت کے لیے جگہ حاصل کرنا بھی دل گُردے کا کام ہے۔ زائرین کو لوٹنا مقامی لوگوں کا کام ہے اور اس میں وہ قطعاً کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

اس ضمن میں مجھے یاد آیا کہ مکّہ مکرّمہ میں دو تین زائرین سے آشنائی ہو گئی جو پاکستان اور بھارت سے آئے تھے۔ انھوں نے جگہ حاصل کرنے میں پیسے کے معاملے میں جو دِقّت اُٹھائی تھی، اس کی بپتا سُنائی، وہ بڑی تکلیف دہ اور حوصلہ شکن تھی۔ ایک نے ایک جگہ چند گھنٹوں کے لیے سامان رکھنے کا معاوضہ اسّی ریال دیا۔ دوسرے نے بتایا کہ میں مسجد الحرام میں عمرے کے لیے پہنچا تو ایک معلّم نے فی سبیل اللہ عُمرہ کرانے کی پیش کش کی اور میں نے قبول کر لی۔ مناسکِ عُمرہ سے فارغ ہوئے تو اس

نے ڈیڑھ سو ریال کا مطالبہ کیا۔ میں حیران رہ گیا اور اس سے کہا کہ آپ نے تو فی سبیل اللہ یہ کام کرنے کی پیش کش کی تھی۔" اس نے جواب دیا کہ میں معاوضہ بھی تو فی سبیل اللہ ہی مانگ رہا ہوں۔ اس نے بڑا ہی تنگ اور مجبور کر دیا، اور منّت و سماجت کے بعد ایک سو ریال لینے پر رضامند ہوا۔" اس قسم کے استحصال کے واقعات روزمرّہ کا معمول ہیں۔ حج کے دنوں میں بالخصوص ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لُوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے۔ مکانوں اور ہوٹلوں وغیرہ کے کرائے اور اشیائے خوردنی کی قیمتیں بالخصوص بڑھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔ مزدور اور ٹیکسی والے حجّاج و زائرین کو خُوب لُوٹتے ہیں۔ حجّاج کو عموماً اپنے معلّموں سے بھی شکایت رہتی ہے، لیکن اہلِ جذب و شوق اپنے اِلٰہ و ربّ کی راہ میں یہ سب مصائب و مشکلات جھیل کر بھی راضی برضا رہتے ہیں۔

کڑی : ۲۱

جدّہ، طوافِ وداع اور مراجعتِ وطن

آخر دمام سے رخصت ہونے کا دن آ گیا۔ ہمارا مختصر سا قافلہ سعودی ایئر لائنز کے ذریعے جدّے پہنچا، جہاں ہمارے استقبال کے لیے میرا ماموں زادہ بھائی اور بہن ہوائی مستقر پر موجود تھے۔ ہم باہر نکلے تو ٹیکسی ڈرائیوروں کے نرغے میں پھنس گئے، جو عُمرہ اور مکّہ مکرمہ کی آوازیں لگا رہے تھے۔ میں نے اپنی معلومات کی خاطر کرایہ پوچھا تو کوئی سو ریال بتانے لگا تو کوئی ڈیڑھ سو ریال۔ ہمارا قیام تو جدّے میں تھا، لیکن جن مسافروں کو مکّہ مکرمہ جانا تھا، وہ یہ ہوشرُبا کرایہ سُن کر سخت حیران و پریشان تھے۔ جہاں پٹرول اتنا ارزاں اور گاڑیاں اتنی سستی ہوں، وہاں پچاس ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے کا کرایہ سو ریال، یہ ظلم و استحصال نہیں تو اور کیا ہے! دمام اور دیگر شہروں کی طرح جدّے میں بھی شہر کے اندر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا کرایہ ٹیکسی والے عموماً پچیس ۲۵ تیس ۳۰ ریال لیتے ہیں۔ شاید یہ سلوک خاص کر اجنبیوں سے روا رکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں اہلِ عرب کی جتنی زیادہ عزّت و تکریم کی جاتی ہے، اتنا ہی سعودی عرب میں پاکستانیوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستانی روزگار کی تلاش میں وہاں کثرت سے جانے لگے ہیں، اور ان میں ایسے محنت کش بھی ہوتے ہیں جو غیر قانونی طور سے وہاں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف سعودی حکومت نے بڑے زور و شور سے مہم چلا رکھی ہے۔ ان کی گرفتاری کے

لیے پولیس کے مخصوص دستے متعین کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس پولیس کی گاڑیاں ہر شہر میں ایسے لوگوں کی تلاش میں پھرتی رہتی ہیں۔ ایسے ہر پاکستانی کی گرفتاری کے عوض پولیس کو ایک سو ریال ملتا ہے۔

پاسپورٹ کے بغیر باہر نکلنا، جیل جانا ہے

پولیس پاکستانیوں سے پوچھ گچھ کرتی رہتی ہے۔ اگر کوئی پاکستانی قانونی طور پر بھی وہاں سکونت پذیر ہو یا زائر ہو اور اس کے پاس اس وقت سوءِ اتفاق سے اقامہ یا پاسپورٹ موجود نہ ہو، پولیس اس شخص کو تھانے لے جاکر بند کر دیتی ہے۔ وہ لاکھ کہے کہ اس کا اقامہ یا پاسپورٹ غلطی سے گھر میں رہ گیا ہے اور وہ اسے لاکر دکھا سکتا ہے، لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب تک لواحقین کو خبر نہ ہو اور وہ اقامہ پیش نہ کریں، اس کی گلو خلاصی نہیں ہوتی۔ اس ڈر سے ہمیں ہر وقت پاسپورٹ اپنے پاس رکھنا پڑتا تھا۔ کبھی اسے ہوٹل یا گھر میں بھول جاتے تو یاد آنے پر جان کے لالے پڑ جاتے۔ میں جب تک سعودی عرب میں رہا، اس بارے میں خوف بدا ماں ہی رہا۔

پھر کوئے "دوست" کی طرف

جدّے میں ہم ظہر کی نماز سے بہت پہلے پہنچے اور عصر کی نماز پڑھتے ہی عمرے کے لیے مکّہ مکرّمہ روانہ ہو گئے جو تقریباً ۴۵ میل کے فاصلے پر ہے۔ شاہراہ کشادہ و صاف ہے۔ سعودی عرب کے بڑے شہروں کی طرح جدّہ بھی تجارتی شہر ہے۔ اس کے مضافات میں شاہراہ کے دونوں کناروں پر بہت دُور تک کہیں کہیں کارخانوں کی بنیادوں کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارا دل خوشی سے بلّیوں اُچھل رہا تھا کہ ہمیں ایک بار پھر دیارِ حبیب صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم میں جانے، "دوست" کے گھر کی زیارت اور عمرہ کرنے کی سعادت میسّر آ رہی ہے۔

ہمارا مختصر سا قافلہ جذب و شوق سے سرشار تھا۔ ہم تیزی سے بیت الحرام کی طرف بڑھ رہے تھے، اپنے اِلٰہ و ربّ کے گھر کی طرف، جہاں ہر وقت حُسن و نُور کی بارش ہوتی رہتی ہے، جہاں ہر آن ملائکہ کا نزول ہوتا رہتا ہے اور جو ہمہ وقت "دوست" کی حمد و ثنا اور تسبیح و ذکر سے معمور رہتا ہے۔ اس مقدّس و مطہر گھر پر ایک نظر ڈالنا بھی ثواب ہے۔ اُسے دیکھنے سے قلب کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ گھر اللہ جلّ شانُہٗ کا ہو اور وہاں "وہ" نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ "وہ" وہاں ہر وقت جلوہ فگن رہتا ہے اور اس کی تجلّیات سے حرم شریف کی فضا حسین و منوّر رہتی ہے۔ نظرِ بینا کے لیے حرم شریف حُسنِ "دوست" کی جلوہ گاہ ہے۔ دل میں اپنے اِلٰہ کی محبت کی شمع فروزاں ہو تو خانۂ کعبہ کا ہر نظارہ فردوسِ قلب و نگاہ ہے۔ اہلِ جذب و شوق کے لیے حرم شریف تو حریمِ "دوست" ہے، جو جانِ آرزو بھی ہے اور ایمانِ آرزو بھی۔

ہم سب خاموش، درود شریف پڑھنے میں محو اور دیارِ "دوست" دیکھنے کے منتظر تھے۔ گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ آتشِ شوقِ دید بھی تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ اشتیاقِ دید کی گھڑیاں بڑی ہی طویل ہوتی ہیں، لیکن ان میں چونکہ جذب و محبت کا رنگ ہوتا ہے، اس لیے وہ سُرور انگیز بھی ہوتی ہیں۔ مجھ پر جذب و مستی کی کیفیت طاری تھی اور میں چشمِ تصوّر میں "دوست" کے گھر کے نظارے میں گم تھا کہ میرے داماد کی آواز آئی: "حدِ حرم شروع ہو گئی"! میں چونکا اور ہم سب یہ دُعا پڑھنے لگے

اَللّٰهُمَّ هٰذَا حَرَمُكَ وَاَمْنُكَ فَحَرِّمْ لَحْمِيْ وَدَمِيْ وَبَشَرِيْ عَلَى النَّارِ۔

یا اللہ! یہ تیرا حرم اور امن کی جگہ ہے، پس میرا گوشت، خون اور جسم آگ پر حرام کر دے۔

النّار کی حقیقت

آگ کیا ہے ؟ یہ ٹھنڈک کی ضد ہے۔ ایک آگ مادّی ہے جو مادّی وجود کو لگتی اور اسے جلاتی ہے۔ دوسری آگ روحانی ہے جو دل کو لگتی ہے، مثلاً خوف و حزن کی آگ، حسرت و پشیمانی کی آگ، کینہ و غصّہ کی آگ، مالی و جانی نقصان کی آگ اور احساسِ جُرم و گناہ کی آگ وغیرہ۔ ایسے آتش بجاں لوگوں کو اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اہلِ نار کہتا ہے، اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو، جن کے دلوں میں طمانیت کی ٹھنڈک ہوتی ہے، اہلِ جنّت کہتا ہے۔ یہ اس کے اہلِ حُسن و سُرور بندے ہوتے ہیں، جو آخرت میں اپنے "دوست" کے مہمان ہوں گے۔ جن کا میزبان ان کا اِلٰہ اور ربّ ذوالجلال والاکرام ہو، ان سے بڑھ کر اور کون کامیاب و خوش نصیب ہو سکتا ہے ؟ اسی طرح ان لوگوں سے بڑھ کر اور کون حرماں نصیب اور نامراد و ناکام ہو سکتا ہے، جو اپنے اِلٰہ و ربّ کے مقہور و مغضوب، اس کے قرب و حضور اور دید و کلام، نیز اس کی جنّت اور اس کی لازوال نعمتوں سے محروم اور دوزخ میں جل بھُن رہے ہوں ؟ یہ حقیقت ہے، لیکن انسان کے ظلم و جہل کو کیا کہیے کہ وہ جانتا ہے پر مانتا نہیں۔

حدودِ حرم میں

حرم کی حدود میں داخل ہوئے تو شوقِ دید بڑھ گیا، دل "دوست" کے شہر اور گھر کے دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گیا۔ آخر دیارِ "دوست" نظر آ ہی گیا۔ دیکھتے ہی سب کی زبان سے یہ دُعا نکلی :

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْھَا :

یا اللہ ہمارے لیے اس شہر میں برکت عطا فرما۔

یہ دُعا تین بار پڑھی۔ اتنے میں اس مقدّس و مکرّم شہر میں داخل ہو گئے اور دُعائیں مسنونہ پڑھنے لگے۔

مینارِ حرم یا مینارِ حسن و نور

ہم دعائیں مانگنے میں مشغول تھے کہ دفعتاً بیت الحرام کے مینار دکھائی دیے۔ ان کے حسنِ نظارہ سے روح وفورِ جذب و شوق سے رقص کرنے لگی۔ یہ نظارہ آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور تھا۔ یہ احساس کہ ہم دیارِ "دوست" میں ہیں اور اپنے معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کے گھر جا رہے ہیں، ایسا وجد آفریں تھا کہ روح مسحور و متکیف ہوگئی۔ آرزوئیں بے ساختہ دعائیں بن کر زبان پر آنے لگیں، آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور جسم پر لرزہ طاری ہوگیا، کیونکہ "وہ" جمیل و کریم بھی ہے اور جلیل و عزیز بھی۔ اس کی ہیبت و جبروت کا دل حریف نہ ہو سکا اور کانپنے لگا۔ گاڑی ہمارا میزبان میرا چھوٹا ماموں زاد بھائی چلا رہا تھا۔ اسے حرم شریف کے ماحول سے پوری واقفیت تھی۔ اُس نے چکر لگا کر گاڑی باب السلام کے سامنے کھڑی کردی ہم احرام باندھے باب السلام سے گزر کر باب بنی شیبہ کے راستے حرم شریف میں داخل ہوئے۔

حریمِ "دوست" کا نظارہ

جونہی ہماری نظر حریمِ "دوست" پر پڑی، شہیدِ نظارہ ہوگئی۔ اس کا نظارہ اسی طرح جمیل و جلیل اور ایمان افروز و مسحور کن تھا، جو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ انوار و تجلیات کی برفباری ہو رہی تھی اور ملائکہ کے ہبوط و عروج کا سلسلہ جاری تھا۔ مطاف اہلِ جذب و شوق سے بھرا ہوا تھا۔ اُن کے والہانہ انداز میں "دوست" کی بلائیں لینے کا نظارہ اس قدر ایمان انگیز و بصیرت افروز تھا کہ اظہار و بیان میں نہیں آسکتا۔ اُن کی الحاح و زاری اور دعا و فریاد کی گونج میں ایسی تاثیرِ برقِ حسن تھی کہ روح تڑپ اٹھی اور آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہوگیا۔ ہم بھی طواف کرنے کے لیے حجرِ اسود کے مقام پر شمعِ "دوست" کے ان پروانوں میں شامل ہوگئے۔

آنکھیں آنسو بہاتی رہیں، دل روتا رہا، روح فریاد کرتی رہی، زبان کلمۂ تمجید پڑھتی

اور دُعائیں مانگتی رہی، اور ہم کفن بردوش عالمِ جذب و مستی میں "دوست" کی بلائیں لیتے، اس کے گھر کا طواف کرتے رہے۔ اشکوں کی گرمی میں ایسی تاثیرِ جمال و جلال تھی کہ اس سے قلب و جاں کو بے حد سرور انگیز و وجد آفرین ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ حضوری کی یہ کیفیت تھی کہ "دوست" ہر منظر میں جلوہ افروز تھا، اور روح نظر بن بن کر اس پر قربان ہوتی جاتی تھی۔ اس تجربے سے مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اس عالمِ جذب و مستی میں ہم حجرِ اسود کے پاس پہنچتے تو دل اُسے چومنے کی خواہش کا حریف نہ ہو سکتا، اور ہم بے تابانہ اُس کی طرف بڑھتے اور اس کے عُشّاق کے ہجوم میں شامل ہو جاتے اور ہمیں "دوست" کی نظرِ کرم سے اُسے بوسہ دینے کی سعادت حاصل ہو جاتی۔ حجرِ اسود کیا ہے؟ میں نے ایک دن "دوست" سے سوال کیا تو دل سے کسی نے کہا: حجرِ اسود سویدائے دلِ جنّت ہے۔ شاید اسی لیے اہلِ جذب و شوق اس کے بوسے میں کچھ اور ہی لذّت محسوس کرتے ہیں۔ اس کی لذّت میں کیف و سرخوشی ہوتی ہے۔ اس کا لمس جانفزا اور اس کی مہک روح پرواز ہوتی ہے۔

طواف کے بعد ہم نے پہلے مقامِ ابراہیم علیہ السّلام اور پھر حطیم میں نوافل پڑھے۔ پھر "دوست" کے در و دیوار سے چمٹ کر خوب روئے۔ مجھے اکثر یوں محسوس ہوا، جیسے اس کے گھر کی دیوار سے نہیں، خود اُس کے پیکرِ حُسن سے گلے لگا ہوا ہوں۔ معبود و محبوب خُدائے جمیل و جلیل ہو، اور اہلِ جذب و شوق تشنہ کامانِ دید و وصال ہوں تو پھر لذّتِ ہمکناری کا اندازہ انھی کو ہو سکتا ہے، جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

طواف کا کیف و سرور حاصل کر کے ہم نے آبِ زمزم سے کام و دہن ہی کی نہیں، قلب و جان کی بھی پیاس بجھائی، اور سعی کے لیے کوہِ صفا پر پہنچ گئے۔ یہ "دوست" کا

فضل و کرم تھا کہ اس بار پھر انجانا ایسی بیماریِ دل کے باوجود میں نے اہلِ جذب و شوق کی طرح پیدل سعی کی۔ دردِ دل کیا ہوتا، وہ کیف و سُرور ملا کہ دل گویا لذّتِ بادۂ طہور سے سرشار ہوگیا۔ یہ مبالغہ نہیں، واقعہ ہے کہ طواف کے بعد سعی رحیقِ دو آتشہ کی لذّت دیتی ہے۔ اس کی الذّتِ سرخوشی سے جراحتِ دل، تن بدن، دُنیا و ما فیہا، کسی کا خیال نہیں رہتا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ طواف و سعی دونوں میں "دوست" اپنے بندگانِ اہلِ جذب و شوق کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا تب اپنے اِلٰہ کی ہو، جو حُسنِ محض ہے، تو پھر اہلِ عشق و وفا کو ہوش کیسے رہ سکتا ہے؟ اس عالم میں تو عشق ایک جست میں عبدیت کے تمام مقامات طے کرلیتا ہے اور عالمِ زمان و مکان کو پھلانگ کر "حریمِ ذات" تک پہنچ جاتا ہے۔

"دوست" سامنے ہو تو دُعا ہوتی ہے

جذب و شوق میں وقت کا احساس نہیں رہتا۔ اس عالم میں رفتارِ زمانہ برق بنظ ہو جاتی ہے۔ سعی کے سات چکر چشم زدن میں ختم ہوگئے۔ ہم نے مروہ پر پہنچ کر دم لیا اور دُعا مانگنے لگے۔ نظروں کے سامنے "دوست" کا گھر تھا، جو اس کی جلوہ گاہِ جمال و جلال ہے۔ جذب و شوق ہو تو وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے واقعی اُس کی بارگاہ میں اس کے حضور حاضر ہیں۔ "دوست" سامنے ہو تو پھر الحاح و زاری اور دُعا و فریاد کرنے میں جو لُطف و سُرور آتا ہے، اُس کی کیفیت دلِ آشنا ہی جانتا ہے۔ ہم نے رو رو کر، جی بھر کر سب کے لیے دُعائیں مانگیں۔ "دوست" اِتنا سخی ہو کہ اس کا جواب نہ ہو اور سخاوت کرنا اس کا شیوہ اور اپنے بھکاریوں کے دامنِ مُراد وں سے بھرنا اس کی رحمت کا خاصّہ ہو، تو پھر اس کے بھکاری جی بھر کر دُعائیں نہ مانگتے، یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ خُدا جانے ہم کب تک دُعا مانگتے رہے، یہاں تک کہ دُعا و فریاد کرتے کرتے زبان سُوکھ گئی۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے اور دُعاؤں کے ساتھ الفاظ بھی ختم

ہو گئے۔ اُدھر آنسو بہاتے بہاتے آنکھیں بھی خشک ہو گئیں تو ہمیں ہوش آیا۔ ہم نے بال ترشوائے، دم لیا اور دیدِ "دوست" کی لذتِ مکرر کی خاطر ایک بار پھر مطاف میں حاضر ہوئے۔

حریم "دوست"، جلوہ گاہِ "دوست" تھی۔ ہم حُسن و نور، جذب و شوق اور عشق و مستی کے نظارے دیکھتے رہے، جو دُنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ حرم شریف کی فضا حُسن و نُور سے مزیّن و نظر افروز اور رُوح پرور بھینی بھینی خوشبُو سے مہک رہی تھی۔ وہ اس قدر پُربہار و شاداب، مقدّس و مطہر، ایمان افزا و بصیرت افروز اور سُرور انگیز و مسحور کُن تھی کہ شاید فضائے فردوس بھی اس کی حریف نہ ہو سکے۔ یہ منظر اس قدر حسین و دلکش تھا کہ وہاں سے جانے کو دِل نہیں چاہتا تھا، لیکن جانا بھی ضرور تھا، لہٰذا سینے میں دولتِ دل اور آنکھوں میں حسرتِ دید لیے ہم ناچار اس طرح "جنّتِ دوست" سے نکلے، جس طرح شاید حضرت آدم علیہ السّلام جنّت سے نکلے تھے۔

"جنّتِ دوست" سے نکلے تو باہر کی دُنیا کچھ اور ہی تھی۔ اہلِ دُنیا زندگی کے ہنگاموں میں مست تھے۔ ہوٹل، ریستوراں، دکانیں، شبستان، بازار روشنیوں سے منوّر تھے۔ کاروبار کا بازار گرم تھا۔ دولت کی ریل پیل کے نظارے تھے۔ لوگ کام و دہن کی لذتیں اُٹھا رہے تھے۔ گھروں میں لوگ وی سی آر اور ٹیلی وژن دیکھنے میں مشغول تھے۔ سڑکوں پہ کاروں کا اژدحام تھا۔ حرم شریف کے اندر اور باہر کی دُنیا میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اندر عشق و مستی اور جذب و شوق کے اور باہر حرص و آز اور ہوس و لذت پرستی کے نظارے تھے۔ ہماری کار روشنیوں کے شہر میں آہستہ آہستہ محوِ خرام تھی اور میں تصوّرات میں گُم دیارِ "دوست" کے مناظر دیکھتا جا رہا تھا۔ کار آہستہ آہستہ شاہراہ پہ پہنچی تو فراٹے بھرنے لگی اور

دیکھتے دیکھتے ہم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

جدّہ اور رنگِ جدیدیت

جدّے پر بڑی تیزی سے جدیدیت کا رنگ چڑھ رہا ہے۔ موٹر گاڑیوں کی بھرمار ہے۔ بڑی بڑی شاندار اور فلک بوس عمارتیں بن رہی ہیں۔ زندگی بڑی گراں ہے، لیکن دولت کی ریل پیل ہے۔ ساحل پر خوبصورت سیرگاہ بنی ہوئی ہے۔ لوگ شام کو اپنے اہل و عیال اور احباب کے ساتھ وہاں تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ سمندر کی وسعت اور ریت کی روشنیوں کا نظارہ بڑا دلکش و نظر افروز ہوتا ہے۔ شہر تیزی سے پھیل رہا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹل، پلازہ وغیرہ زیرِ تعمیر ہیں۔ اندرونِ شہر زندگی کی بڑی گہما گہمی اور رونق ہے۔ گاڑی کو پارک کرنا ایک بڑا ہی دشوار مسئلہ ہے۔ ہم ہمیشہ اس مسئلے سے دوچار ہوتے۔ اکثر اوقات جائے مقصود سے دُور کہیں گاڑی کو پارک کرنا پڑتا ہے۔

سعودی عرب میں چوری چکاری وغیرہ کی وارداتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ہم نے حجاز کے قیام کے دوران لڑائی جھگڑے، رہزنی، خون خرابے، اغوا، نوسربازی وغیرہ وارداتوں کی کوئی خبر نہ سُنی، نہ پڑھی۔ وہاں نہ جلسے ہوتے ہیں، نہ جلوس نکلتے ہیں۔ نہ احتجاج و مظاہرے ہوتے ہیں، نہ ملک بھر میں کہیں ہڑتالیں ہی ہوتی ہیں۔ لوگ سیاسی سرگرمیوں سے ناآشنا، بلکہ جمہوری اقدار سے بھی نابلد ہیں۔ حتیٰ کہ ثقافتی سرگرمیوں کی لذت بھی ان کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے۔ انھیں نہ علمی و ادبی جلسے منعقد کرنے کی اجازت ہے نہ کھیل تماشوں کی۔ جو کچھ ہوتا ہے، گھروں میں ہوتا ہے، جو عیش و نشاط کے گہوارے ہیں۔ لے دے کے صرف ایک تجارت کا بازار گرم ہے۔ کاروبارِ زندگی کے باقی سب بازار سرد ہیں۔ اہلِ نظر کی رائے ہے کہ وہاں لوگوں نے دولت کو اپنا اِلٰہ بنا لیا ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ محبت و غمگساری اور

ایثار و احسان کے جذبات سرد ہیں۔ طلاق، عقدِ ثانی اور تعددِ ازدواج کا عام رواج ہے۔ عورت اس اعتبار سے گراں بہا ہے کہ والدین اسے جہیز نہیں دیتے اور نہ شادی بیاہ کے اخراجات ہی برداشت کرتے ہیں، جیسا کہ برِّ صغیر پاک و ہند میں رواج ہے، بلکہ اس کے برعکس جملہ اخراجات شوہر کو برداشت کرنا پڑتے ہیں اور اسے سسرال والوں کو مہر کی بھاری رقم بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ یہ دولت کی فراوانی کا اثر ہے کہ ضیافتوں میں اسراف حد سے زیادہ کیا جاتا ہے اور اناج کا اس قدر ضیاع ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

سعودی عربوں کی تین خوبیاں

سعودی عرب کے باشندوں کی تین خوبیاں مجھے بے حد پسند آئیں اور ان پر رشک بھی بہت آیا: ایک یہ کہ وہ موحّد ہیں اور شرک و بُت پرستی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ متوکّل ہیں، اور تیسرے یہ کہ اولاد اور زندگی کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھتے ہیں، لہٰذا موت پر نہ آہ و زاری کرتے ہیں نہ کفِ افسوس ہی ملتے ہیں، بلکہ مشیّتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ میرے ماموں زاد بھائی نے بتایا:

"میرا ایک عرب دوست ہے۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا تو قدرے متفکّر و پریشان سا تھا۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگا: "میرا نوجوان لڑکا فوت ہو گیا ہے، اُسے دفنا کر آ رہا ہوں۔" میں نے تعزیت کرنا چاہی تو بولا: "اللہ تعالیٰ کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی۔ تأسف و غم کس بات کا؟ مجھے قہوہ پلاؤ اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لاؤ کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" اس کے اس کردار سے میں بہت متاثر ہوا، اور آج تک ہوں۔"

ان خوبیوں کے ساتھ کاش وہ مجاہد اور محنت کش و جفاکش بھی ہوتے! نیز انھیں

علم و حکمت، سائنس اور ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کا ذوق و شوق بھی ابھرتا۔ اگر ایسا ہوتا تو تیل کی دولت کی فراوانی کے باوصف اسرائیل کے سامنے یوں بے بس نہ ہوتے۔ دوسری قومیں ان کے اسراف، تعیش پسندی اور کاہلی کا یوں مذاق نہ اڑاتیں۔ یہ وہی بہادر اور جلیل القدر قوم ہے، جس کے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کو دیکھ دیکھ کر مشرق و مغرب کی عظیم الشان حکومتیں لرزہ براندام رہتی تھیں۔ یہ وہی نامور قوم ہے جس نے علم و حکمت کی ایسی شمع فروزاں کی تھی، جس نے ایک دنیا کو منوّر کر دیا تھا۔ اسی توحید پرست قوم نے دنیا سے کفر و شرک اور ظلم و استحصال کا خاتمہ کرنے کے لیے تاریخ ساز کردار ادا کیا تھا۔ یہی قوم تھی جو اپنے محاسنِ اخلاق کی بدولت دنیا بھر میں نیک نام تھی۔ انھی خوبیوں کے طفیل تاریخ نے اقوامِ عالم کی امامت اسے تفویض کی تھی۔ سچ ہے، قومیں رہینِ عروج و زوال رہتی ہیں۔

وہی پُراسرار مجاہد

ایک دن اتّفاق سے میری نظر اس پُراسرار نوجوان پر پڑی جو دمام میں مجھے ملا تھا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ اس نے مجھے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ لپک کر میرے پاس آیا، اپنے دوستوں سے میرا تعارف کرایا اور پاس ہی ایک مکان میں لے گیا۔ اس کے ایک دوست نے فوراً قہوہ تیار کیا اور ہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔ میں نے کریدنے کی بہت کوشش کی، مگر اس نے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے اور اس کی پُراسرار زندگی کیسے گزر رہی ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ پُراسرار نوجوان حریّت پسند تھے، جو بقول ان کے صیہونیت کے خلاف جہاد کر رہے تھے اور کسی خفیہ مشن پر وہاں آئے ہوئے تھے، لیکن وہ شہنشاہیت و قارونیت کے بھی دشمن تھے۔ اس مجاہد کا اصل نام کیا تھا، یہ تو نہیں معلوم، لیکن اسے "صالح" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ صالح مجھ سے پیار کرنے لگا تھا، خدا معلوم کیوں؟

صالح نے میری گزشتہ زندگی سے متعلق متعدد سوال کیے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے بھی نوجوانی میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے انگریز حکمرانوں کے خلاف جہاد

میں حصہ لیا تھا، زیرِ زمین سرگرمیوں میں حصہ لینے والی ایک جماعت کا سرگرم رکن تھا اور اس الزام میں گرفتار بھی ہوا تھا اور بڑے ہی اذیت ناک و شکیب ربا امتحان سے کامیاب گزر تھا۔ تو وہ میری یہ روداد سُن کر بے حد خوش ہوا۔ اس کے رفقاء بھی حیرت و مسرت سے میری داستان سُنتے اور عقیدت و احترام سے مجھے دیکھتے رہے۔ صالح کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے کہا :

" کاش آپ ہماری تنظیم میں شامل ہو سکتے۔"

میں نے جواب دیا " اگر میں عارضۂ دل کا مریض نہ ہوتا تو عین ممکن تھا۔ میں بھی آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہو جاتا۔ شہادت میری ہمیشہ مطلوب و مقصود رہی ہے۔ میں بچپن سے علم و شہادت کی دعا مانگتا رہا ہوں۔ میری یہ دُعا یقیناً مستجاب ہو گئی ہو گی۔ جہاد سے آزادی و زندگی اور شہادت سے حیاتِ ابدی ملتی ہے۔ مجاہد غازی ہو یا شہید، جنّت کی حُسن بداماں اور سُرور آگیں زندگی اس کا مقدّر ہے۔ کاش ہماری ملّت میں اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا ہو جائے۔"

صالح : اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں جذبۂ جہاد و شہادت نشو و ارتقاء کر رہا ہے۔ اور وہ دن نہیں جب وہ صیہونی اسرائیلیوں سے اپنا وطن اور دیگر مقبوضہ عرب علاقے خالی کرا لیں گے۔

میں : اُمّتِ مُسلمہ تمہارے اس جذبۂ جہاد و حریّت کی قدر کرتی ہے لیکن عرب اقوام میں بالخصوص اور ملّتِ اسلامیہ میں بالعموم اِتّحاد کا فقدان ہے۔ اس سے اغیار فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اور ہمیں ایک دُوسرے سے لڑا رہے ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیوں سے بچنا بڑا مشکل ہے۔

صالح : مشکل تو یقیناً ہے، مگر محال نہیں۔ مسلمانوں بالخصوص عربوں کو اگر زندہ و آزاد رہنا ہے تو انھیں متحد ہونا ہی پڑے گا۔ صیہونیت عربوں کے لیے بالخصوص ایک

عذاب ہے، جسے ہماری بدعملیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ اس عذاب کو متحد ہو کر اور خون کی قربانی دے کر ہی ٹالا جا سکتا ہے۔

دوسرا مجاہد: ہم خون دے رہے ہیں اور اِنشاء اللہ اس وقت تک دیتے رہیں گے جب تک فلسطین کو آزاد نہیں کرا لیتے۔

صالح: امریکا اور دیگر اسلام دشمن طاقتیں کب تک ان غاصب اسرائیلیوں کی پُشت پناہی کرتی رہیں گی؟ ان کے سروں پر خود قیامتِ صغریٰ منڈلا رہی ہے۔

تیسرا مجاہد: میرا ایقان ہے کہ اجتماعی ہلاکت اسرائیلیوں کا مقدّر ہے اور اسی لیے وہ ایک جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں۔

صالح: ہم اپنے مظلوم بھائیوں کی خاطر ظالموں سے برسرِ پیکار ہیں، جو اسلام اور انسانیت کے دشمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی ہدایت و نُصرت ہمارے ساتھ ہے۔ پاکستان مضبوط و مستحکم اور خوش حال و متحد ہوتا تو مجاہدوں کی پناہ گاہ اور ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز ہوتا۔

چوتھا مجاہد: مُسلمان کیوں نہیں سمجھتے کہ موت شُدنی اور اس کا وقت مقرّر ہے، اور یہ زندگی آنی و فانی ہے؟ انھیں اپنی ابدی زندگی کی فکر کیوں نہیں ہے؟ وہ موت سے کیوں ڈرتے اور عیش و عشرت پر کیوں مرتے ہیں؟ مسلمان اپنے آپ کو موحِّد کہتے اور سمجھتے ہیں، حالانکہ انھوں نے اپنی خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنا رکھا ہے، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ عالمِ اسلام ایک حسین و عظیم انقلاب کا منتظر ہے۔

صالح: (مجھ سے مخاطب ہو کر): ڈاکٹر صاحب، ہم سب کو آپ سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ و توانا رکھے۔ ہم پاکستان آئے تو انشاء اللہ آپ سے ضرور ملیں گے۔

محفل برخاست ہو گئی، ہم نے معانقہ و مصافحہ کیا اور خُدا حافظ کہ کر رُخصت

ہو گئے۔ وہ پُراسرار مجاہد کون تھے؟ یہ تو نہیں معلوم، اور یہ بھی نہیں معلوم وہ اس وقت کہاں ہوں گے، لیکن ان کی یاد کے حسین نقوش لوحِ دل پر اس طرح مرتسم ہیں کہ امتدادِ زمانہ انھیں مٹا نہیں سکے گا۔ وہ یقیناً اہلِ جذب و شوق تھے۔ میں ان کے جذبات و احساسات کا اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ میں بھی کبھی جہاد کی راہِ پُرخار سے گزرا تھا۔ زندگی ہے تو مجاہد کی اور موت ہے تو شہید کی، جو اُسے زندۂ جاوید کر کے اس کے الٰہ سے ملا دیتی ہے۔ کاش یہ بات ہمارے جوانوں کے دلوں میں اُتر جائے اور ان میں جہاد و شہادت کی آرزو پیدا ہو جائے!

ننھے دوست کی جدائی

ہماری بیٹی ثمر، داماد ڈاکٹر عبدالرؤف اور نواسا عدیل عمرہ کر کے کینیڈا رخصت ہو گئے۔ عدیل گاڑی میں بیٹھا تو ایسے پیار اور حسرت بھری نظروں سے مجھے تکنے لگا کہ میرا دل ان کا حریف نہ ہو سکا۔ جب تک آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا، وہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے اور میں اُسے تکتا رہا۔ اس کا معصوم دل فراق کی تاب مشکل سے لایا ہوگا۔ وہ رخصت ہو گئے اور میں گھر میں بیٹھا سوچتا رہا: کیا فراق زندگی کی تقدیر ہے؟ کیا ملنا اور مل کر بچھڑنا زندگی کا کھیل اور اس کھیل کا انجام ہمیشہ المیہ ہی ہوتا ہے؟ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی آنی و فانی ہے۔ انسان اس دُنیا میں پیدا ہی جانے کے لیے ہوتا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر وہ موت کو بھلا کیوں دیتا ہے؟ وہ اپنے الٰہ و رب سے غافل کیوں ہو جاتا ہے، جس کے پاس اس کو ایک دن جانا اور رہنا ہے؟ موت ان انسانوں کے لیے مبارک اور نویدِ جانفزا ہے، جو اہلِ حُسن و شعور ہیں، لیکن ان کے لیے ہولناک اور نویدِ عذاب ہے، جو اہلِ غفلت و حزن یا اہلِ نار ہیں، کیونکہ انھیں آخرت میں دوزخ کے بھیانک، روح فرسا اور اذیت ناک ماحول میں رہنا ہے، جہاں وہ موت و حیات کی لذتوں سے نا آشنا ہوں گے۔ انھیں وہاں نہ مرنا ہوگا، نہ جینا۔ اس

کے علی الدّوام، اہلِ حُسن و سُرور ایسی نعمتوں کی جنت میں ہوں گے جو انسان نے نہ دیکھی، نہ چکھی اور نہ سُنی ہوں گی۔ افضل ترین نعمت ان کے لیے حُسنِ مطلق یعنی اپنے الٰہ کی دید و لقا ہو گی۔ خُدا جانے میں کب تک ان خیالات میں گُم رہا۔

طوافِ وداع

آخر جمعرات کا دن آ گیا، جو وہاں ہمارا آخری دن تھا اور روز نہ ہم نے "دوست" کے مقدّس گھر کا طوافِ وداع کرنا تھا۔ دل میں شوقِ طواف بھی تھا اور خوفِ فراق بھی۔ خُدا معلوم ہمیں پھر عُمرے یا حج کی سعادت ملے گا یا نہیں؟ یہ خوف تیرِ نیم کش کی طرح دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ شوق و خوف کے امتزاج نے دل کی عجیب حالت بنا دی تھی۔ دوپہر کو ہم مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ عصر سے پہلے ہم حرم شریف میں پہنچ گئے۔ آج زائرین کی تعداد عام دنوں سے بہت زیادہ تھی۔ جمعۃ المبارک کو مکمل، اور جمعرات کو نصف چُھٹی ہوتی ہے، اس لیے زائرین دُور دُور کے علاقوں سے بھی یہاں حاضر ہو جاتے ہیں۔ ہم نے عصر کی نماز با جماعت پڑھی اور طواف کیا۔ پہلے مقامِ ابراہیمؑ پر، پھر حطیم میں نفل پڑھے اور غلافِ کعبہ سے لپٹ کر خوب روئے، آہ و فغاں کی اور دعائیں مانگیں۔ ہم چار افراد تھے، جو اہلِ جذب و شوق کے اژدحام میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ہم نے چونکہ نمازِ عشاء پڑھ کر رخصت ہونا تھا، اس لیے ہمیں ایک دوسرے کی پروا نہ تھی۔

اہلِ کشف و نظر

حطیم سے میں باہر نکلا اور چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ میری نظر ان دو بزرگوں پر پڑی۔ جو کوہِ اُحد کے دامن میں ملے تھے۔ میں لپک کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اہلِ کشف و نظر مجھے دیکھ کر مُسکرائے، اور بڑی محبت سے علیک سلیک اور مصافحہ کیا۔ ان دونوں کے درمیان جگہ تھی، شاید انھوں نے میرے لیے رکھی تھی۔ میں ان کی اجازت سے وہاں بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے:

"کب تک یہاں قیام ہے؟"

میں : انشاءاللہ، کل صبح ہم وطن روانہ ہو جائیں گے۔

ایک بزرگ : اپنے سفر کی رُوداد، تاثرات و مشاہدات کو ضبطِ تحریر میں لانا اور شائع کرانا نہ بھولیے گا۔

میں : اللہ تعالیٰ نے تندرست رکھا اور توفیق دی تو انشاءاللہ ضرور آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔

دُوسرا بزرگ : بڑے خوش قسمت ہو کہ اہلِ جذب و شوق میں سے ہو، اگرچہ عام لوگوں کو ایسے دکھائی نہیں دیتے۔ شاید اسی میں تمھاری کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اسی راہ پر چلتے رہو۔ یہی "دوست" کی حسین اور سیدھی راہ ہے۔ اس پر چلنے کی انھیں توفیق ملتی ہے، جو "دوست" کے منظورِ نظر اور انعام یافتہ ہوتے ہیں، جن کی زندگی سچی اور دُوسروں کے لیے ہوتی ہے، اور جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اِلٰہ بناتے اور اسے ہی اپنا ربّ سمجھتے اور اس پر ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔

میں : زندگی مسلسل امتحان اور ہجر و فراق میں گزر رہی ہے اور یہ بڑا ہی صبر آزما واقعہ ہے۔

پہلا بزرگ : زندگی اور امتحان، اسی طرح محبت اور فراق لازم و ملزوم ہیں۔

میں : اسلامی معاشرے میں فسق و فجور، ظلم و گناہ اور شرک و ہوس پرستی کا بازار گرم ہے۔ مرد و زن خود نمائی و عیش و عشرت کے دلدادہ اور دولت کے پرستار ہیں۔ اغیار اُن کی ہلاکت و بربادی کے سامان تیار کر رہے ہیں اور ان کی گھات میں لگے بیٹھے ہیں، لیکن مسلمان غافل و بے پروا اور خفتہ و ناتواں ہیں۔ عذاب ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ اس صورتِ حال کا مداوا کیا ہے، جبکہ انھیں اس بات کا شعور بھی بہت کم ہے۔

دُوسرا بزرگ : آپ نے سچ کہا۔ غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، لیکن اہلِ نظر

عذابِ الٰہی کو اقوامِ عالم کے لیے ناگزیر دیکھتے ہیں۔ ملّتِ اسلامیہ بالخصوص زندگی کے پُل صراط پر سے گزر رہی ہے، لیکن مسلمان ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ یاد رکھو! جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے سوا غیر اللہ کو اپنا اِلٰہ و ربّ بنا لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اس ظلمِ عظیم کی پاداش میں اس پر فرعون، ہامان اور قارون مسلّط کر دیتا ہے، جو اسے اپنا محکوم بنا کر بہرا، گونگا اور اندھا بنا دیتے ہیں، نتیجتاً اسے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں، دین کی برکات اور زندگی کی سچی خوشبوؤں سے محروم کر دیتے ہیں۔

پہلا بزرگ: اصل یہ ہے کہ انسان جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ بنایا ہے اور اس پر سختی سے قائم ہیں؛ صرف اسی کو پکارتے، فقط اسی سے مانگتے اور اسی کی پرستش، حمد و ثنا اور طاعت کرتے ہیں۔ وہی اصحابِ حُسن و سُرور اور کامیاب انسان ہیں؛ نیز وہی اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے دوست ہیں۔

میں: کوئی نصیحت کیجیے۔

دونوں بزرگ (بیک وقت) جہاد بالقلم۔ اسی میں آپ کی حقیقی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

چشم زدن میں اولیاء اللہ کی صُحبت ختم ہو گئی۔ مؤذن نے اذان دی۔ ایک بزرگ نے مجھے بظاہر بوسیدہ سا مصلّٰی دیا۔ وہ مصلّٰی کیا تھا، گلہائے فردوس کی عطریات میں بسی ہوئی کوئی عجوبۂ روزگار چیز تھی، جس کی مہک رُوح پرور و وجد آفریں تھی، جس نے مجھے مسحور و حیرت زدہ کر دیا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ دونوں بزرگ اُٹھے اور مصافحہ کر کے طواف کرنے والے اہلِ جذب و شوق کے اِزدحام میں گُم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے وہ پُراسرار بندے کون تھے؟ میں اکثر سوچتا اور انھیں یاد کرتا رہتا ہُوں۔

الوداع عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ہم سب مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر اکٹھے ہوئے۔ سب نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ دُعائیں مانگیں، حسرت بھری نظروں سے "دوست" کی جلوہ گاہ کو دیکھتے باب السلام کے راستے باہر آئے اور جدّہ روانہ ہو گئے۔ واپسی پر ہمارے دلوں کی کیفیت کچھ اور ہی تھی۔ گیارہ بجے شب کے قریب ہم گھر پہنچے اور جلد ہی سو گئے کہ صبح واپس وطن جانا تھا۔ لاہور کے لیے ہماری نشستیں پی آئی اے میں مخصوص تھیں۔

مراجعت صبح ہوئی تو زندگی کی حسین ترین یادیں لیے ہم جدّہ کے ہوائی مستقر کی طرف روانہ ہوئے۔ میرے ماموں زاد بھائی شیخ مُدثّر محمود اپنی اہلیہ اور بیٹے نبیل کے ساتھ ہمارے ہمراہ تھے۔ ان کی بدولت جدّے میں ہمارا قیام بڑا ہی آرام دہ رہا، ہم نے جی بھر کر سیر کی اور عمرے کی سعادت حاصل کی۔ ہم نے سامان بک کرایا اور انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

سفر بڑے آرام سے کٹ گیا۔ جہاز میں مشروبات و ماکولات سے ہماری تواضع کی گئی۔ ہم پہلے کراچی پہنچے اور پھر دوسرے جہاز کے ذریعے لاہور آ گئے۔ جہاں ہمارے استقبال کے لیے احباب و اقرباء کا ہجوم تھا۔ وہ سب ہمیں عمرے کی سعادت اور سیرۃ النبیؐ پر گراں قدر انعام و اکرام حاصل کرنے پر مبارک باد پیش کر رہے تھے، اور ہمارے دل حسرت و مہجوری اور شکرِ نعمت کے ملے جلے جذبات سے معمور تھے۔ ہم ان کی معیت میں گھر پہنچے، جہاں دو تین گھنٹے خوب رونق رہی اور جذب و شوق کی باتیں ہوتی رہیں۔ نصف شب کے قریب محفل برخاست ہوئی اور اس کے ساتھ ہی جذب و شوق کی داستان بھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، باہتمام عبدالسلام خان پرنٹر اور پبلشر

یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اتنا سچّا بھی ہے کہ بعض کتابیں دیکھنے بعض پڑھنے اور بعض جزوِ زندگی بنا لینے کے لیے ہوتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ رُوداد سفرِ حجاز جزوِ زندگی بنا لینے کی چیز ہے تو مبالغہ نہیں، اظہارِ حقیقت ہوگا۔

رُودادِ سفرِ حجاز اصل میں ان جمالیاتی، رُوحانی واردات و مشاہدات کی حکایتِ رُوح پرور ہے جو حرمین شریفین کی حسین و مقدس جنّت اور دیگر مقدّس تاریخی مقامات میں اللہ تعالےٰ نے اپنے حبیب و پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے سیرت نگار اور اس کتاب کے مصنّف ڈاکٹر نفیر احمد ناصر پر ارزانی کیے۔ ڈاکٹر موصوف صاحبِ جنوں بھی ہیں اور صاحبِ حسن و سرور بھی۔ ان کی یہ داستان ایمان افروز و بصیرت افروز، عشق انگیز و نور افزا، کیف پرور و سرور انگیز اور وجد آفرین و مسحور کُن ہے۔ اس کے ایک ایک فقرے میں تاثیرِ برقِ حسن ہے، جس کی بدولت وہ دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اس کی دُنیا کو حسن و نور، جذب و شوق اور سرور و سوز سے معمور کر دیتا ہے۔

اس کتاب کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے قاری پر وہ حقائق منکشف ہوتے ہیں، جن کے علم و ادراک سے انسان خود آگاہ و خدامست، صاحبِ دید و نظر، اہلِ جذب و شوق اور دانائے راز بنتا ہے، نیز اس پر حج اور عُمرے کی حقیقت کُھلتی ہے اور اُسے پتا چلتا ہے کہ انھیں رضائے "دوست" کے مطابق کیسے ادا کرنا چاہیے کہ ان کے ذریعے اُسے اپنے ربّ و الٰہ (معبُود و محبُوب اور مطلوب و مقصود) کی دید و حضوری اور قرب و رضوان حاصل ہو جائے، جو زندگی اور دین کی غایت الغایات ہے۔

اگر کسی بندۂ رحمٰن کے دل میں اس کی شمعِ محبّت فروزاں کرنے اور اس کے نور و تپ و تاب سے ایمان اور اس کی حلاوت، نیز زندگی اور اس کا حسن و نور اور سُرور و سوز حاصل کرنے اور اپنے الٰہ و ربّ کا مقرب و دوست اور شاہد و وارثِ جنّت بننے کی طلب و جستجو ہو تو اس کے لیے اس کتاب کا مُطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور) کو ربِّ جمیل و جلیل نے اپنا عشق عطا کیا ہے، جس کے سوز و نور سے ان کا سینہ منوّر ہے۔ "عشق" کی بدولت انھیں اپنے ربّ والٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کے آخری زندۂ جاوید ناطق کلام قرآنِ مجید کا اس قدر ذوق و شوق ہے کہ اس پر شب و روز تدبّر کرنا ان کا شعارِ زندگی ہے۔ اس عشق ہی کی برکت سے انھیں اپنے "دوست" کے حبیب و پیغمبر اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم سے والہانہ عقیدت و محبّت ہے اور ان کا دل غمِ انسانیت سے معمور ہے۔ اس عشق نے انھیں اہلِ تسلیم و رضا، اہلِ فقر و غنا، اہلِ دید و نظر اور صاحبِ سُرور و سوز بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر ناصر کا یہ ایمان بھی ہے اور تجربہ بھی کہ قرآن مجید زندہ و ناطق مُعلّم و مرشد اور ہادی و مُزکّی ہے، لیکن اُن کے لیے جن کے دلوں میں حق و صداقت، علم و حکمت، رشد و ہدایت اور تزکیۂ نفس کی سچّی طلب و جستجو ہو۔ اس حقیقت پر ان کی زندگی شاہد ہے کہ انھوں نے کسی انسان سے فلسفۂ جمالیات کی تعلیم حاصل کیے بغیر فقط قرآنِ حکیم سے جمالیات ایسا دقیق و دشوار فہم مضمون پڑھا اور اس میں اِتنا کمال حاصل کیا کہ اس پر بلند پایہ طبعزاد کتابیں لکھ کر ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی لٹ) کی سندِ فضیلت حاصل کی، جو عِلمی دُنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ جمالیات میں یہ اعزاز اس وقت تک دُنیا بھر میں صرف اور تنہا ڈاکٹر ناصر کو حاصل ہے۔ وہ اسے اعجازِ قرآنی سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ بھی عشق کا فیضان ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ڈاکٹر موصوف کو اپنے حبیب و سیّدالمرسلین صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ لکھنے پر مامور کیا، جو آئینۂ حسن و حق اور زندگی کی تفسیر کبیر اور پیغمبر اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے نام سے موسوم ہے۔ اس عظیم کارنامے پر حکومتِ سعودی عرب نے انھیں گرانقدر انعام سے نوازا اور شاہی مہمان بنا کر حرمین شریفین (جلوہ گاہِ حسن "دوست" اور حسن مآبِ حبیبِ "دوست") اور دیگر مقدّس و تاریخی مقامات کی سیر کرائی لیکن اللہ تعالےٰ نے انھیں اپنا مہمان بنا کر دولتِ دل، جمالیاتی ثروت اور ایسے حسین و رُوحانی مشاہدات و تجربات اور احوال و واردات سے نوازا کہ اُن کی "داستان" از بس ایمان افروز و رُوح پرور، سرور انگیز و وجد آفریں اور کیف پرور و سحر انگیز ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ نئے انداز میں

شہرۂ آفاق محقّق، مُفکّر اور جیّد عالم

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ایم۔ اے، ڈی لٹ

سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پُور

کی مایہ ناز تصنیف

پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم و آخر

جو سیرۃ النبیؐ کے عالمی مُقابلہ، منعقدہ ۱۹۷۸ء میں پانچ بہترین کتابوں میں منتخب ہُوئی اور رابطۂ عالمِ اسلامی (سعودی عرب) نے فاضل مُصنّف کو گرانقدر انعام دیا۔

کتاب "پیغمبرِ اعظم و آخرؐ" اِس لحاظ سے ازبس اہم ہے کہ اس میں اسلام کی انقلاب آفریں تحریک کا سیرحاصل جائزہ لیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تحریکِ اسلام درحقیقت تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی ہے۔

پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم و آخر اسرارِ حیات، حکیمانہ نکات، معارفِ قرآ [redacted]
[redacted] واردات کا بیش بہا گنجینہ ہے اور ڈاکٹر نصیر احمد نا [redacted]
اسے عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر، عالمِ جذب و مستی میں، لکھا ہے۔

سائز: ۲۰×۲۶/۸ ، صفحات: ۶۵۶ ، مُجلّد، قیمت : ۸۱ روپے

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

Retail Price : Rs. 28.00